سائیں بُلّھے شاہ

Saiye Bulle Shah

جے۔ آر۔ پوری
ٹی۔ آر۔ شنگاری

راداھا سوامی ست سنگ۔ بیاس

Originally published in Punjabi
Translated into Urdu from its Hindi edition 'Sain Bulleh Shah'
© Radha Soami Satsang Beas

Published by:
J. C. Sethi, Secretary
Radha Soami Satsang Beas
Dera Baba Jaimal Singh
Punjab 143204

© 1987, 2000 Radha Soami Satsang Beas
All rights reserved
First edition 1987

Third Urdu edition 2000

21 20 19 18 17 16 8 7 6 5 4 3

ISBN 978-81-8466-534-5

Printed in India by: Lakshmi Offset Printers

نذر

مُرشِد اَور مُرشِد کے عزیزوں کو

کون آیا پہن لباس کُڑے
تُسیں پُچھو نال اخلاص کُڑے

ہتھ کھونڈی موڈھے کمبل کالا — اَکھیاں دے وِچ وَسّے اُجالا
چاک نہیں کوئی ہے متوالا — پُچھو بِٹھا کے پاس کُڑے

چاکر چاک نہ اس نوں آکھو — ایہہ نہ خالی گُجھڑی گھاتوں
وِچھڑیا ہویا پہلی راتوں — آیا کرن تلاش کُڑے

نہ ایہہ چاکر چاک کہیں دا — نہ اِس ذرہ شوق مہیں دا
نہ مشتاق ہے دُدھ دہیں دا — نہ اُس بُھکھ پیاس کُڑے

بُلھا شوہ لُک بیٹھا اوہلے — دَسّے بھیت نہ مُکھ سے بولے
بابل ور کھیڑیاں توں لوڑے — وَر ماہنڈھا ماہنڈھے پاس کُڑے

کون آیا پہن لباس کُڑے
تسیں پُچھو نال اخلاص کُڑے

ناشر کی طرف سے

کچھ عرصہ پہلے ڈیرے کے محکمہ اشاعت نے حضور مہاراج چرن سنگھ جی کے زیرِ مشورہ مشرق کے اولیا سے منسوب کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ اس منصوبہ کے تحت اب تک سنت تکارام، تلسی صاحب، داؤد صاحب، پلٹو صاحب، میرا بائی، سنت نامدیو، گورو رویداس، سنت کبیر اور گورو نانک کی سوانح حیات اور روحانی تعلیم پر کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اور جو مقبولِ عام ہوئی ہیں۔ اِسی سلسلہ کی کڑی کے طور پر صوفی درویش سرمد سے متعلق بھی ایک کتاب تیار ہو رہی ہے۔

کتابوں کے اِسی سلسلہ کے تحت ہند اور پاکستان کے نامور صوفی فقیر سائیں بُلھے شاہ کے حالاتِ زندگی کلام اور اُن کی روحانی تعلیم پر یہ تصنیف عوام کی نذر کی جا رہی ہے۔

کتاب کے مصنفین کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ پروفیسر جگ راج پوری شمالی ہند کے فلسفہ کے متعدد اساتذہ میں ایک سند کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ پہلے مہندرا کالج پٹیالہ میں فلسفہ کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ میں صدر کے عہدہ پر فائز تھے۔ اور لبعد ازاں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ سے شعبۂ فلسفہ کے صدر کے عہدہ سے دستبردار ہوئے۔ آپ اِس سلسلۂ کتب کے تحت سنت نام دیو، تلسی صاحب اور گورو نانک صاحب پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ آپ کا فارسی ادبیات خصوصاً زبان اور صوفی فقراء کے کلام کے بارے میں عمیق مطالعہ ہے جس کا پتہ آپ کی تصنیفات میں جا بجا ملتا ہے۔

ڈاکٹر ٹی۔ آر شنگاری ڈی اے وی کالج جالندھر میں پنجابی کے پوسٹ گریجویٹ ادارے میں بہ حیثیت صدر کئی برسوں سے بابا فرید، سائیں بُلھے شاہ، حضرت سلطان باہُو اور دیگر اولیاء کا کلام پڑھا رہے ہیں۔ آپ نے "گورو نانک دا حکم سنکلپ" عنوان پر پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اور دنیا بھر کے مقدم مذاہب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کرپال سنگھ خاک کی مدد سے لکھی گئی آپ کی کتاب "سنت مت دِ بچار" اور ڈاکٹر خاک۔ ڈاکٹر گوردیپ سنگھ بھنڈاری اور ڈاکٹر منموہن سہگل کی امداد سے لکھی گئی آپ کی کتاب "نام سدھانت" روحانیت کے دائرہ میں مستند تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کتابوں کے اس سلسلے کا مُدّعا خاص طور پر اس سچائی پر روشنی ڈالنا ہے، کہ مُرشدِ کامل خواہ کسی مذہب، ملک، وقت، قوم یا نسل میں آئے ہوں خدا کے بیان اور اس سے وِصال کے بارے میں ان سب کا نظریہ یکساں ہوتا ہے۔ زبان اور اندازِ بیان میں فرق ہونا ایک قُدرتی امر ہے، لیکن ان کے ذریعہ بیان کی گئی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسی نکتہ کے مدِنظر فاضل مُصنفین نے سائیں بُلھے شاہ کے کلام کے مُختلف پہلوؤں پر گہرائی اور باریکی سے روشنی ڈالی ہے۔ دیگر بہت سے اولیاء، سنتوں اور صوفی درویشوں کے کلام اور ان کی رُوحانی تعلیم کے حوالہ جات، تمثیلات و تشریحات کے ذریعہ سے اِس صوفی کے کلام سے موازنہ کر کے ایک اہم کام سرانجام دیا ہے، جس سے مشرق کے اِس عظیم صوفی فقیر کے کلام کو روحانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے اور اسے سمجھنے میں غالباً کافی مدد ملے گی۔

اِس کتاب کے مسودہ کو موجودہ شکل دینے میں اور اس کی زبان سنوارنے میں شری پریم سنگھ عالم کا ڈیرے کا محکمہ اشاعت از حد ممنُون ہے۔ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے کافی وقت نکال کر اس کام کو بخوبی سرانجام دیا ہے۔ محکمہ اشاعت ڈاکٹر کرپال سنگھ خاک کا بھی شکر گزار ہے، کہ وہ اس مسودہ کو بہتر بنانے میں وقتاً فوقتاً مفید تجاویز دیتے رہے ہیں۔ آخر میں ہم سب شری سورن سنگھ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اِس تصنیف کی کتابت میں کئی مہینے از حد محنت کی ہے۔ کتابت کا یہ کام سردار سورن سنگھ جی نے جس عقیدت اور محبت سے کیا ہے اس کے لئے ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتابت شدہ میٹر میں دوبار بڑے پیمانہ پر ردّ و بدل کیا گیا، لیکن انہوں نے اس کام کو اپنا اولین فرض سمجھ کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ڈیرہ بابا جیمل سنگھ
بیاس ضلع امرتسر (پنجاب)

ایس۔ ایل سوندھی
سیکرٹری
رادھا سوامی ست سنگ بیاس

مُصنّفین کی جانب سے

سائیں بُلھے شاہ کے کلام میں ہماری شرُوع سے ہی بہت دلچسپی رہی ہے۔ لیکن اِس کو گہرائی سے پرکھنے اَور اِس کے بُنیادی اصُولوں کا سِلسلے وار مُطالعہ کرنے پر اِس میں رُوحانیت کا جو عظیم خزانہ ہمیں نظر آیا، اِس سے ہمیں حیرت انگیز مُسرّت حاصل ہُوئی ہے۔ ہم مہاراج چرن سنگھ جی کے احسان مند ہیں جنہوں نے ہمیں اِس کامِل فقیر سے متعلق کھوج کرنے کی ترغیب دی۔ اَور پھر اِس کام میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کی۔

اَب تک سائیں بُلھے شاہ کے کلام کو صِرف اَدبی نقطۂ نظر سے پرکھا جاتا رہا ہے۔ حضرت انور علی رُہتکی نے ان کے کلام کے کُچھ پہلوؤں پر رُوحانی نُقطۂ نظر سے بھی غور کرنے کی شرُوعات کی اَور بعد ازاں بھی یہ سِلسلہ جاری رہا، لیکن سائیں بُلھے شاہ کے کلام کی رَوشنی میں اُن کے صُوفیانہ اصُولوں اَور فلسفۂ حیات کی سِلسلہ وار اَور تسلّی بخش تشریح صحیح معنوں میں نہیں ہو پائی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کسی حد تک اس کمی کو پُورا کریگی۔

سنتوں اَور فقیروں کے کلام کو ادبی نظریہ سے پرکھنے والے عُلمأ اِن کے کلام کو محض تاریخی دستاویز کے طَور پر ہی دیکھتے ہیں۔ عَین اسی طرح اُن کے کلام پر پڑنے والے بیرونی اثرات کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کئی سنتوں اَور فقیروں کے کلام پر ویدانت اسلام، صُوفی مَت، بھگتی لہر وغیرہ کا اثر دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس بارے میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ کامل فُقرأ کے کلام میں مُشابہت بیرُونی اثرات کی بجائے یکساں روحانی مشاہدات پر مُنحصر ہوتی ہے۔ کامِل مُرشِد اپنے خیالات کتابوں یا دُوسرے لوگوں سے اُدھار نہیں لیتے۔ اُنہوں نے عملی طَور پر ریاضت کے ذریعے حق کا رُو بہ رُو دیدار کیا ہوتا ہے۔ اس لیئے اُس کا ذکر کرتے ہُوئے ان کے کلام میں یکسانیت کا ہونا ایک قُدرتی اَمر ہے۔

سائیں بُلّھے شاہ کے کلام کے مختلف مجموعوں میں درسی اختلافات کا ہونا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اُن کا کلام چونکہ اُن کی اپنی زندگی کے دوران قلمبند نہیں کیا گیا اور سارا کلام بعد میں قوالوں سے اکٹھا کیا گیا، اِس لئے اُن کے کلام میں کئی جگہ نہایت لطیف اور اہم اختلافات پائے جاتے ہیں۔ باوجود اِس کے اِس کلام میں ایسا مواد کثرت سے پایا جاتا ہے، جس کی صداقت پر شک نہیں کیا جاسکتا، اور جس کی بنا پر آپ کے روحانی مشاہدات و تعلیمات کی ایک خوبصورت جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

سائیں بُلّھے شاہ کا کلام روحانی نظریہ سے تو اعلیٰ ہے ہی، ادبی نقطۂ نظر سے بھی اِس کا شمار فن کے بلند ترین حصول میں کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ کلام کی ادبی خصوصیات کا مطالعہ اس کتاب کا بنیادی مقصد نہیں پھر بھی اس کی زبان و طرزِ بیان سے متعلقہ مختصر ذکر اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر کرپال سنگھ خاک نے نہ صرف مسودہ کی نظرِ ثانی کی ہے بلکہ بہت سے قابلِ قدر مشورے بھی دیئے جس کے لئے ہم اُن کے تہ دِل سے ممنون ہیں۔ ہمارے عزیز دوست جناب پریم سنگھ عالمؔ (شملہ)، نے جس خوش اسلوبی اور جانفشانی سے پنجابی تصنیف کو خوبصورت اُردو کی شکل دی ہے اُس کے لئے ہم اُن کے از حد مشکور ہیں۔ عالمؔ صاحب خود اُردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب ہیں۔ اُن کے اپنے کلام میں تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ اِس لئے وُہ اِس صُوفی شاعر کے کلام کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ اُن کا ہی قلمی کمال ہے، کہ ترجمہ میں پنجابی کا رنگ برقرار ہے اور ساتھ ہی اِس میں اُردو کی نفاست بھی شامل ہو گئی ہے۔ مسودہ کی کتابت ہمارے ساتھی سردار سورن سنگھ (جالندھر)، نے جس محبّت اور محنت سے کی ہے اُس کے لئے اُن کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ شری لمبھر رام، شری اوتار سنگھ اور شری رتن چند نے اس کتاب کی چھپوائی میں بڑی مدد کی ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

راد ھا سوامی کالونی
بیاس ضلع امرتسر

جے۔ آر۔ پوری
ٹی۔ آر۔ شنگاری

فہرست مضامین

صفحہ

(ا) ناشر کی طرف سے

(ب) مُصنفین کی جانب سے

(I) سائیں بُلھے شاہ : سوانحِ حیات۔ ۱ - ۲۵

(II) رُوحانی تعلیم ۲۶-۱۹۷

۱ رُوحانی تعلیم ۲۶

۲ ذریعۂ نجات ۴۳

۳ ہمہ اوست ۶۰

۴ تلاشِ محبوب ۷۲

۵ رُوحانی شغل ۸۴

۶ کلمہ ۱۰۶

۷ مُرشد ۱۳۶

۸ عِلم اَور رُوحانیت ۱۶۲

۹ شریعت اَور رُوحانیت ۱۷۴

۱۰ لُبِّ لُباب ۱۹۲

(III) زبان اَور طرزِ بیان ۱۹۸

(IV) کلام سائیں بُلھے شاہ ۲۰۳-۴۵۴

الف ۱ اللہ دِل رَتا میرا ۲۰۵

۲ آ سجن گل لگ اساڈے ۲۰۶

نمبر شمار	کافی	صفحہ
۳	آ مِل یار اسارے میری	۲۰۹
۴	آؤ فقیرو میلے چلئے	۲۱۱
۵	آئی رُت شگوفیاں والی	۲۱۲
۶	اب کیوں ساجن چِرلائیو رے	۲۱۳
۷	اب لگن لگی کیہہ کریئے	۲۱۵
۸	اب ہم ایسے گم ہُوئے	۲۱۶
۹	اَپنا دس ٹکانا، کِدھروں آیا کِدھر جانا	۲۱۷
۱۰	اپنے سنگ رلائیں پیارے	۲۱۸
۱۱	اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں	۲۱۹
۱۲	اُٹھ گئے گوانڈھوں یار	۲۲۵
۱۳	اِک الف پڑھو چھُٹکارا اے	۲۲۶
۱۴	اِک ٹُونا اچنبھا گاواں گی	۲۲۹
۱۵	اِک رانجھا مینُوں لوڑی دا	۲۳۱
۱۶	اِک نُقطے وِچ گل مُکدی اے	۲۳۳
۱۷	اک نُکتہ یار پڑھایا اے	۲۳۶
۱۸	اَکھاں وِچ دِل جَانی پیاریا	۲۳۷
۱۹	اُلٹے ہور زمانے آئے	۲۳۸
۲۰	اُلٹی گنگا بہائیو رے سادھو	۲۴۰
۲۱	امّاں بابے دی بھلیائی	۲۴۱
۲۲	الیس نیہوں دی اُلٹی چال	۲۴۳
۲۳	الینا جگیا گیان پلیتا	۲۴۵
۲۴	ایہہ اچرج سادھو کون کہاوے	۲۴۶

نمبر شمار	کافی	صفحہ
۲۵	ایہہ دُکھ جا کہوں کہیں آ گے	۲۴۷
ب	بس کر جی ہُن بس کر جی	۲۴۹
۲	بُلھا کیہہ جانے ذات عشق دی کون	۲۵۱
۳	بُلھیا کیہہ جاناں میں کون	۲۵۲
۴	بُلھے نوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں	۲۵۴
۵	بنسی اچرج کاہن بجائی	۲۵۶
۶	بھانویں جان نہ جان وے	۲۵۸
۷	بھروسہ کیہہ آشنائی دا	۲۵۹
۸	بھینا! میں کتدی کتدی ہُٹی	۲۶۱
۹	بے حد رمزاں دسدا ڈھولن ماہی	۲۶۳
پ	پاندھیا ہو!	۲۶۴
۲	پانی بھر بھر گئیاں سبھے آپو اپنی واری	۲۶۵
۳	پایا ہے کجھ پایا ہے	۲۶۷
۴	پتیاں لکھاں میں شام نوں	۲۶۹
۵	پردہ کس توں راکھی دا	۲۷۱
۶	پڑھ تا لیوہن عاشق کیہڑے	۲۷۳
۷	پیاریا سانوں مٹھڑا نہ لگدا شور	۲۷۵
۸	پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہوئے	۲۷۶
۹	پیارے بن مصلحت اُٹھ جانا	۲۷۷
۱۰	پیاریا سنبھل کے نیہوں لا	۲۷۹
ت	تانگھ ماہی دی جلیاں	۲۸۱
۲	تسی آؤ ملو میری پیاری	۲۸۳

صفحہ	کافی	نمبر شمار
۲۸۴	نسّی کرو اساڈی کاری	۳
۲۸۶	تُوہیوں مَیں ہَیں نامیں سجنا	۴
۲۸۷	تَیں کِت دل پاؤں لپیارا اے	۵
۲۸۸	تیرے نچائیاں کر تھیّا تھیّا	۶
۲۹۰	ٹُک بُوجھ کون چُھپ آیا اے	ٹ
۲۹۴	جچر نہ عشق مجازی لاگے	ج
۲۹۵	جس تن لگیا عشق کمال	۲
۲۹۶	جند کُڑکی نے مُنہ آئی	۳
۲۹۹	جو رنگ رنگیا گُوڑھا رنگیا	۴
۳۰۱	چُھپ کر کے کریں گزارے نُوں	چ
۳۰۲	چلو دیکھیئے اُس مستانڑے نوں	۲
۳۰۴	حاجی لوک مکّے نُوں جاندے	ح
۳۰۶	حجاب کریں درویشی کولوں	۲
۳۱۰	خاکی خاک سِیوں رل جانا	خ
۳۱۱	خالق تماشے آئی یار	۲
۳۱۳	دِل لوچے ماہی یار نُوں	د
۳۱۵	ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی	ڈ
۳۱۸	ڈھولا آدمی بن آیا	۲
۳۲۰	رانجھا جوگیڑا بن آیا	ر
۳۲۱	رانجھا رانجھا کردی ہُن مَیں آپے رانجھا ہوئی	۲
۳۲۳	راتیں جاگیں کریں عبادت	۳
۳۲۵	روزے حج نماز نی مائے	۴

نمبر شمار	کافی	صفحہ
۵	رَہ رَہ اوئے عشقا ماریا ای	۳۲۶
۶	رَین گئی لٹکے سب تارے	۳۳۰
س	ساڈے وَل مُکھڑا موڑ وے پیاریا	۳۳۲
۲	سائیں چُھپ تماشے نوں آیا	۳۳۳
۳	سانوں آ مِل یار پیاریا	۳۳۴
۴	سَب اکو رنگ کپاہیں دا	۳۳۵
۵	سجناں دے وچھوڑے کولوں	۳۳۷
۶	سَدا نہیں سوہریاں گھر جانا	۳۳۸
۷	سَیئو نی رَل دیئو ودھائی	۳۴۰
۸	سَے ونجارے آئے نی مائے	۳۴۲
ع	عِشق اساں نال کیہی کیتی	۳۴۴
۲	عشق حقیقی نے مُٹھی کُڑے	۳۴۶
۳	عشق دی نوِیوں نویں بہار	۳۴۷
۴	عِلموں بس کریں اویار	۳۴۹
ک	کت کُڑے نہ وَت کُڑے	۳۵۳
۲	کدی اپنی آکھ بلاؤ گے	۳۵۷
۳	کدی آمِل بِرہوں ستائی نوں	۳۵۸
۴	کدی آمِل یار پیاریا	۳۵۹
۵	کدی موڑ مُہاراں ڈھولیا	۳۶۰
۶	کر کتن وَل دھیان کُڑے	۳۶۱
۷	کون آیا پہن لباس کُڑے	۳۶۵

نمبر شمار	کافی	صفحہ
٨	کوئی پُچھو دِلبر کیہہ کردا	٣٦٦
٩	کھیڈنے دے وِچ ویہڑے گھُمتی گھُم	٣٦٨
١٠	کیہنُوں لامکانی دسّدے ہو	٣٦٩
١١	کیوں عِشق اساں تے آیا اے	٣٧١
١٢	کیہہ کردا بے پرواہی جے	٣٧٢
١٣	کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا	٣٧٤
١٤	کیہہ بے درداں سنگ یاری	٣٧٦
١٥	کیہہ جاناں میں کوئی وے اڑیا	٣٧٧
گ	گَل رَوندے لوکاں پائی اے	٣٧٩
٢	گور جو چاہے سو کردا ہے	٣٨٢
٣	گھونگھٹ اوہلے نہ لُک سجنا	٣٨٤
٤	گھُونگھٹ چُک لے سجناں وے	٣٨٥
٥	گھڑیالی دیئو نکال نی	٣٨٦
م	مائی کُدم کرِیندی یار	٣٨٨
٢	ماہی وے مَیں مِلیاں سب دُکھ ہوون دُور	٣٨٩
٣	مائے نہ مُڑدا عِشق دیوانہ	٣٩٠
٤	مِتّر پیارے کارن نی مَیں لوک الاہمے سہنی آں	٣٩٢
٥	مُرلی باج اُٹھی اَن گھاتاں	٣٩٣
٦	مُنہ آئی بات نہ رہندی اے	٣٩٥
٧	میرا رانجھا ہُن کوئی ہور	٣٩٨
٨	میری بُکل دے وِچ چور	٣٩٩

نمبر شمار	کافی	صفحہ
۹	میرے ماہی کیوں چرلایا اے	۴۰۱
۱۰	میرے گھر آیا پیا ہمرا	۴۰۳
۱۱	میرے نوشوہ دا کِت مول	۴۰۵
۱۲	مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا	۴۰۶
۱۳	مَیں چوڑیڑی آں بیتے صاحب دی سرکاروں	۴۰۸
۱۴	مَیں پُچھاں شوہ دِیاں واٹاں نی	۴۰۹
۱۵	ہَیں گلّ او تھے دی کرداہاں	۴۱۱
۱۶	مَینوں چھڈ گئے آپ لدّ گئے	۴۱۴
۱۷	مَینوں درد آولڑے دی پیڑ	۴۱۵
۱۸	مَینوں عشق ہلارے دیندا اے	۴۱۶
۱۹	مَینوں کیہہ ہویا ہُن میتھوں گئی گواتی ہیں	۴۱۷
۲۰	ہَیں بے قید	۴۱۸
۲۱	مَیں کُسنبھڑا چُن چُن ہاری	۴۱۹
۲۲	ہیں کیونکر جاواں کعبے نوں	۴۲۱
۲۳	مَیں وِچ نہ رہ گئی رائی	۴۲۲
۱	نِت پڑھنا ایں استغفار، کیسی توبہ ہے او یار	۴۲۵
۲	نہ جیواں مہاراج مَیں تیرے بِن	۴۲۷
۳	نی میںوں لگڑا عشق اول دا	۴۲۸
۴	نی ہَیں ہُن سُنیا عشق شرع کیہہ ناتا	۴۲۹
۵	نی کوٹھیچل میرا ناں	۴۳۱
۶	نی سیّو مَیں گئی گواچی	۴۳۳

(xvi)

صفحہ	کافی	نمبر شمار
۴۳۴	واہ واہ رمز سجن دی ہور	و
۴۳۷	واہ سوہنیا تیری چال عجائب	۲
۴۳۸	وَتّ نہ کرساں مان رنجھیٹے یار داوے اُڑیا	۳
۴۴۱	ویکھو نی کی کرگیا ماہی	۴
۴۴۳	ویکھو نی پیارا مینوں سُفنے میں چھل گیا	۵
۴۴۴	ویکھو نی شاہ عنایت سائیں	٦
۴۴۵	ہندو نہیں، نہ مُسلمان	ہ
۴۴۷	ہُن کیہہ تھیں آپ چھپائی دا	۲
۴۵۰	ہُن مینوں کون پچھانے	۳
۴۵۲	ہُن بَن لکھیا سوہنا یار	۴
۴۵۴	سی حرفی	(v)
۴۵۷	گنڈھاں	(vi)
۴۵۹	اٹھوارہ	(vii)
۴٦۱	دوہڑے اور متفرقات	(viii)
۴٦۸	باراں ماہ	(ix)
۴۷۰	کچھ اِن کے بارے میں	(x)

سائیں بُلّھے شاہ

سوانحِ حیات

قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے۔ بُلّھے شاہ کی اچانک موت کے وقت اُس کے انقلابی فکروعمل کے باعث مُلّاؤں نے اُسے برادری کے قبرستان میں دفن کی اجازت نہ دی۔ آج اُس بُلّھے شاہ کا خستہ حال مقبرہ ہی قصور کے بیرونی حصّہ میں قصبے کے کُوڑے کرکٹ کے انباروں سے مبرّا ایک پاک وصاف جگہ ہے۔ شہر کے نامور لوگ جنہوں نے اُس وقت بُلّھے شاہ پر کافر ہونے کا فتوے عائد کرکے اُسے برادری سے خارج کر دیا تھا، آج زیادہ سے زیادہ دولت صَرف کر کے اُس کے نزدیک دفن کئے جانے میں فخر محسوس کرتے ہیں[1]۔

سائیں بُلّھے شاہ جن کو بُلّھے شاہ قادری شطاری بھی کہا جاتا ہے[2] سترویں اٹھارویں صدی کے کامِل صُوفی فقیر ہوئے ہیں۔ آپ کی پاکیزہ طرزِ زندگی اور اعلےٰ درجے کی رُوحانی رسائی کے سبب ہندو، مسلمان سِکھ وغیرہ مختلف مذہبی عقیدوں کے لوگ آپ سے یکساں محبت کرتے ہیں۔ عُلمأ اور درویش آپ کو "شیخِ ہر دو عالم"، "مردِ حقانی" و "پوشیدہ رازوں کا محرم" وغیرہ کئی قابلِ عزّت خطابات سے نوازتے ہیں۔ آپ کو پنجاب کا سب سے بڑا صُوفی شاعر کہا گیا ہے، اور آپ کے کلام کو صُوفی کلام کی "چوٹی" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے کلام کے کئی پہلوؤں کا موازنہ عظیم صُوفی فقرا مولانا

---

(۱) Bulleh Shah: A Selection—By Taufiq Rafat, p. 1., Ist Edition 1982.

(۲) A History of Sufism in India, Saiyad Athar Abbas Rizvi. Vol. II p. 445 (Hereafter quoted as History of Sufism in India')

رُومؔ و شمسؔ تبریز وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔ آپ کے دَورِ حیات سے لے کر آج تک تمام شمالی ہند اور اُس علاقہ میں جو اَب پاکستان کہلاتا ہے، آپ کی شخصیت اَور کلام کو خلوص و عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

سائیں بُلھے شاہ کا اصلی نام عبداللہ شاہ تھا۔ عبداللہ شاہ سے ہی بُلھا شاہ یا بُلھے شاہ ہو گیا۔ پیار سے آپ کو کوئی بابا بُلھے شاہ، کوئی سائیں بُلھے شاہ اَور کوئی صرف بُلھا کہتا ہے۔[۱] آپ کی چالیسویں گنڈھ کے آخر میں آپ کے اصلی نام کے بارے میں صاف اشارہ مِل جاتا ہے۔

"ہُن اِنّا للہ[۲] آکھ کے تُم کرو دُعائیں
پیا ہی سبھ ہو گیا عبداللہ ناہیں"

بُلھے شاہ کے زمانے کے بارے میں کھوجیوں کی مختلف رائیں ہیں۔ عام طور پر آپ کی حیات کا دَور ۱۶۸۰ سے ۵۸-۱۷۵۷ عیسوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی کھوجیوں کی مختلف رائیں ہیں۔ عام طور پر آپ کی جائے پیدائش ریاست بہاولپور (پاکستان) کے گاؤں اُچ گیلانیاں مانی جاتی ہے۔[۳] اُن کا کہنا ہے کہ بُلھے شاہ کی چھ ماہ کی عُمر تک[۴] اُن کے والدین اِسی گاؤں میں آباد تھے۔ بعد ازاں کسی سبب وُہ گاؤں ملکوال (ضلع ساہیوال ملتان ڈویژن) چلے گئے۔ جہاں اُن کی برادری کے کئی گھر آباد تھے۔ وہاں آئے ہُوئے اُنہیں ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ گاؤں پانڈو کے کے مالک[۵] کو اپنے گاؤں کی مسجد کے لئے امام کی ضرورت پڑی۔ وُہ ملکوال کے لوگوں کی سفارش پر بُلھے شاہ کے والد شاہ محمد دَرویش کو پانڈو کے لے آیا۔ پانڈو کے گاؤں کی مسجد میں امامت کے علاوہ آپ کو

---

[۱] ڈاکٹر گوردیو سنگھ: کلام بُلھے شاہ، صفحہ ۱۲۔
[۲] ہم اللہ ہی کے ہیں۔
[۳] مولا بخش کُشتہ، ڈاکٹر لاجونتی راما کرشنا اَور ڈاکٹر فقیر محمد نے "خزینۃُ الاصفیاء" وغیرہ میں دیئے گئے تذکروں کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے۔
[۴] کچھ عُلماءُ کے مطابق چھ سال کا ہونے تک۔
[۵] جاگیردار، حاکم۔

گاؤں کے بچّوں کی ابتدائی تعلیم کا کام بھی سونپا گیا۔

اِس بات سے تمام کھوجی مُتفق ہیں کہ بُلھے شاہ کے والدین کا آبائی گاؤں اُچ گیلانیاں ہی تھا۔ اَور وُہ وہاں سے ہی پہلے ملکوال اَور بعد میں پانڈوکے آکر آباد ہُوئے۔ لیکن کچُھ کھوجیوں کی رائے میں بُلھے شاہ کی پیدائش اُس کے والدین کے پانڈوکے آنے کے بعد ہُوئی۔ یہ گاؤں پانڈوکے بھٹّیاں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ قصُور (پاکستان) سے تقریباً چَودہ[۱۴] میل جنوب مشرق میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ قصبہ کی موجُودہ مشہُوری بھی سائیں بُلھے شاہ کے نام کا بھی باعث ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائیں بُلھے شاہ کے آباؤ اجداد میں سے سیّد جلاء الدّین بُخاری تین سو سال پہلے سُرخ بخارہ سے مُلتان آئے اَور حضرت شیخ غوث بہاالدّین زکریّہ کے ہاتھوں بیعت[۱] ہو کر اُچ گیلانیاں میں آکر آباد ہو گئے۔ بُلھے شاہ کے دادا سیّد عبدالرزّاق اُن کی جد میں سے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف بُلھے شاہ کی نسل سیّد ہونے کے ناطے حضرت محمدؐ صاحب سے وابستہ تھی، اَور دوسری طرف صُوفی فلسفہ کے سِلسلے سے اس کا صدیوں پرانا تعلق تھا۔

بُلھے شاہ کے والد شاہ محمد درویش کو عربی فارسی اَور قرآن میں دسترگاہ حاصل تھی۔ آپ روحانی رُجحان والے نیک دِل انسان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خاندان میں سے بُلھے شاہ کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ کا سب سے زیادہ خلُوص تھا۔ آپ کی طرح آپ کی ہمشیرہ نے بھی ساری عُمر کنواری رہ کر عبادت اَور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی۔ بھائی بہن دونوں کی شخصیت پر اُن کے والد کے اعلیٰ اخلاق کا گہرا اثر تھا، جِس کی نیک سیرت کے سبب اس کو درویش کہہ کر نوازا جاتا تھا۔ آج بھی بُلھے شاہ کے والد محترم کا مزار پانڈوکے بھٹّیاں میں موجُود ہے جہاں ہر سال عُرس ہوتا ہے، اَور رات کو بُلھے شاہ کی کافیاں گائی جاتی ہیں۔ اِس طرح باپ اَور بیٹے دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں گھُل مِل کر ایک تاریخی یاد اَور ہر دلعزیز روایت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

---

[۱] مُرید بننا۔

بلھے شاہ کا بچپن پانڈوکے گاؤں میں اپنے والد کے زیرِ نگرانی بسر ہُوا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ کو قصور بھیجا گیا، جو اُن دِنوں اسلامی تعلیم کا ایک مشہور مرکز تھا۔

قصور میں حضرت غُلام مرتضیٰ اور محی الدین جیسے چوٹی کے اُستاد موجود تھے، جن کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھی۔ بلھے شاہ نے بھی قصور میں رہ کر حضرت غُلام مُرتضیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بلھے شاہ میں ایسی دماغی اور اخلاقی خوبیاں موجود تھیں، جن کے باعث آپ نے ایسے قابل اُستاد کی صحبت کا پُورا فائدہ اُٹھایا۔ بہت سے تاریخی حوالہ جات کی رُو سے آپکو عربی، فارسی کا اعلیٰ درجے کا فاضل مانا گیا ہے۔ آپ کے کلام میں ایسے حوالہ جات بکثرت ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اسلامی اور صوفیانہ کُتب کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا۔ جب آپ کو باطنی رسائی حاصل ہوگئی، تو ظاہری علم ایک نئی شکل میں چمکنے لگا۔ لیکن عرفان[1] حاصل کرنے کے لئے بلھے شاہ کو ایک لمبی جدوجہد کرنی پڑی، اور ایک سخت امتحان میں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر یہ روحانی کیفیت کامِل مُرشِد کی صحبت میں پہنچ کر حاصل ہُوئی۔

مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے بلھے شاہ کے دِل میں ایک چنگاری روشن ہوگئی، اور جس حقیقت کی حیران کُن صِفات بلھے شاہ نے ان کتابوں میں پڑھیں، اُس کے دیدار کی تڑپ اُس کے دِل میں جاگ اُٹھی۔ یہ تڑپ اور جُستجو ہی بلھے شاہ کو مُرشِد کامل حضرت شاہ عنایت قادری کے در پر لے آئی۔

حضرت عنایت شاہ اپنے وقت کے رسائی والے قادری صُوفی فقیر تھے۔ تاریخی نظریئے سے قادری صُوفیوں کا تعلق بغداد میں ہُوئے صُوفی فقیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ (۱۰۷۷-۷۸ تا ۱۱۶۶ عیسوی) سے ہے۔ حضرت جیلانی کو "پیرِ دستگیر" یا پیرانِ پیر کہہ کر بھی نوازا جاتا ہے۔ بلھے شاہ نے خود اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔ ہمارا "پیراں دا پیر"

---

[1] ایک خاص روحانی کیفیت جو مقامِ حق میں پہنچنے پر حاصل ہوتی ہے۔ اس کو ہندو بھگتوں کی اصطلاح میں "سہج گیان" کہا گیا ہے۔

بغداد میں ہُوا ہے، لیکن مُرشد لاہور شہر کا ہے۔

پیراں پیر بغداد اساڈا ، مُرشد تخت لاہور
اوہ اسیں سبھ اکو کوئی، آپ گُڈی آپ ڈور

حضرت جیلانی کے اقوال پر مشتمل دو کتابیں" الفتح الربانی" اور "فتوح الغیب" مشہور ہیں۔ اِن میں آپ نے بیرونی مذہبی رسم و رواج یعنی شریعت کی بجائے قلب کی صفائی اور خُدا کی بندگی پر زور دیا ہے۔[1] آپ کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ پر کڑوا پھل لگتا ہے، دوسری پر میٹھا۔ دانشمندی کڑوا پھل چھوڑ کر میٹھا پھل کھانے میں ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ نفس یا خُودی کے خلاف لڑا گیا جہاد تلوار کے ساتھ لڑے گئے جہاد سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ اِس سے خود پرستی اور شرک[*] (بُت پرستی) پر قابُو پایا جا سکتا ہے۔[2] شیخ جیلانی سچا صُوفی اُس کو مانتے ہیں، جو دُنیا کو ترک کرنے کی بجائے خانگی زندگی بسر کرتا ہُوا دُنیا سے لاتعلق رہے، تاکہ دوسرے لوگ بھی اُس کے اپنائے نصبُ العین سے فائدہ اُٹھا سکیں۔[3]

ہندوستان میں قادری صُوفی فرقے کا اثر تین صدیوں بعد ۱۴۸۲ء میں محمد غوث نامی صُوفی درویش کے وسیلے سے پہنچا۔ حضرت محمد غوث پہلے پہل بہاولپور میں آکر ٹھہرے اور بعد میں آپ کی تعلیم دُور دراز تک پھیل گئی۔

پنجاب کے صُوفی درویش حضرت میاں میر (۱۵۵۰ تا ۱۶۳۵ عیسوی) قادری جماعت سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ شری گورو رام داس جی نے امرت سر میں ہری ہرمندر صاحب کی بنیاد سائیں میاں میر سے رکھوائی تھی۔

۱-۳ History of Sufism in India, Vol. I, p. 84-85.

* شرک دو ہیں، شرکِ جلی اور شرکِ خفی۔ شرکِ جلی کا مطلب ہے شرکِ ظاہر و صریح جیسے بُت پرستی۔ شرکِ خفی کا مطلب ہے شرک پوشیدہ، جیسے کسی آدمی کو حاجت روا سمجھنا۔

سائیں میاں میر کا اثر اُس زمانے کے مُغل بادشاہوں پر بھی تھا۔ اورنگزیب کے صُلح کُل بھائی دارا شکوہ کو بھی قادری فرقہ کا پیرو کار مانا جاتا ہے[1]۔ دارا شکوہ نے میاں میر اور قادری فرقہ کی بہت تعریف کی ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ حضرت میاں میر بچپن سے ہی پارسا و پرہیزگار تھے وُہ ذکرِ خُدا اور خصوصاً الہامی وظیفہ[2] کے دِلدادہ تھے

حضرت عنایت شاہ قادری (وفات ۱۷۲۸ عیسوی) کی پیدائش کی تاریخ سے متعلق عُلماء میں اتفاق رائے نہیں ہے، لیکن آپ کے ایک دستی نُسخے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۶۹۹ عیسوی میں آپ کی صحت اچھی تھی۔ آپ قادری فرقہ کے ایک بُزرگ اور خُدا رسیدہ فقیر و بلند پایہ عالِم مصنّف تھے۔ آپ نے فارسی میں معرفت کی کئی کتابیں لکھیں، جن میں "دستُور العمل"، "اصلاحُ العمل"، "لطائفِ غیبیہ" اور "اشارتُ الطالبین"* خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ نے "دستُور العمل" میں سات روحانی منزلوں کا ذکر کیا ہے۔ قدیم ہندو رِشی مُنی "ہنس"[3] کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے اِن مرحلوں سے گزُرنا ضرُوری سمجھتے[4] تھے۔

حضرت عنایت شاہ کا ڈیرہ لاہور میں تھا، اِسی لئے آپ عنایت شاہ لاہوری کے لقب سے بھی مشہور تھے۔ آپ ذات کے ارائیں تھے اور کھیتی باڑی اور باغبانی پر گُزارہ کرتے تھے۔ آپ کچھ عرصہ قصُور میں بھی رہے، لیکن وہاں کے حاکم کی مُخالفت کے سبب لاہور آ گئے اور پھر تا زندگی یہیں رہے۔ آپ کا مقبرہ بھی لاہور میں ہی ہے۔ "باغِ اولیاءِ ہند"[5] میں آپ سے متعلق مندرجہ ذیل حوالہ ملتا ہے۔ ؎

باغباناں دی قوم وِچوں ہے، شاہ عنایت بھائی
شاہ رضا ولی اللہ توں، عظمت اُس نے پائی

---

[1] ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل: بُلھے شاہ صفحہ ۱۶ - [2] بھگتوں اور سنتوں کی اصطلاح میں اس کو "اجپا جاپ" کہا گیا ہے

[3] مُراد رُوح کی عالم لاہُوت کی کیفیت سے ہے۔ [4] پنجاب بھاشا وبھاگ، پنجاب۔ پٹیالہ صفحہ ۴۲۴

[5] مولوی محمد دین شاہ پوری: صفحہ ۳۸-۳۹- حوالہ ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل بُلھے شاہ صفحہ ۱۵

* کچھ مصنفوں نے اس کتاب کا نام "ارشادُ الطالبین" یا "ارشادُ الطالبین" لکھا ہے۔

قصبہ اِک قصور پٹھاناں ، اُس دا کرن گزارا
حُسین خاں حاکم اونہاں نوں ، دُشمن جانی بھارا
اوتھوں حضرت پکڑ کے ترا ، شہر لاہور وِچ آئے
دکھن پاسے دو کوہ پینڈا ، جھنڈے جس تھاں لائے
اوسے جگہ تے اِس مرد دا ، روضہ ویکھو آیا
یارھاں سو اکتالی وِچ دُنیا چھوڑ سِدھایا

کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عنایت کی صُحبت میں آنے سے پہلے بھی بُلھے شاہ کوئی نہ کوئی روحانی شغل کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس کو کوئی کراماتی طاقت بھی حاصل تھی۔ جب طالب بُلھے شاہ سائیں عنایت کی باغیچی کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ سڑک کے کنارے لگے ہُوئے آم کے درخت پھل سے لدے ہُوئے ہیں اور قریب ہی سائیں جی پیاز کی پنیری لگا رہے ہیں۔ بُلھے شاہ کے دِل میں آیا کہ سائیں کو معلُوم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ بُلھے نے بسم اللہ کہہ کر آموں کی طرف توجہ دی تو آم ٹوٹ کر دھڑا دھڑ زمین پر گِرنے لگے۔ سائیں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا کہ آم بلا وجہ گِر رہے ہیں۔ آپ فوراً تاڑ گئے کہ یہ شرارت سامنے کھڑے نوجوان کی ہے۔ آپ نے اُس کی جانب دیکھ کر کہا، "کیوں بھئی جوان، یہ آم کیوں توڑے ہیں"؟ بُلھے شاہ بس یہی چاہتا تھا کہ سائیں کے ساتھ کچھ بات چیت کرنے کا موقعہ ملے۔ آپ کے نزدیک جا کر کہنے لگا، "سائیں! نہ آپ کے درخت پر چڑھا، نہ پتھر مارا، میں نے آپ کا پھل کیسے توڑ لیا"؟ سائیں نے بُلھے کی طرف نِگاہ بھر کر دیکھا اور بولے۔ "ارے ایک تو چوری اور پھر سینہ زوری، اگر تُو نے پھل نہیں توڑا تو کِس نے توڑا ہے"؟ نظرِ کرم پڑتے ہی بُلھا سائیں جی کے قدموں پر گِر پڑا۔ سائیں نے پُوچھا "ارے تیرا کیا نام ہے اور تُو چاہتا کیا ہے"؟ بُلھے نے عرض کی" جی! میرا نام بُلھا ہے اور میں رب کو پانا چاہتا ہُوں"۔ سائیں نے کہا "ارے

---

[1] یہ ہجری سن ہے۔ جس کا عیسوی سن ۱۷۲۸ بنتا ہے۔ [2] بُلھے شاہ کے مُرشد کے ساتھ ملاپ کے واقعہ کو کئی طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف متفق الرائے کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔

تُو نیچے کیوں گرتا ہے، اُوپر اُٹھ کر میری طرف دیکھ" جیسے ہی بُلّھے نے اُٹھ کر حضرت شاہ عنایت کی طرف دیکھا، اُنہوں نے نظرِ مہر آلُود اُس پر ڈالی اَور کہا" اے بُلّھا! رَب کا کیا پانا ہے، اِدھر سے اُکھاڑ کر اُدھر لگانا ہے۔[1]" بُلّھے کے لئے اِتنا ہی کافی تھا، اُس کا کام بَن گیا۔

سائیں جی نے چند سادہ الفاظ میں روحانیت کا نچوڑ بھر دیا۔ آپ نے سمجھا دِیا کہ روحانی ترقی کا راز من کو باہر سے یعنی دُنیا کی طرف سے موڑ کر اندر خُدا سے جوڑنے میں ہے۔ اَور عملی طور پر دِکھا بھی دِیا، کہ یہ کام مُرشدِ کامل کی نظرِ عنایت سے ہی سرانجام ہوتا ہے۔

اِس چھوٹے سے مگر عظیم واقعہ، اتنے سادہ لیکن پُر معنی الفاظ اَور ایک تیکھی رحمت بھری نگاہ نے بُلّھے کے دِل پر مُرشِد کی عظمت کی دائمی مہر ثبت کر دی۔" بارغ اَولیاءِ ہند" میں اِس واقعہ کو معمولی فرق کے ساتھ یُوں بیان کیا گیا ہے۔ ؎

وِچ قصُور پٹھاناں دے ایہہ، ہویا مَرد حقّانی[2]
خواصّ[3] الرّسول اللہ دِیُوں، پوتّا[4] پیر جیلانی
حضرت شاہ عنایت پاسوں، عظمت[5] اُس نے پائی
وِچ لاہور جنہاں دا روضہ، دَکھن پاسے سائی[6]
بُلّھے شاہ دِل وِچ آکھے، مُرشِد بھیڑیئے چُن کے
دِل وِچ کیونکر ہوگ تسلّی، پانی پیئے پُن کے
کر کے شوق حَد اوہ حضرت، مُرشد ڈھونڈن بھائی
لاہور شہر وَل اوّل حضرت، ٹُر کے نظر ٹکائی
آ کے وِچ لاہور شہر دے، اندر کرن گزارا،
بارغ جھڑے وِچ شاہ عنایت، اوہتے کرن اُتارا

---

[1] بُلھیا رب داکی پاؤنا، ایدھروں پُٹنا تے اودھر لاؤنا۔" [2] رب کا بندہ
[3] حضرت محمدؐ صاحب کے خاندان میں سے۔ [4] حضرت عبد القادر جیلانی کے مُرید کا مُرید۔ [5] بڑائی۔
[6] تھا۔

سی اَمب پکا اوس ویلے ، نظر ولی نوں آیا
کر بسم اللہ ڈِٹھا[1] اوّل ۔ اَمب بیٹھاں اوہ ڈھائیا

شاہ عنایت کرے آوازاں ، سُن تُو مَردا راہیا
اَمب چُرایا تُدھ اساڈا ، دے دے سانوں بھائیا[2]

بُلھے شاہ کہے نہ چڑھیا ، اُوپر اَمب تمہارے
نال ہوا دے اَمب ٹُٹ کے ، جھولی پیا ہمارے
بِسم اللہ پڑھ اَمب آتاریا ۔ کیتی ہے توں چوری
بُلھے شاہ وی جان لیا ، ہے برکت اِس وِچ پُوری

شاہ عنایت دے قدمی ڈِگّا ، اُس دَم مرد روحانی
راضی ہو کے بیعت[3] قبولی ، پایا[4] راز نہانی

مُرشِد سے وِصال اَور مُرشد سے بیعت ہونے کے واقعہ اَور بُلھے شاہ پر ہُوئے اُسکے گہرے اثر کو ایک عالِم نے یُوں بیان کیا ہے۔

"بُلھے شاہ میں وُہ تمام کمالات موجُود تھے جو شاہ صاحب اپنے کسی ہونہار مُرید میں ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ آپ نے اپنا باطن کھول کر بُلھے شاہ کے سامنے رکھ دیا۔۔۔ دیدار ہُوا۔ بُلھے شاہ بے خود ہو گیا۔ اور اِسی بے خودی کی حالت میں منصُور کی طرح روحانی چشمہ پھُوٹ نِکلا۔"[5]

بُلھے شاہ کا وقت عجیب محوّیت کے عالَم میں بسر ہونے لگا۔ مُرشِد کی صحبت اَور اس کے بتائے ہُوئے شُغل سے بُلھے شاہ کی روحانی حالت روز بروز بدلنے لگی۔ اپنی کافی ع

" جو رنگ رنگیا گوہڑا رنگیا مُرشِد والی لالی اویار"

میں بُلھے شاہ اشارتاً کہتا ہے کہ مُرشِد نے مجھے گہرے روحانی رنگ میں رنگ دیا ہے میری

---

[1] گرا [2] اے بھائی! [3] مُرید بننا [4] پوشیدہ راز پایا۔
[5] سُندر سنگھ نرُولہ (مُطبع) : سائیں بُلھے شاہ ، امرتسر ۱۹۳۱ صفحہ ۹

اندرُونی آنکھ کُھل گئی ہے۔ میرے تمام شکوک دُور ہو گئے ہیں اَور مجھ پر حقیقت کا نوُر برسنے لگا ہے۔ مُرشِد کی رحمت سے مجھے باطن میں محبوبِ حقیقی کا دیدار ہو گیا ہے' اَور میرے لئے رَبّ اَور مُرشِد کا فرق ختم ہو گیا ہے۔

بُلھے شاہ کے دِل پر مُرشِد کی محبت کا اِس قدر گہرا رنگ چڑھ گیا کہ اُس کو سوائے مُرشِد کے کسی اَور شے کا ہوش وحواس نہ رہا۔ اس میں عجیب قِسم کی لاتعلقی اَور بے پروائی پیدا ہو گئی' اَور اُس کی ہر ادا رمز آمیز ہو گئی۔ پروفیسر پُورن سنگھ نے اپنی کتاب "سپرٹ آف اورینٹل پوئٹری" میں بُلھے شاہ کی زندگی کے اِس دَور کا ایک دِلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دِن ایک نوجوان عورت کو، جس کے شوہر نے گھر آنا تھا، سَر گُندھواتے دیکھ کر بُلھے شاہ کے دِل میں ایک عجیب اُمنگ اُٹھی۔ وُہ بھی اُس عورت کی طرح سر گُوندھوا کر اپنے مُرشد کے ڈیرے کی جانب چل پڑا کہ 'مَیں بھی اپنے مُرشد سے مِل لُوں'۔ دُنیاوی رُجحان والے لوگوں کو اس طرح کا کام مضحکہ خیز معلُوم ہوگا لیکن اس سے نہ صرف بُلھے شاہ کے عِشق کی گہرائی اَور اُس کے دِل کی معصُومیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اُس کی فقیرانہ بےپروائی اَور مُرشد پر دل وجان سے فدا ہونے کے بےاختیار جذبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقی عاشقوں کی طرح بُلھے شاہ نے اپنی مَردانہ اکڑ چھوڑ کر اپنے آپ کو ایسی لاچار و بے سہارا عورت کی شکل میں ڈھال لیا، جو خودی کو ترک کر کے اپنے آپ کو مکمل طور پر محبُوب کے سپُرد کر دیتی ہے۔

مُرشِد کی پناہ میں آنے سے پہلے بُلھے شاہ کے دِل میں جو سوالات شکوک وشبہات اوہام اَور وَسوَسے تھے، وُہ اندرُونی رُوشنی میں غرق ہو گئے۔ بُلھے شاہ نے جب وقت سائیں عنایت شاہ کا مُریدبننے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اُسے سمجھایا تھا کہ تُو صاحبِ عِلم وفضل، کراماتی طاقتوں کا مالِک اَور حضرت محمدؐ صاحب کی نسل سے تعلق رکھتے ہُوئے ایک معمُولی باغبان اَور ادنیٰ ذات ارائیں کا طالب بننے کے لئے جائے تو کیا یہ تمہارے لئے باعثِ شرم نہیں ہے؟ لیکن مُرشِد اسم بامسمّیٰ ثابت ہوا۱۔ اُس نے بُلھے شاہ پر اِس قدر عنایت کی کہ ایک ہی

۱؎ عنایت کا لفظی مطلب مہربانی یا بخشش ہے۔

نگاہ سے اُس کو روحانی تجلی سے سرشار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بلھا وجد اور مستی کی حالت میں پکار اُٹھا ؎

بُلھیا جے توں باغ بہاراں لوڑیں
چاکر ہو جا رائیں دا۔

بُلھے شاہ نے عنایت کا دامن ایسا پکڑا کہ پھر کبھی نہ چھوڑا۔ بُلھے شاہ کے کلام میں مُرشد کے عشق اور اُس کی تعریف میں عقیدت سے لبریز جو بیان ملتے ہیں اُن میں مستی بھی ہے اور رنگینی بھی۔ وجد بھی ہے اور شکرانہ بھی۔ اِس تعریف میں اُس نے مُرشد اور خدا میں کوئی تمیز نہیں رکھی۔ اُس نے شاہ عنایت کو ہدایت کرنے والا ہادی[1] اور خدا سے وصال کرانے والا مُرشدِ کامل کہا ہے[2]، اور اُس کو خصم، شوہ، سائیں، دلبر، سجن، اور یار[3] وغیرہ کہہ کر اُس کے تئیں اپنے حقیقی عشق کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] میرے دُکھ دی سُنے حکایت۔ آ عنایت کرے ہدایت
تاں میں تاری آں ——— (اٹھوارہ)

[2] (ا) شاہ عنایت مُرشد میرا، جس نے کیتا میں وَل پھیرا
چُک گیا سب جھگڑا جھیڑا۔ ہُن مینوں بھرما وے کون ——— (سی حرفی)

(ب) بلھا شوہ سنگ پریت لگائی، جِند[4] جامے دی دِتّی سائی
مُرشد شاہ عنایت سائیں، جس دِل میرا بھرما ہو ——— (سی حرفی)

(پ) ہر ہر دے وِچ آپ سمایا
شاہ عنایت آپ لکھایا[5] تاں میں لکھیا ——— (باراں ماہ)

[3] (ا) عنایت سیج تے آ وسی ہُن میں وَل پُھل کے ——— (گنڈھاں)

(ب) سَئیاں دین مبارک آئیاں
شاہ عنایت آکھاں سائیاں۔ آساں پُنیاں[6] ——— (باراں ماہ)

(پ) ماپے چھوڑ لگی لڑ تیرے، شاہ عنایت سائیں میرے
لائیاں دی لج پال[7] وے، وہڑے آ وڑ میرے

(ت) آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا[8] لائیو ئی
بلھا شوہ گھر وسیا آکے، شاہ عنایت پائیو ئی

(ٹ) بلھا شوہ دی ذات نہ کائی، شاہ عنایت پایا اے

---

[4] جِند جامہ = رُوح و جسم۔ [5] دکھایا [6] پوری ہوئیں۔ [7] لج پالنا = آبرو رکھنا۔ [8] جھگڑا۔

وُہ اپنے مُرشِد کو سچّا عارف، رُوح کا مالک اَور لوہے کو سونا بنانے والا پارس کہتا ہے ؎

بُلھا شوہ عنایت عارف ہے
اوہ دِل میرے دا وارث ہے
مَیں لوہا تے اوہ پارس ہے

مُرشِد ایک عاجز اَور نااہل مُسافر کو بحرِ ہستی سے پار اُتارنے والا ماہر تیراک ہے۔[1] وُہ رُوح کو حقیقت کے رنگ میں ڈبو کر اسکو اُونچی پرواز کا انداز سکھا کر خدا سے وصال کرانے والا ثالث ہے ؎

بُلھا شوہ نے آندا مینوں عنایت دے بُوہے
جس نے مینُوں پوائے چولے ساوے تے سُوہے
جا مَیں ماری ہے اَڈّی رِل پیا ہے وہیّا[2]
تیرے عشق نچایا کر تھیّا تھیّا

بُلھا مُرشِد کو ہی دِین ایمان، دِین اَور دُنیا کہتا ہے ؎

شاہ عنایت دِین اساڈا۔ دِین دُنی مقبُول اساڈا

یہی نہیں، اُس کو مُرشِد کی ذات میں خُدا کی ذات سمائی نظر آنے لگی اَور اُس کو خُدا کی طرح مُرشِد بھی ہر جگہ حاضر ناظر دکھائی دینے لگا۔ ؎

ساون سوہے[3] مینگھلا۔ گھٹ سوہے کرتار
ٹھوَر ٹھوَر[5] عنایت بسے۔ پپیہا کرے پکار

حضرت محمدؐ کے خاندان کے ایک عالم فاضل سیّد کا ایک معمُولی ارائیں کو اپنا مُرشِد مان لینا اہلِ زمانہ کی نظر میں معمُولی بات نہ تھی۔ یہ ایسا زبردست دھماکہ تھا، جس نے سارے گرد و نواح میں ہل چل مچادی۔ بُلھے شاہ کو اپنے مذہب، ذات اَور برادری کے لوگوں کی مُخالفت اَور

---

[1] بُلھا شوہ دے لائق نا ہیں شاہ عنایت تاری۔ [2] وہی (محبُوب)
[3] سہاونا لگتا ہے۔ [4] بادل [5] ٹھوَر ٹھوَر = جگہ جگہ، ہر جگہ

کئی قسم کے طعنے برداشت کرنے پڑے۔ وُہ کہتا ہے ؎

۱۔ عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک[1] مرندے طعنے
۲۔ مِتر پیارے دے کارن نی مَیں لوک اُلاہمیں سہنی ہاں
۳۔ بُلھے نُوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں
آل نبی اَولادِ علی دی تُوں کیوں لیکاں[1] لائیاں
مَن نے بُلھیا ساڈا کہنا، چھڈ دے پلہ رائیاں

بُلھے شاہ نے بڑی بے خوفی سے اِس بات کا اعلان کیا کہ مُرشِد کامِل خواہ کسی ادنےٰ سے ادنےٰ ذات میں آئے ہوں، اُن کا دامن پکڑ کر ہی انسان بحرِ ہستی سے پار اُتر سکتا ہے۔ وُہ بے دھڑک ہو کر کہتا ہے کہ سیّد ذات کا غرور کرنے والے دوزخ کی آگ میں جلیں گے اور سائیں عنایت جیسے ارائیں کا دامن تھامنے والے رُوحانی دَولت سے مالا مال ہو جائیں گے ؎

جیہڑا سانُوں سیّد آکھے، دوزخ مِلن سزائیاں
جیہڑا سانُوں رائیں آکھے، بہشتی پینگاں[2] پائیاں
جے تُوں لوڑیں باغ بہاراں، طالب ہو جا رائیاں[3]

سائیں بُلھے شاہ کی اُن دنوں کی زندگی کے ایک واقعہ میں اُن کی مستی، بے پروائی اَور دریا دِلی کی ایک خوبصورت تصویر جھلکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دُنیا کے تنگ کرنے پر بُلھے شاہ نے گدھے خرید لئے تا کہ دُنیا آپ سے نفرت کرنے لگ جائے۔ آپ کو لوگ "کھوتیاں[4] والا" کہہ کر

---

[1] لیکاں لائیاں = بد نامی کا باعث بنا۔
[2] تُلسی صاحب کہتے ہیں :— نیچ نیچ سب تر گئے سنت چرن لولین
جاتی کے ابھیمان میں ڈوبے بہت کُلین
کبیر صاحب کہتے ہیں:۔ جات نہ پُوچھو سادھ کی پُوچھ لیو گیان
مول کرو تلوار کا پڑا رہنے دو میان
[2] جھُولے۔ [3] ارائیں کا۔ [4] گدھیاں والا

پُکارنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اُن دِنوں کسی غریب کی بیوی کو ایک جابر حاکم زبردستی اُٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ جب اُس کی فریاد کسی نے نہ سُنی تو لوگوں نے کہا کہ سائیں بُلھے شاہ کمائی والا فقیر ہے، تُو جا کر اُس کی منت کر۔ جب وُہ شخص اُن کے پاس گیا تو سائیں جی نے کہا، "جا کر شہر میں دیکھ کہیں طبلہ، سارنگی بج رہے ہوں"۔ اُس نے آکر بتایا کہ ایک جگہ ہیجڑے گا رہے ہیں۔ آپ بھی ان میں جا کر شامل ہو گئے، اور ناچنے لگ پڑے۔ جب وَجد میں آئے تو اُس شخص سے پُوچھا کہ وُہ حاکم کہاں رہتا ہے؟ وُہ کہنے لگا کہ فلاں جگہ کھجوروں والے باغ اور آموں والی باغیچی میں رہتا ہے۔ آپ نے بھرپُور توجہ دے کر کہا ؎

اَمباں والی لغیچی سُنی دی ، کھجی والا باغ
کھوتیاں والے سَد بلائی . سُتی ایں تاں جاگ[1]
رچھنیا ایوُں چھڑیندا یار ، رچھنیا ایوُں چھڑیندا

آپ کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وُہ عورت بے تحاشا کھچی چلی آئی۔ آپ نے کہا "جا بھائی! لے جا"۔ اُدھر آپ کے والد محترم کو لوگوں نے بھڑکا دیا کہ پہلے تو تمہارے بیٹے نے گدھے ہی رکھے تھے، اَب ہیجڑوں کے ساتھ ناچنے بھی لگ گیا ہے اَور سیّدوں کی عزت مٹی میں ملا رہا ہے۔ آپ کا والد ایک ہاتھ میں لاٹھی اَور دوسرے میں تسبیح لئے وہاں آ پہنچا۔ آپ نے جب باپ کو آتے دیکھا تو دِل میں آیا کہ آج یہ بھی خالی نہ جائے، تو توجہ دے کر گانے لگے ؎

لوکاں دے ہتھ مالیاں تے بابے دے ہتھ مال
ساری عُمر پِٹ پِٹ مرگیا کھُس نہ سکیا وال[2]
رچھنیا ایوُں چھڑیندا یار ، رچھنیا ایوُں چھڑیندا

باپ بھی وجد میں آکر ناچنے لگا اَور اندرُونی پردہ کھُل گیا ، ہاتھ کی تسبیح پھینک دی

---

[1] اَیسے کُوٹا جاتا ہے۔
[2] کھُس نہ سکیا وال (محاورہ) = کچھ نہ بن سکا۔

اور پکار اُٹھا ؎

اُبّتر جنہاں دے رنگ رنگیلے ماپے وی لیندے نار[1]
چھینا ایئوں چھڑیندا یار! چھینا ایئوں چھڑیندا

عشق کا ابتدائی سفر بہت دِلکش ہے۔ لیکن اس کی راہ پُرخطر اور منزل دُور ہے۔ عاشق کی ذراسی ناسمجھی یا کوتاہی معشوق کی ناراضگی کا باعث بن جاتی ہے اور عاشق کے لئے مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا کر دیتی ہے۔ یہی حال بُلھے کا ہُوا، جب اس کی کوتاہی کے سبب مُرشد اس سے ناراض ہو گیا۔

کُچھ کھوجیوں نے مُرشد کی ناراضگی کا سبب یہ بتایا ہے کہ بُلھے شاہ نے کھلے عام شریعت پر نُکتہ چینی کرنی شروع کر دی تھی جو مُرشد کو پسند نہ آئی۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں لگتی، کیونکہ شریعت پر نُکتہ چینی تو تمام صُوفی اپنے اپنے طریق سے ہمیشہ کرتے آئے ہیں اور قادری فرقہ کے صُوفی بھی شریعت کے پابند نہیں تھے۔

مُرشد کی ناراضگی کا سبب ایک دُوسرے واقعہ میں بالکل مُختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے ”ایک دفعہ آپ نے اپنے مُرشد عنایت شاہ کو اپنے کسی نزدیکی رشتہ دار کی شادی میں شامل ہونے کے لئے دعوت دی۔ سائیں جی نے اپنی جگہ اپنے ایک طالب کو بھیج دیا۔ وُہ طالب ذات کا ارائیں تھا اور فقیرانہ لباس میں تھا۔ ایک طرف آپ کی برادری کے لوگوں کو سید ہونے کا غرور تھا، اور دوسری طرف اس کے معمولی لباس کو دیکھ کر انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ آپ بھی چُوک گئے۔ چاہیئے تو یہ تھا، کہ آپ اپنے مُرشد کے نمائندہ جو آپ کا خواجہ تاش (پیر بھائی) بھی تھا، کے ساتھ عزّت سے پیش آتے۔ لیکن دُنیاداری میں آکر آپ نے بھی اُس کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ جب طالب شادی سے واپس آیا، تو سائیں جی نے پُوچھا کہ کیسی رہی؟ اس نے سارا ماجرہ بیان کر دیا، اور گلہ کیا کہ میری ادنیٰ ذات کی وجہ سے بُلھے شاہ اور اُس کے گھر والوں نے مُجھے نظر انداز کر دیا۔ سائیں جی

[1] لیندے تار = نجات دلا دیتے ہیں۔

کہنے لگے، "بُلھے کی یہ مجال"! پھر بولے، "ہم نے اُس نکمے سے کیا لینا ہے، چلو ہم اُس کی کیاریوں سے پانی موڑ کر تیری طرف کر دیتے ہیں"۔ بس، اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بُلھے شاہ کے لئے قیامت برپا ہو گئی۔ جیسے ہی مُرشد نے رحمت کا سرچشمہ بند کیا، اُس کی بہار خزاں میں بدل گئی۔ پردہ بند ہو گیا۔ اندرونی نظارے جاتے رہے، تجلّی ظُلمت میں اور خوشی ماتم میں تبدیل ہو گئی۔ بُلھے شاہ کے سر پر مُصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جس کو شروع سے ہی رَبّی سُرور کی لذت نہ مِلی ہو اور جس نے باطن میں مُرشِد کی ذات کا نُوری جلوہ نہ دیکھا ہو، اُس کی بات کچھ اَور ہے۔ لیکن جو انسان ایک بار اِس اندرونی بیش بہا دَولت سے مالامال ہو چُکا ہو، اُس سے اگر اچانک یہ دَولت چھین لی جائے، تو اُس پر جو گذرتی ہے وُہی جانتا ہے۔ اصل میں رُوحانی دَولت کا مالک مُرشدِ کامِل ہوتا ہے۔ طالب یا مُرِید اِس لحاظ سے مُرشِد کی رحمت کا محتاج ہے۔ اگرچہ ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ طالِب خُود مُرشد کی تلاش کرتا ہے اور اپنی کوشش سے اُس کے بتائے ہُوئے راستہ پر چل کر ترقی کرتا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وُہ نہ تو عقل و فکر کی مَدد سے مُرشِدِ کامِل کی پہچان یا تلاش کر سکتا ہے، نہ اپنی طاقت یا ہوشیاری سے اُس سے حقیقی راستہ حاصِل کر سکتا ہے، اور نہ ہی اپنی کوشش سے اندرونی منزلیں طے کرنے کے قابل بن سکتا ہے۔ حقیقی راہ کا مِلنا، رُوحانی ترقی کا حاصِل ہونا اور اس کا قائم و دائم رہنا سَب مُرشِد کے رحم و کرم پر مُنحصر ہے۔[۱] بُلھے شاہ نے خُود لکھا ہے ؎

گورُو جو چاہے سو کردا ہے
گورُو خالی کاسے بھردا ہے
گورُو بھریاں نُوں خالی کردا ہے

۱؎ اِسی موضُوع پر دیکھئے مولانا رُوم کیا کہتے ہیں ؎

اولیا را ہست قُدرت از اِلٰہ — تیر جستہ باز آرندش براہ

اولیا کو خدا نے یہ طاقت عطا کی ہے کہ وُہ ایک چلے ہُوئے تیر کو راستے سے واپس لا سکتے ہیں۔

لیکن اِس حقیقت تک پہنچنے کے لئے اُس کو مُرشد کی ناراضگی اور ہجر کی آگ کے خوفناک سمندر کو عبور کرنا پڑا۔

پردہ بند ہوتے ہی بُلّھا مُرشد کے پاس دَوڑ آگیا، لیکن مُرشد نے مُنہ موڑ لیا، اور اس کا درگاہ میں آنا ممنُوع کر دیا۔ ایک تو مُرشد کی ناراضگی اور دُوسرے مُنہ نہ لگنے کا حکم! کسی مُرید کے لئے اِس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے؟ بُلّھے کی جان پر بن آئی۔ وُہ جُدائی اور پشیمانی کی حالت میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

بُلّھے شاہ کے کلام میں اس دَرد بھری حالت کا دِلسوز ذِکر مِلتا ہے۔ اس کی کئی کافیوں میں اُس کی آپ بیتی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اِن کافیوں کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں کوئی پکا دعوےٰ کرنا مُشکل ہے، مگر یہ سائیں بُلّھے شاہ کی اُس وقت کی دِلی حالت کی ترجمان معلُوم ہوتی ہیں۔ ان میں ہجر کے دَرد کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔" احساس کی شدّت، جذبات کی سچائی، سوز اور تڑپ میں یہ کافیاں لاثانی ہیں"۔[۱]

مندرجہ ذیل کافی سے معلوم ہوتا ہے کہ محبُوب کے وصال سے ملے سرُور کی یاد اور محبُوب کی جُدائی کی تڑپ ایک پوشیدہ آگ کی مانند بُلّھے شاہ کو جلا کر راکھ کرتی چلی جا رہی ہے۔ وُہ ترکِ محبت نہیں کر سکتا، لیکن محبُوب کی جُدائی میں اُسے نہ دِن کو چَین ہے، نہ رات کو قرار۔ محبُوب کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ دیدار کے بغیر سینہ پھٹا جا رہا ہے اور جگر جلتا ہے۔ اس دَرد کو برداشت کرنا مُحال ہے، لیکن ترکِ محبت بھی ناممکن ہے۔ اس لئے وُہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا ہے۔

اَب لگن لگی کیہہ کریئے؟
نہ جی سکیئے تے نہ مریئے
تُم سُنو ہمارے بیناں[۲]، موہے رات دِنے نہیں چَیناں

---

۱ پنجابی ساہت دا اتہاس، بھاشا وبھاگ، پٹیالہ۔ صُوفی کویتا (مدھ کال) صفحہ ۶۰
۲ فریاد

ہُن پی بِن پلک نہ سَریئے*۔ اَب لگن لگی کیہہ کریئے؟
نہ جی سکیئے تے نہ مَریئے

اِیہہ اگن برہوں دی جاری، کوئی ہمری پریت نواری
بِن درشن کیسے تریئے؟ اَب لگن لگی......
بُلھے پئی مصیبت بھاری، کوئی کرو ہماری کاری
ایہہ اجیہے دُکھ کیسے جریئے، اَب لگن لگی.......

ایک اَور کافی میں جُدائی کے دَرد کا بیان یُوں کیا ہے ؎

مینُوں چھڈ گئے آپ لَد گئے[1]، مَیں وِچ کیہہ تقصیر[2]
راتیں نیند نہ دِنے[3] سُکھ، اَکھیں پلٹیا نیر
چھریاں تے تلواراں کولوں، عشق دے تِکھے تِیر
عشق جیہڈ نہ ظالم کوئی، ایہہ زحمت[4] بے پِیر
اِک پل ساعت[5] آرام نہ آوے، بُری بِرہوں دی پِیڑ
بُلھا شوہ جے کرے عنایت، دُکھ ہوون تغییر[6]
مینوں چھڈ گئے آپ لَد گئے. مَیں وِچ کیہہ تقصیر

جیسے جیسے جُدائی کا عرصہ دراز ہوتا ہے، بُلھے کا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ایک طرف جُدائی کا دُکھ اَور دوسری طرف دُنیا کے طعنے اس کو ہر لمحہ بسمل کرتے ہیں۔ وُہ مُرشد کی یاد میں سجدے کرتا ہے۔ بار بار عرض گزارتا ہے کہ اَے میرے سائیں عنایت شاہ! مجھے جلدی سے جلدی اپنا دیدار بخش۔

---

* گذارہ نہیں۔

[1] چلے گئے۔ [2] خطا، غلطی [3] کئی جگہ یُوں لکھا ہے ؎ راتیں نیند نہ دِن سُکھ سُتی۔
[4] مُصیبت۔ بے پیر = بے اصُول یعنی اس دُکھ کا کوئی اصُول نہیں۔
[5] گھڑی بھر۔ [6] اگر محبُوب مہر کرے تو دُکھ دُور ہو جائیں [6] بدل دینا۔

میرے ماہی کیوں چر لایا اے
کہہ بُلھا ہُن پریم کہانی، جس تن لاگے سو تن جانے
اندر جِھڑ کاں باہر طعنے[۱]، نیہوں لا ایہہ سُکھ پایا اے[۲]
نیناں کا آر[۳] رون دی پکڑی، اک مرنا دُوجے جگ دی ہکاڑی[۴]
برہوں جند آؤلی جکڑی، نی میں رو رو حال ونجایا اے[۵]
بُلھا شوہ گھر لپٹ لگائیں، رستے میں سجہ بن تن جائیں
میں ویکھاں عنایت سائیں، جِن مینوں شوہ[۶] ملایا اے

بُلھا اپنی خطا پر پشیمان ہے جو اُس کی جان کا عذاب بن گئی ہے۔ وُہ اپنی خطا بخشوانا چاہتا ہے۔ وُہ دِل ہی دِل میں مُرشِد کے آگے منت کرتا ہے کہ اَب جُدائی کا زخم بھر دے، تڑپتے ہُوئے دِل کو اپنے دیدار سے ٹھنڈک پہنچا۔

مینوں درد اولڑے دی پیڑ
آ میاں رانجھا دے دے نظارہ، مُعاف کریں تقصیر
تخت ہزاریوں رانجھا ٹریا، ہیر نمانی دا پیر
ہور نا دے نوشہ[۷] آوے جاوے، کی بُلھے وِچ تقصیر

بُلھا صِرف اپنے دُکھ کا حال ہی بیان نہیں کرتا، اپنے مُرشِد سے گلے شکوے بھی کرتا ہے۔ ایک طرف وُہ اپنی کچی عقل پر پشیمان ہے اور دُوسری طرف مُرشِد کو طعنے دیتا ہے، جس نے محبت کا تیر کلیجے میں لگا کر مُنہ چھپا لیا اور پھر کبھی بات بھی نہ پُوچھی۔

گھائل کر کے مُکھ چھپایا، ایہہ چوریاں کن دسیاں وے
نیہوں لگا کے مَن ہر لینا، پھیر نہ اپنا درشن دینا

---

[۱] پیار۔ [۲] کام، عادات [۳] ہنسی، طعنے۔ [۴] لاعلاج۔ [۵] حال ونجایا = بُرا حال کر لینا
[۶] شوہ، محبُوب۔ [۷] عجیب [۸] دولہا، یہاں مُراد خاوند سے ہے۔

زہر پیالہ ہیں آپے پیتا، سی عقلوں ہیں کچیاں وے

وُہ شاہ عنایت کولاہور کا ٹھگ کہہ کر بھی طعنہ دیتا ہے، جس نے پیار کی ایسی میٹھی مار ماری ہے کہ اُس کو کہیں کا نہ چھوڑا ہے

اِس دا مُول نہ کھانا دھوکا، جنگل بستی ملے نہ ٹھوَر

دے دیدار ہویا جدراہی، اچن چیت[1] پئی گل پھاہی

ڈاڈھی[2] کیتی بے پرواہی، مینوں ملیا ٹھگ لاہور

مُرشد کی جُدائی میں زار وقطار رونا بُلھے کا روزمرہ کا دستور بن چکا تھا۔ بُلھے کا یہ دردِ جدائی وحشت کی حد تک پہنچ گیا، اور وُہ دیوانوں کی طرح گلی گلی کُوچہ کُوچہ بھٹکنے لگا۔ جب اُسے مُرشد کے وِصال کی حسرت نے بے حال و بے حواس کر دیا تو وُہ اِس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیئے تدبیریں سوچنے لگا۔ اُسے اِس بات کا علم تھا کہ اس کا مُرشد شاہ عنایت اپنے مُرشد کے عُرس پر ہر سال جایا کرتا ہے۔ کہتے ہیں[3] کہ بُلھے شاہ نے عورت کا بھیس بنا لیا، سارنگی پکڑ لی۔ اور کسی ناچنے گانے والی کا شاگرد ہو گیا۔ اس نے ناچنا سیکھا اور گانے میں کمال حاصل کر لیا جب وُہ اِس فن میں ماہر ہو گیا تو سازندوں اور ناچنے گانے والوں کے ہمراہ اُس مزار پر پہنچ گیا، جہاں سالانہ عُرس پر حضرت شاہ عنایت بھی گئے ہُوئے تھے۔ باقی سب ناچنے گانے والے تو تھک کر بیٹھ گئے، لیکن بُلھا وجد میں آ کر دیوانہ وار ناچتا گیا۔ اُس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ اُس کے گانے میں کلیجے کو چھلنی کر دینے والی پُکار تھی۔ کہتے ہیں کہ بُلھے شاہ نے اُس وقت کئی درد بھری کافیاں گائیں۔ آخر کار اس کی دردناک حالت کو دیکھ کر مُرشد کا دِل پسیج گیا۔ مُرشد نے خوش ہو کر کہا "ارے تو بُلھا ہے؟" بُلھا دوڑ کر مُرشد کے قدموں پر گر پڑا۔ آنکھوں سے پشیمانی کے آنسو جاری ہو گئے اور کہنے لگا "حضرت! بُلھا نہیں بُھلا ہاں[5]":

---

[1] اچانک [2] بہت زیادہ۔

[3] ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل: بُلھے شاہ صفحہ ۲۶

[4] مولا بخش کُشتہ: پنجابی شاعراں دا تذکرہ صفحہ ۱۰۴۔ [5] بھولا ہوا، قصور وار، بھٹکا ہوا۔

مُرشد کبھی بھی اپنے مُرید کے بارے میں بے خبر نہیں ہوتا۔ جب دیکھا کہ پشیمانی اور جُدائی کی آگ نے بُلھے کو تپا کر خالص کُندن بنا دیا ہے، تو اُس کی خطا بخش دی اور اُسے پھر سینے سے لگا لیا[1]۔ اِس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُرشدِ کامل نے بُلھے شاہ کو ہجر کی آگ کی آزمائش میں سے اِس لئے گزارا کیونکہ وُہ یہ چاہتے تھے کہ جس قلب میں مالکِ کُل کے حقیقی عشق اور اس کے کلمہ کی بے بہا دولت نے گھر کرنا ہے، وُہ پک کر اُس دولت کو سنبھالنے کے قابل بن جائے۔

پھر کیا تھا۔ رحمت کا بند چشمہ دوبارہ پھوٹ نکلا۔ بُلھے کی سُوکھی کیاری کو پھر سے پانی ملنے لگ گیا۔ اُس کی گُلزار پھر سے کھِل اُٹھی، اور اُس میں لُطف و سرُور کے رنگ برنگے پھُولوں کی مہک بھر گئی۔ "قانونِ عشق" کا مُصنف انورعلی رُہتکی لکھتا ہے کہ مُرشد بُلھے شاہ کو سینے سے لگا کر اپنے ساتھ لے گئے اور اُسے رات دِن اپنی صحبت کے جام پلانے لگے۔ بُلھے شاہ کی رُوح مُرشد کی رُوح کے رنگ میں رنگی گئی، اور دونوں میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ بُلھے شاہ کی ایک کافی اُس کی اِس فنا فی الشیخ[2] کی کیفیت کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے۔ ؎

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدّو نی مینُوں دِھیدو رانجھا[3] ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وِچ میں رانجھے وِچ ہور خیال نہ کوئی
میں نہیں اوہ آپ ہے اپنی آپ کرے دلجوئی
ہتھ کھونڈی میرے اگّے منگو[4] موڈھے بھورا لوئی
بُلھا ہیر سلیٹی[5] ویکھو کتھے جا کھلوئی[6]

---

[1] انورعلی رُہتکی:۔ قانونِ عشق، لاہور، کافیاں ۵۵ - ۵۴
[2] فقر کا ایک مرتبہ جس میں مُرید اپنے مُرشد میں جذب ہو جاتا ہے۔ [3] رانجھے کا اصلی نام [4] مویشی [5] کندھے پر [6] سیال (دراز:ری) کی بیٹی۔

[6] اِس بارے میں حضرت معین الدین چشتی فرماتے ہیں:۔ ؎

مرا در دِل بغیر از دوست چیزے در نمے گنجد۔ بخلوت خانۂ سُلطان کسے دیگر نمے گنجد

میرے دِل میں سوائے میرے دوست کے کچھ نہیں سماتا۔ جیسے کہ سلطان کی خلوت گاہ میں کوئی دوسرا نہیں آسکتا۔

مُرشِد اللہ تعالیٰ میں سمایا ہوتا ہے۔ اِس لئے مُرشِد کی ذات میں اپنی ہستی کو فنا کر دینا ہی اللہ تعالیٰ میں سماجانا ہے۔ اِس کیفیت کو آپ نے "تُوہیوں مَیں مَیں ناہیں سجناں تُوہیوں ہَیں مَیں ناہیں" اور "پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہُوئے اب پیا کِس نُوں کہیئے" کہہ کے بیان کیا ہے۔ اس کیفیت میں پہنچ کر دُوئی کا بھرم دُور ہوجاتا ہے، اَور ہر طرف ایک ہی قادر کا جلوہ دِکھائی دیتا ہے۔ آپ کہتے ہَیں کہ مَیں مالکِ کُل کے عِشق کے رنگ میں اِس طرح رنگا گیا ہُوں، کہ خودی کا احساس بالکل ختم ہوگیا ہے، اَور مجھے جسم کے پردے میں نہاں اپنی اصلی ہستی کا عِلم ہوگیا ہے۔ اَب مجھے کُل عالم میں محبُوب کا ہی جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ میرے لئے سَبھی اپنے ہوگئے ہَیں، کوئی بیگانہ نہیں رہا ؎

اَب ہَم گُم ہُوئے پریم نگر کے شہر
اپنے آپ کو سُودھ[1] رہا ہُوں، نہ سِر ہاتھ نہ پیَر
خُودی کھوئی اپنا پَد چینتا[2]، تب ہُوئی گُل خیَر
لتھے دھگڑے[3] پہلے گھر ہتیں، کون کرے نِرویَر؟
بُلھا شوہ ہے دوہیں جہانیں، کوئی نہ دِسدا غیر

اِس عالمِ یکتائی میں ہندُو مُسلمان، اپنے پرائے کے سَب جھگڑے ختم ہوگئے، اَور بُلھے شاہ کو سبھی پارسا دکھائی دینے لگے۔ آپ کے لئے کوئی چور یا سادھو نہیں رہا ؎

سبھ سادھ کہو کوئی چور نہیں
ہر گھٹ وِچ آپ سمایا ہے
ٹُک[4] بُوجھ کون چھُپ آیا ہے

---

[1] کھوج [2] جان لیا [3] دھگڑا = خاوند۔ اَب مجھے پہلے خاوند (نفس) سے نجات مِل گئی ہے۔ لیکن مجھے نفرت اَور دشمنی سے مبرا کِس نے کیا؟ اس کا جواب اگلی سطر میں دیا گیا ہے کہ وُہ شوہر ہر جگہ موجود ہے، اور اس کے ہوتے ہُوئے کوئی غیر نظر نہیں آتا۔ [4] ذرا۔

اِس کیفیت کو پا کر بلھے شاہ مجسّم خلوص و شفقت اور مساوی النظر بن گیا۔ دوست دشمن، بڑے بھلے، ہندو مسلم غرضیکہ سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگا۔ آپ کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کی اِس حالت پر بڑے خوبصورت طریق سے روشنی ڈالتا ہے۔

کہتے ہیں[1] "ایک دفعہ آپ اپنے حُجرہ میں بیٹھے خدا کی بندگی میں مشغول تھے۔ رمضان[2] کا مہینہ تھا۔ آپ کے کچھ مرید حُجرہ کے باہر بیٹھے گاجریں کھا رہے تھے۔ قریب سے چند روزہ دار مسلمان گزر رہے تھے۔ ایک فقیر کے تکیئے پر مومنوں کو روزہ توڑتے دیکھ کر غضبناک ہو کر بولے "تمہیں شرم نہیں آتی، رمضان کے مہینے میں چر رہے ہو، وہ بھی ایک فقیر کے تکیئے پر"۔ مریدوں نے کہا" بھائی مومنو! اپنی راہ لو، ہمیں بھوک لگی ہے تبھی تو کھا رہے ہیں"۔

مومنوں کو شک ہوا کہ شاید یہ مسلمان نہیں۔ انہوں نے پوچھا "ارے تم کون ہو؟" انہوں نے کہا "مسلمان ہیں! کیا مسلمانوں کو بھوک نہیں لگتی"؟ مومنوں نے پھر تنبیہہ کی لیکن مُرید باز نہ آئے۔ مومن جو گھوڑوں پر سوار تھے نیچے اُتر آئے۔ مریدوں کے ہاتھوں سے گاجریں چھین کر دور پھینک دیں اور انہیں تھپڑ بھی مارے۔ واپس جانے لگے تو انہیں خیال آیا کہ اِن کا پیر بھی شاید ایسا ہی ہوگا۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوں گے۔ پھر خیال آیا کہ اُس کو جا کر پوچھیں تو سہی کہ اپنے مریدوں کو کیسی عقل دی ہے؟ حُجرہ میں جا کر بولے "ارے تو کون ہے"؟ آپ آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ آپ نے بازو اونچے کرکے ہاتھ ہلا دیئے۔ انہوں نے پھر پوچھا "ارے بولتا کیوں نہیں، کون ہوتا ہے"؟ آپ نے پھر بازو اونچے کرکے ہاتھ ہلا دیئے۔ مومن آپ کو دیوانہ سمجھ کر چلے گئے۔ اُن کے جانے کی دیر تھی کہ مرید دُہائی دیتے ہوئے حُجرہ میں داخل ہوئے اور شکایت کی کہ انہوں نے ہمیں مارا ہے۔

---

[1] پنجابی ساہت دا اتہاس (مدھ کال)، بھاشا دبھاگ، پٹیالہ ۱۹۶۳ء، صوفی مت، صفحہ ۶۴۔
[2] وہ مہینہ جس میں اہلِ اسلام روزے رکھتے ہیں۔

بُلّھا:۔ تُم لوگوں نے ضرور کوئی قصور کِیا ہو گا؟
مُرید:۔ نہیں حضور! ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔
بُلّھا:۔ اُنہوں نے تُم سے کیا پُوچھا تھا؟
مُرید:۔ تُم کون ہوتے ہو۔؟ ہم نے کہا "ہم مسلمان ہیں"۔
بُلّھا:۔ بس بچّو! کچھ بنے ہو تو مار کھائی ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں بنے، ہمیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

وُہی اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے جو نفس اور مادیت کے دائرے میں قید ہے۔ جس کو حق کا دیدار ہو جاتا ہے وُہ اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل بن جاتا ہے۔ وُہ مذہبوں مُلکوں اور ذاتوں پاتوں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں جگہ جگہ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ خُدا کی طرح رُوح کا نہ کوئی مذہب ہے، نہ مُلک نہ ذات پات۔ سب مذہب وقت اور مقام کے قیدی ہیں، لیکن رُوح ازلی اور ابدی ہے۔ اِس کا نہ کوئی اوّل ہے نہ آخر، نہ کوئی مذہب ہے نہ مِلّت۔ آپ کہتے ہیں کہ میں صرف رُوح کا خُدا کے ساتھ ازل سے چلا آرہا رِشتہ ہی پہچانتا ہُوں۔ دُنیا میں رائج کوئی دُوسری تقسیم منظور نہیں کرتا ؎

اوّل آخر آپ نُوں جاناں، نہ کوئی دُوجا ہور پچھاناں
مَیتھوں ہور نہ کوئی سیانا، بُلّھا شوہ کھڑا ہے کون
بُلّھا کی جاناں مَیں کون*۔

---

* اسی موضوع پر شمس تبریز فرماتے ہیں:۔ "میں پرانا عاشق ہُوں۔ جب دُنیا نہ تھی تو میں تھا۔ جب آدم نہ تھا، تو میں تھا۔ جب حوّا نہ تھی، تو میں تھا۔ میں پرانا عاشق ہُوں...... میرے سامنے مَولا کیا چیز ہے؟ میں پرانا عاشق ہُوں۔ ؎

مَن عاشق دیرینہ ام۔ مَن عاشق دیرینہ ام
عالم نہ بُود و مَن بُدم۔ آدم نہ بُود و مَن بُدم
حوّا نہ بُود و مَن بُدم۔ مَن عاشق دیرینہ ام
مَولا چہ باشد پیشِ مَن۔ مَن عاشق دیرینہ ام

(باقی اگلے صفحہ پر)

حقیقت کو حاصل کر کے بلھے شاہ نہ صرف مجسم حقیقت بن گیا، بلکہ اُس نے باقیماندہ زندگی بھی اِسی حقیقت کی تبلیغ میں لگا دی۔ اِس فانی دُنیا سے کُوچ کرنے تک آپ خود خدا کی بندگی میں مجذوب رہے، اَور آپکی صحبت و قربت میں آنے والے انسان بھی آپ سے عشقِ الہٰی کا سبق لیتے رہے۔ آپ کی پُر نُور شخصیت، پاکیزہ زندگی اَور الہٰی کلام کی بدولت آپ کی شُہرت دُور دُور تک پھیل گئی، اَور بے شمار مُتلاشیانِ حق آپ کی شخصیت سے فیضیاب ہُوئے۔ زندگی کے آخری برسوں میں آپ نے اپنا ڈیرہ قصُور میں منتقل کر لیا تھا، اَور پھر یہیں ۵۹-۱۷۵۸ء میں آپ نے قالبِ خاکی سے نجات پائی۔ آپ کا روضہ آج تک قصُور میں قائم ہے۔

سائیں بُلھے شاہ اَیسے خُدا رسیدہ درویش، فقیرِ کامل اَور عاشقِ حقیقی تھے جنہوں نے مُرشد کے عشق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے عشق کی مَنزل طے کی۔ آپ کے عشق میں شدت سوز اَور تڑپ کے ساتھ ساتھ صدقدلی، قربانی اَور اعلیٰ ترک کا جذبہ نمایاں تھا۔ آپ نے اپنی اُونچی ذات اَور علمیت عشق کی دہلیز پر نذر کر دی، اَور ہجر کی آگ میں تپتے ہُوئے بھی مُرشد میں اپنے اعتقاد کو لمحہ بھر کے لئے ڈگمگانے نہ دیا۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کی طرح آپ کا کلام عشقِ مجازی کا زینہ لے کر عشقِ حقیقی کے رُتبہ کو پانے کی راہ دکھاتا ہے، جو دُنیا کے تمام خُدا پرستوں کا مشترکہ راستہ ہے۔ اِس میں مذہب، ملک، رنگ اَور نسل کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ راستہ وقت اَور مقام کی قید سے آزاد ہے۔ جِس کِسی نے جب کبھی حق یا خُداوندِ کریم کے ساتھ وِصال کیا ہے، اِسی راستہ کے ذریعے کیا ہے۔ اَور جو کوئی جب کبھی اس کے ساتھ وِصال کرے گا، راہِ عشق کا راہی بن کر ہی کرے گا۔ آپ کے سوانحِ حیات اَور آپ کا کلام اِسی راستہ کی بے شمار لطیف رُموز سے بھر پُور ہیں۔ یہ حقیقی عاشق کے عشق کو اُستوار بھی کرتے ہیں اَور اس کو اِس راہ پر چلنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ آپ کی شخصیت اَور آپ کا کلام صدیوں تک حقیقی عاشقوں کے لئے معرفت کی تجلّی کے مینار کا کام کرتے رہیں گے۔

(بقیہ ... فٹ نوٹ صفحہ ۲۴ سے آگے)

یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں 'مولا' سے شمس تبریز کی مُراد نفس سے ہے جس کو دُنیا نے اپنا مالک بنا رکھا ہے۔

رُوحانی تعلیم

اِنسانی زندگی کا مقصد

تصوّف یا صُوفی تعلیم اُس عملی رُوحانی شغل کا نام ہے جس کے ذریعے خُدا کے عاشق اپنے نفس یا خودی کو فنا کر کے، اللہ تعالیٰ سے وصال کر کے لقا حاصل کرتے ہیں۔ صُوفی[1]، وَلی اللہ، درویش اَور فقیر اُن مُسلمان عابدوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے ترکِ خُودی اَور رُوحانی شغل کے ذریعہ اپنے باطن میں معرفت یعنی عرفانِ حق حاصل کیا ہے۔

یہ عارف باللہ اِنسانی زندگی اَور اس کے مسائل کو ایک مخصُوص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ اِنسان نفس، حواس اَور عقل و خرد کے دائرے سے اُوپر اُٹھ کر ایک ایسی خالص رُوحانی کیفیت میں پہنچ جاتا ہے جس میں اُسے دُنیا میں نظر آرہی فانی کثرت کے پردے میں نہاں ایک لافانی، مُحیط[2] کُل وحدت کا عِلم ہو جاتا ہے۔ اِس بے مثال تجربے کے ذریعے رُوح وقت اَور مُقام کی بندشوں اَور ان سے پیدا ہُوئے طرح طرح کے عذابوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اِنسان کو کثافت سے اُوپر اُٹھا کر لطافت میں داخل ہونے میں مدد دینا، کثرت[3] سے وحدت[4]، تغیّر[5] سے ثبات[6]، غیر تکمیل[7] سے تکمیل[8] اَور مُسلسل عذاب[9] سے جاودانی[10] راحت کی ابدی کیفیت[11] میں پہنچانا سچی رُوحانیت، تصوّف[12] یا صُوفی تعلیم کا نصب العین ہے۔ سائیں بُلھے شاہ کا کلام اِنسان کی اِس لگاتار کوشش کی ایک مضبُوط کڑی ہے۔

---

[1] History of Sufism in India, vol. 1, p. 1.

[2] ہمہ جائی: سب جگہ موجود۔ [3] بہتات [4] ایکائی [5] تبدیلی [6] پائداری [7] اُدھورا پن۔ [8] پُورا کرنا۔ [9] لگاتار دُکھ [10] دائمی سُکھ [11] دائمی حالت۔ [12] وُہ علم جس کے ذریعے خدا سے وصال کا تجربہ حاصل ہو۔

سچّی رُوحانیت کی دُوسری مُسلّمہ بات یہ ہے کہ نفس اور حواس رُوح کے کارگر ہونے کے وسیلے ہیں۔ اُن کے ذریعے عمل پذیر ہونے والی رُوح خود اِن سے الگ اور آزاد ہے۔ رُوح کی ہستی نہ تو جِسم، نفس اور حواس پر مُنحصر ہے، اور نہ ہی یہ رُوح کی ذاتی یا بُنیادی فطرت کو بدل سکتے ہیں۔ قرآن مجید (۱۷:۸۵) کے مُطابق رُوح ذاتِ الٰہی کا جُزو ہے: "اَلرّوحُ مِنْ اَمرِ ربّی"۔ اِس میں ذاتِ الٰہی کی سب صِفات موجُود ہیں۔ نفس اور مادّیت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے رُوح کے سب جوہر دب چکے ہیں۔ کثافت کے اِن پردوں کو چاک کرنے پر رُوح اپنی الٰہی صِفات دوبارہ ظاہر کرسکتی ہے۔ سائیں بُلّھے شاہ مادّی دُنیا میں اپنے آپ کو مادّہ سمجھنے والی، جِسم اور حواس کا ساتھ لے کر خود کو جِسم اور حواس تصوّر کرنے والی رُوح کو اُس کی اصل ذات کی یاد دلاتے ہیں۔ آپ سمجھاتے ہیں کہ اے رُوح! تُو ذاتِ الٰہی کی طرح لاانتہا، منوّر[1] غیر منقسم[2] ذی ہوش اور مسرور[3] بالذات ہے۔ نفس اور حواس سے لاتعلق ہو کر اپنی اصل ذات کو پہچان ؎

۱۔ بُلّھا شاہ سنبھال توں آپ تائیں
تُوں تاں اننت لگ دیہہ میں کہاں سووّیں

۲۔ بُلّھا شاہ سنبھال جب آپ دیکھا
سدا سوہنگ[4] پرکاش ہوئے جھلدا ایں

۳۔ سُکھ رُوپ اکھنڈ چیتن ہیں تُوں
بُلّھا شاہ پُکار دے وید چارے

---

[1] روشن۔ [2] جو تقسیم نہ ہوسکے۔ [3] ہوش والا۔ [3] اپنے آپ میں یعنی سُرور میں ڈوبا ہوا۔

[4] سوہنگ:۔ میں وُہی ہوں: رُوح اور ذاتِ الٰہی کا اصل ایک ہے۔ منصُور کا نعرہ اناالحق (میں خدا ہوں) اور سوہنگ یعنی اناہُو (میں وُہی ہوں) کا ایک ہی مطلب ہے۔ یہ اشارہ جِسم اور نفس سے آزاد ہوچکی خالص رُوح کی طرف ہے، جسم میں قید رُوح کی جانب نہیں۔

۴۔ بلھا شاہ سنبھال توں آپ تائیں،
توں نال سدا انند ہیں جانا ایں

سائیں بلھے شاہ نے انسان کے روبرو اس کی اصل ذات کا سوال پیش کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اے انسان! تو غور سے سوچ کہ تو کہاں سے آیا ہے اور تجھے کہاں جانا ہے؟

کدھروں آیا؟ کدھر جانا؟
اپنا دس[۱] ٹکانا

جسم یا وجود روح کے سہارے قائم ہے۔ روح لافانی اور ازلی ہے۔ یہ زندگی اور موت سے بالاتر ہے۔ یہ مذہبوں، ملکوں اور قوموں کی بندش سے آزاد ہے۔ یہ نیکی بدی، خوشی غمی، دوست دشمن وغیرہ ہر طرح کی تکرار سے بالاتر ہے۔ یہ پانچ عناصر کی پیدائش نہیں، بلکہ لطیف، ذی[۲] شعور اور پرنور ہے۔ روح آفرینش سے پہلے بھی تھی اور اس کی ہستی قیامت کے بعد بھی قائم رہے گی ۔

بلھا کی جاناں میں کون؟

نہ میں مومن وچ مسیتاں، نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں، نہ میں موسیٰ نہ فرعون
نہ میں اندر بید کتاباں، نہ وچ بھنگاں نہ شراباں
نہ وچ رنداں مست خراباں، نہ وچ جاگن نہ وچ سون
نہ وچ شادی نہ غمناکی، نہ میں وچ پلیتی[۳] پاکی[۴]
نہ میں آبی نہ میں خاکی، نہ میں آتش نہ میں پون[۵]

---

[۱] ہمیشہ رہنے والی۔ [۲] خود آگاہ [۳] کثافت [۴] لطافت [۵] میں پانی، مٹی، آگ، ہوا، یعنی عناصر کی پیداوار نہیں۔

نہ مَیں عربی نہ لاہوری، نہ مَیں ہندی شہر نگوری
نہ ہندو نہ تُرک پشوری، نہ مَیں رہندا وِچ ندون
نہ مَیں بھید مذہب دا پایا، نہ مَیں آدمؑ حوّا جایا
نہ مَیں اپنا نام دھرایا، نہ وِچ[1] بیٹھن نہ وِچ بھون
اوّل آخر آپ نوں جاناں، نہ کوئی دُوجا ہور پچھاناں
میتھوں ہور نہ کوئی سیانا، بُلھا شوہ کھڑا ہے کون

نفس اور حواس سے بندھی رُوح کئی قسم کی قیدوں اور حد بندیوں میں جکڑی ہوئی ہے، لیکن اس میں بندھن توڑ کر پھر سے آزاد ہونے کی قوّت موجود ہے ؎

مَیں بے قید مَیں بے قید، نہ روگی نہ وید
نہ مَیں مومن نہ مَیں کافر، نہ مُلّاں نہ سید
چودھیں طبقیں سیر اساڈا، کِتے نہ ہُندا قید

اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رُوح اِس عالمِ آب و گِل[2] میں اِنسان کے قالب میں رُونما ہوئی ہے، لیکن اس کا منبع مقامِ بالا[3] اور حقیقتِ اعلیٰ[4] ہے۔ اِس میں واپس اپنے اصل مقام پر پہنچنے اور اُس حقیقت میں سما کر اس کا جُزو بن جانے کی صلاحیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ ؎

۱۔ توں اوہں مقاموں آیا ہیں، ایتھے آدم بن کے آیا ہیں
۲۔ بُلھا شاہ وِدیک[5] وِچار کیتی، خودی چھوڑ خود ہوئے خصم سائیں
۳۔ خودی[6] کھوئی اپنا پد لینا، تب ہوئی گل خیر

---

[1] رُوح نہ تو بے جان ہے کہ حرکت ہی نہ کر سکے اور نہ ہی اِس کی قدرتی فطرت جسم مَرن قبول کرتی ہے۔ [2] مٹی اور پانی کا جہان یعنی مادّی دُنیا [3] مقامِ حق [4] خدا [5] پاک عقل جو نفس اور حواس کے اثر سے آزاد ہو۔ [6] خودی چھوڑ کر اپنی اصل ذات کی پہچان کی۔

سائیں بلھے شاہ

انجیل میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا ہے[1]۔ بلاشبہ انسان پانچ عناصر کے وجود کے باعث نہیں، بلکہ اس میں رکھے ہوئے رُوح کے نُور کی بدولت ہی خُدا کا ہمشکل ہے۔ اِس حقیقت کو ظاہر کرنا ہی انسان کا سچا نصبُ العین ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نفس اور مادیّت کے اِس مُلک میں آ کر رُوح اپنی اصل حقیقت اور اصل مقام کو بھُول چکی ہے۔ یہ اِس سچائی سے بے خبر ہے کہ اس کی ہستی کی اصل بنیاد قادرِ مُطلق[2] ہمہ دان[3]، سرورِ مجسّم[4] اللہ تعالیٰ ہے۔ جِس انسان کو اپنی اصلیت کا علم نہ ہو، اپنے دائمی سرچشمہ کا پتہ نہ ہو اور جو اپنے اصل مقام کو بھُول کر غیر مُلک میں ٹھوکریں کھا رہا ہو، وُہ امن و سکون کی اُمید کیونکر کر سکتا ہے؟

سائیں جی اپنی کافی "اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں" میں رُوح کو غافل، بے سمجھ، سوئی ہُوئی، نیند میں غلطاں اور خراٹے بھرتی کہتے ہیں۔ آپ اِس کو مغرُور، جوانی کے نشے میں چُور، حُسن پہ نازاں، سہیلیوں میں محو، فضول باتوں میں مصروف، بے سلیقہ اور بے حیا کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ رُوح کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ مُلک تیرا اپنا نہیں ہے، تیرا مُلک بہت دُور ہے۔ راہ میں جنگل و بیابان ہیں۔ جب تجھے اکیلے یہ سفر طے کرنا پڑے گا، کوئی ہمدم و ہمسفر، یار و مددگار تیرے ساتھ نہ ہوگا، تو اس حالت میں کون تیری مدد کون کریگا؟ جب یہاں سکندر جیسے شہنشاہ، سلیمان جیسے دانا، بڑے بڑے پیر و پیغمبر نہ ٹھہر سکے، تو کیسے یہاں ہمیشہ رہ سکتی ہے؟ یہاں یُوسفؑ زلیخا نہ رہے، چمبیلی، لالہ، سوسن اور سنبل نہ رہے۔ (ایتھے کوئی پائدار نہیں)۔ یہاں اکٹھی کرنے کے لائق ایک ہی شئے ہے۔ وُہ ہے مالکِ کُل کا عشق اور اس کا پاک کلمہ، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصال کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] God created man in his own image ; (Genesis 1 : 26-27)

[2] جس کی طاقت ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ [3] سب کچھ جاننے والا۔ [4] سُرور میں ڈوبا ہُوا۔

بُلھے شاہ اپنی کافی "کر کتن وَل دھیان کُڑے" میں دُنیاوی رُجحان والی رُوح کو مغرور، گنوار، گھمنڈی، بے خبر، پاگل، دیوانی وغیرہ کئی ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ آپ رُوح کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ اگر تُو دُنیا میں وُہ کام نہیں کرے گی جس کے ذریعے تو محبُوب کے ساتھ وصال کے قابل بن سکے، تو تُو یہاں سے خالی ہاتھ چلی جائے گی۔ اس کے برعکس "کت نہ کُڑے نہ وَت کُڑے" والی کافی میں آپ سمجھاتے ہیں "جے پُونی پُونی کتیں گی، تاں ننگی مُول نہ وتیں گی۔ جے داج وِہُونی جاویں گی، تاں شوہ نُوں کویں رِجھاویں گی"؟ یعنی اگر تُو خُدا کے عشق کا سُوت تھوڑا تھوڑا کر کے بھی کاتے گی، تو تُو ہرگز تہی دامن نہ جائے گی۔ اگر تُو عشق کے توشہ کے بغیر اس عالمِ فانی سے لوٹ جائے گی، تو پھر اپنے محبُوب (خُدا) کو کیسے خوش کر سکے گی؟ تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟ آپ فرماتے ہیں ؎

جے داج وِہُونی جاویں گی، تاں کِسے مُول نہ بھاویں گی
اوتھے شوہ نُوں کویں رِجھاویں گی، کُجھ نے فقراں دی مَت کُڑے
بُلھا شوہ گھر اپنے آوے، چُوڑا بِیڑا سبھ سُہاوے
گُن ہوسی تاں گل لاوے، نہیں روسیں نَینیں رَت کُڑے

بابا فرید نے نادان انسان کو دریا کے کنارے کھیل میں مشغُول بگلے سے تشبیہہ دی ہے جو دُنیا کی اصلیت سے بے خبر اور اپنی موت سے غافل ہے ؎

فریدا دَریاوے کنّھے بگلا بیٹھا کیل کرے
کیل کریندے ہنجھ نُوں اَچنتے باج پئے
باج پئے تِس رَب دے کیلاں وِسریاں
جو مَن چِت نہ چیتے سَن سو گالی رَب کیاں

(آدگرنتھ صفحہ ۱۳۸۳)

آپ فرماتے ہیں کہ دُنیا میں دو قسم کے انسان ہیں ایک ہوشیار، دُوسرے غافل۔ باہوش انسان دُنیا کی اصلیت کو سمجھتے ہُوئے ایسا راستہ اپناتے ہیں کہ دین اور دُنیا دونوں سنوار لیتے ہیں لیکن لاپروا، نفس پرست لوگ ایسے جاہلانہ اعمال کر بیٹھتے ہیں، جن سے کہ وُہ دُنیا اور

عاقبت دونوں تباہ کر لیتے ہیں۔

فریدا موتے دا اینا ایوَے دِسّے جیوَ دریاوَے ڈھاہا
اگّے دوجک تپیا سُنیئے ہُول پوَے کاہاہا
اِکناں نوں سبھ سوجھی آئی اِک پھردے وے پرواہا
عمل جے کیتیا دُنی وِچ سے درگہہ اوگاہا

(آدگرنتھ صفحہ ۱۳۸۳)

مشہور صوفی خلیفہ عبدالملک رُوح کو آگاہ کرتے ہُوئے فرماتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک پُل کی مانند ہے۔ جس کو دُوسرے پار جانے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے، گھر بنانے کے لئے نہیں۔ ؎

گورو نانک صاحب اور گورُو صاحبان کا تمام کلام اِنسان کی اِس حالتِ نازک کی نقش آرائی کرتا ہے۔ وہ لاعلمی کی وجہ سے جھُوٹ کو سچ اور سچ کو جھُوٹ سمجھ رہا ہے۔

گورُو تیغ بہادر نادان اِنسان کو پاگل (بَورا)، ناسمجھ (اچیت)، گنوار، بھولا ہُوا، بے عقل (کُمتی)، بے حیا (نلج)، اندھا (اندھ) اور انجان (اجان) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اور اس کو ہوشیار اور سمجھدار (چتر سُجان) بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اِنسان کی تمام مصیبتوں کا سبب یہ ہے کہ وُہ اپنانے لائق شَے سے بے خبر ہے اور ترک کی جانے والی اشیائ کے پیچھے بے تحاشا بھاگ رہا ہے ؎

مائیا کارن دھاوہی مُورکھ لوگ اجان
کہو نانک بِن ہر بھجن برتھا جنم سِران

(محلہ ۹، صفحہ ۱۴۲۷)

مولانا رُوم بھی اِسی موضوع پر اِس دُنیا کی ناپائداری کا نقشہ اِس طرح کھینچتے ہیں۔

؎ Encyclopaedia of Islam, (New Edition) Vol. III p. 374 : History of Sufism in India, Vol. I, p. 27.

راحتِ بے رنج در ماتم سرائے خاک نیست ۔ خندۂ گُل گریہ ہائے تلخ دارد چوں گُلاب

یہ خاکی دُنیا ایک ماتم سرائے ہے۔ جس میں خوشی بغیر غم کی الائش کے میسر نہیں ہوتی پھول کے کھِلنے میں ایک رونے کی کڑواہٹ پنہاں ہے۔ جیسے کہ گلاب میں۔

سائیں بُلھے شاہ مادی دُنیا کو کُسمبھڑے کا باغ کہتے ہیں۔ کُسمبھے کے پھُول جتنے چمکیلے بھڑکیلے اور دلکش ہوتے ہیں اُتنے ہی ناپائیدار اور دُکھ دینے والے ہیں۔ کُسمبھے کے پھُولوں کے خوبصورت رنگ کے سبب اس کے باریک کانٹے بھی بھلے لگتے ہیں، لیکن اُن کا ڈنک[1] جان لیوا ہوتا ہے۔ (کسمبھڑے دے کنڈے بھلیرے اَڑ اَڑ چُنری پاڑی) نادان آدمی کُسمبھے کے کانٹے یعنی دُنیاوی اشیأ اکھٹی کرتا رہتا ہے، جبکہ وُہ بخُوبی جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز کسی کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ "(نی میں کُسمبھڑا چُن چُن ہاری) یعنی انسان ازل سے مادیت پر قابُو پانے کی ناکام کوششوں میں پریشان رہا ہے۔ اس کی نجات کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وُہ کسی ایسے عارف یا واقفکار کی صحبت میں جائے، جو اُس کی انگلی پکڑ کر اُسے دُنیا کے کانٹوں بھرے جنگل سے باہر لے جائے۔

مَیں کمینی کُچّجی کو جھی بے گُن کون وچاری
بُلھا شوہ دے لائق ناہیں شاہ عنایت تاری
مَیں کُسمبھڑا چُن چُن ہاری

بابا شیخ فرید نے بھی اِس دُنیا کو کُسمبھڑا[1]، شورہ ملے پانی کا تالاب (کلر کیری چھپڑی)، باجرے (کودھرے) کا کھیت، پوشیدہ آگ (گُجھی اگ)، شکر میں لپٹی زہر کو نپلیں (دیکھ بھریاں گندلاں دھریاں کھنڈ لواڑ) دُکھوں کی آگ کا گھر وغیرہ کہہ کر انسان کو خبردار کیا ہے، کہ اس میں دائمی آرام اور چین کی اُمید رکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ فانی اشیاء کی کشمش میں پھنس کر زندگی کے نصب العین کو کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دُنیا کے عیش و آرام ظاہراً شکر کی مانند میٹھے ہیں، لیکن ان کا اثر زہریلا ہے۔ اِن سے پیدا ہونے والی مُصیبتوں کا علم انسان کو اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی چارہ جوئی

---

[1] ہتھ نہ لائیں کسمبھڑے جل جاسی ڈھولا۔ شیخ فرید

نہیں ہو سکتی ؎

دیکھ فریدا جے تھیا سکّر ہوئی وِس
سائیں باجھوں آپنے ویدن کہیئے کِس

(آدگرنتھ : صفحہ ۱۳۷۸)

سائیں بُلھے شاہ انسان کو دُنیا اور انسانی وجُود دونوں کی اصلیت سے آگاہ کرتے ہیں، کہ جو کُچھ بھی نظر آرہا ہے وُہ مِٹّی کی چار دِن کی گُلزار ہے۔ دُنیا میں کسی کو ثبات حاصل نہیں۔ یہ جسم خاک کا پُتلا ہے، جِس نے ایک دِن گِر جانا ہے۔ جِسم اور دُنیا کی اس پہیلی کو سمجھ لینے پر ہی انسان اِن کے بندھن توڑ کر اپنے اصل مقام پر واپس جا سکتا ہے۔

واہ واہ ماٹی دی گُلزار
ماٹی گھوڑا، ماٹی جوڑا، ماٹی دا اسوار
ماٹی ماٹی نوں دوڑاوے، ماٹی دی کھڑکار
ماٹی ماٹی نوں مارن لگی، ماٹی دے ہتھیار

"خاکی خاک سیئوں رَل جانا۔ توں کدے تاں ہوسیانا" اور" رین گئی لٹکے سبھ تارے" وغیرہ بہت سی کافیوں میں آپ نے دُنیا اور اِس کے رشتے ناطوں کی اصلیت واضح کی ہے۔ آپ نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ یہ اشیا ناپائدار اور فنا ہونے والی ہیں۔ اِن میں سے کوئی شئے وقتِ آخر ساتھ نہیں دیتی۔ بُنیادی چیز رب کا عشق اور مُرشد کے حکم کی تعمیل ہے، کیونکہ اِن کی مدد سے ہم اپنے دُنیاوی بندھن توڑ کر واپس اپنی اصل ذات (خدا) میں سما سکتے ہیں۔ آپ قُرآن شریف کی آیات کے حوالہ جات کی رُو سے سمجھاتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اِس میں خُدا نے اپنا نُور رکھا ہُوا ہے۔ اِس کو دُنیا میں سیپیاں اور گھونگے اکٹھے کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے آپ کو پہچاننے کیلئے بھیجا گیا ہے: ؎

نہیں نہ جنتی حال بنایا، اشرف اِنسان بنایا

مطلب :- تمہیں واپس جنت پہنچنے کے واسطے نہیں بنایا گیا بلکہ اس سے افضل درجہ عطا

فرمایا گیا ہے:-

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا یاد کرائیو. لَااِلٰہَ دا پردہ لاہیو

مطلب:- اے انسان ذرا غور کر کہ تجھے کس قدر بلند رُتبہ سے نوازا ہے۔ تو صرف مجھے ہی اپنے پیار اور عبادت کے قابل سمجھ۔

سائیں جی انسانی قالب کو اُس بیش قیمت چرخے سے تشبیہہ دیتے ہیں، جس پر مالکِ کُل کے عشق اور عبادت کا سوت کاتا جا سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ناسمجھ انسان اِس چرخے کو مالِ مُفت سمجھ کر اس کا صحیح اور جائز استعمال نہیں کرتا۔ وُہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ یہ چرخہ اس کے پچھلے جنموں کے عُمدہ اعمال کے عوض مِلا ہے۔ لاعلمی کے باعث اِنسان عبادت کی بجائے اس پر خودی کا سوت کاتتا ہے، اور انسانی جامہ سے فائدہ اُٹھانے کا سُنہری موقع فضول برباد کر لیتا ہے۔ ؎

کر کتّن[1] ول دھیان کُڑے[2]
چرخہ[3] مُفت تیرے ہتھ آیا، پلیوں[4] نہیں کجھ کھول گوایا
نہئیوں[5] قدر محنت دا پایا۔ جد ہویا کم آسان کُڑے

آپ فرماتے ہیں کہ دُنیا آواگون کی سرائے ہے۔ پہلے آئے لوگ یہاں نہیں رہے اور آئندہ آنے والے بھی یہاں نہیں رہیں گے۔ ؎

۱۔ آواگون سرائیں ڈیرے، ساتھ تیار مُسافر تیرے
تیں نہ سُنیا کُوچ نگارے، اب تو جاگ مسافر پیارے

۲۔ اِک جمدے اِک مر مر جاندے ایہو آواگون

۳۔ پانی بھر بھر گئیاں سبھو آپو اپنی واری
اِک بھر گئیاں اک بھر چلیاں۔ اِک کھلیاں بانہہ[6] پساری

---

[1] کتن کی تشبیہہ سے یہاں مُراد عبادت سے ہے [2] کُڑئے: اے لڑکی۔
[3] انسانی جسم کو چرخہ کہا ہے۔ [4] اپنے پلّے سے [5] نہیں [6] بانہہ پساری: بازو پھیلا کر۔

مولانا روم فرماتے ہیں، کہ کئی بار میں گھاس اور سبزہ کی شکل میں پیدا ہوا ہوں اور چوراسی قالبوں میں سے گزرا ہوں۔

بارہا مثلِ گیاہ روئیدہ ام ہفت دو ہفتاد قالب دیدہ ام

حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں کہ کائنات کے کارخانے میں لاکھوں بار آنے جانے کا دستور بنا ہوا ہے۔

صد ہزاراں بار آمدیم رفتیم ایں جائے باز

زاں کہ ہست ایں کارخانہ آمدن رفتن بساز

گورو ارجن دیوجی سمجھاتے ہیں کہ کیڑے، پتنگے، ہاتھی، مچھلی، ہرن، پرندے، سانپ، درخت اور گھوڑے وغیرہ کی ادنےٰ درجہ کی جنسوں میں سے ہو کر انسانی وجود نصیب ہوتا ہے، تاکہ خدا کی بندگی کر کے اس کے ساتھ وصال کیا جاسکے۔ جو انسان اس قالب کا صحیح استعمال نہیں کرتا، وہ پھر آواگون کے دُکھ بھرے چکر میں پھنس جاتا ہے ؎

کئی جنم بھئے کیٹ پتنگا ۔ کئی جنم گج مین کُرنگا

کئی جنم پنکھی سرپ ہوئیو ۔ کئی جنم ہیور برکھ جوئیو

مل جگدیس ملن کی بریا۔ چرنکال ایہہ دیہہ سنجریا (محلہ ۵۔ صفحہ ۱۷۶)

صوفی درویش سرمد کہتا ہے:۔

در دائرۂ تجربہ پابند شدم

میں اپنے اعمال کے چکر (آواگون) میں قید ہوں۔ کبیر صاحب نے بھی فرمایا ہے:۔

پردھن پرتن پرتری نندا پراپباد نہ چھوٹے

آواگون ہوت ہے پھُن پھُن ایہو پرسنگ نہ ٹوٹے (آدگرنتھ صفحہ ۱۹۰)

مطلب:۔ پرائی دولت، پرایا جسم، پرائی عورت، دوسروں کی نقص بینی اور لوگوں سے جھگڑا، انسان کو بار بار آواگون کے چکر میں باندھے رکھتے ہیں۔

سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ دُنیا سرائے کی مانند ہے، جہاں فقط ایک رات کا قیام ہے۔ یہ پاؤں پھیلا کر سونے کی جگہ نہیں۔ ؎

لے مُراد چوراسی لاکھ قالبوں سے ہے۔

اک رات سِراں دا رہناں لے۱، ایتھے آ کر ہُل نہ بہناں اے
کل سَب دا کُوچ نقارا اے، تیں کِت وَل پاؤں پسارا اے[۲]

دانشمند انسان زِندگی اور دُنیا کی اصلیت کو سمجھتا ہُوا عاقبت کو ہمیشہ مَدِ نظر رکھتا ہے وُہ اِس دُنیا سے نیک اعمال اور خُدا کی عبادت کا توشہ تیار کر کے لے جاتا ہے، کیونکہ موت کے بعد کام آنے والی صرف یہی ایک شئے ہے ؎

پِل دا واسا وَسَن ایتھے رہن نُوں آگے ڈیرا اے
نے نے تحفے گھر نُوں گھلیں ایہو ویلا تیرا اے
او تھنے ہتھ نہ لگدا کُجھ وی ایتھوں ہی تے جاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں کد تک حُکم چلاویں گا؟

مہا بھارت میں ذکر آتا ہے:۔ یکش نے یُدھشٹر سے پُوچھا کہ دُنیا میں سب سے حیرت انگیز بات کیا ہے؟ یُدھشٹر نے جواب دیا کہ دُنیا کی سب سے عجیب بات یہ ہے کہ لوگ ہر روز دُوسروں کو مرتا دیکھتے ہیں، لیکن ہر ایک اِسی مغالطہ کا شکار رہتا ہے کہ شاید میں کبھی نہیں مَروں گا۔ شیخ فرید فرماتے ہیں کہ اگر دُنیا میں کوئی ہمیشہ رہ سکتا، تو ہم سے پہلے آئے ہُوئے لوگ یہ دُنیا چھوڑ کر کبھی نہ جاتے ؎

فریدا کِتھے تیڈے ماپیاں جِنی تُوں جنیوہ
تے پاسہو اوے لد گئے تُوں اَجے نہ پتینوہ (آدگرنتھ صفحہ ۱۳۸۱)

انسان کی زندگی بر لبِ دریا کھڑے ہُوئے درخت کی مانند ہے۔ جس کی ہستی غیر یقینی ہے۔ یہ کچے گھڑے کی مانند ہے جِس میں سانسوں کا پانی بہت دیر تک نہیں رہ سکتا۔ انسانی زِندگی ایسی گُدڑی (خرقہ) ہے جس میں کوئی پیوند نہیں لگ سکتا۔ ؎

کندھی اُتے رُکھڑا کچرک بنھے دِھیر
فریدا کچے بھانڈے رکھیئے کچرتائی نیر (آدگرنتھ صفحہ ۱۳۸۲)

---

۱ مسافرخانہ۔ ۲ کس طرف۔

نادان انسان دُنیا میں رائج عمل اور ثمر کے اٹل اصُول کو نہیں سمجھتا۔ وُہ چاہتا ہے کہ عمل بھی اپنی مرضی کے مطابق کرے اور پھل بھی اپنی حسب منشا پائے۔ یہ ناممکن ہے، کیونکہ کام کرنے کی آزادی پھل پانے کے بندھن کو جنم دیتی ہے۔ سائیں بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ دنیاوی مُعاشرت کا اصُول ہے" جیسی کرنی ویسی بھرنی" یعنی اپنے کئے ہُوئے اعمال کا پھل خود بھوگنا پڑتا ہے۔ جو بُرے اعمال کرے گا اُسے اس کا خمیازہ بھُگتنا پڑے گا۔

۱۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی پرم نگر ورتارا اے

۲۔ رنگ برنگے سُول اپیٹھے چمبڑجاون مینوں

ایتھوں دے دُکھ نال نے جاواں، اگلے سُوتیاں کینہوں

ظُلم، جبر اور تکبر وُہی انسان کر سکتا ہے جسے اپنے کئے ہُوئے اعمال کے انجام کی فکر نہ ہو۔

۱۔ کرتے چاؤڑ چار دہاڑے، بھیسیں انت سمانا

ظُلم کریں کی لوک ستاویں کیوں لیا اُلٹ کھانا

جس دِن داوی مان کریں تُوں سوئی سنگ نہ جانا

شہر[۱] خموشاں توُں دیکھ ہمیشہ جگ جس ماہیں سمانا

مندرجہ ذیل سطور سے واضح ہوتا ہے کہ سائیں بلھے شاہ، دیگر فقرائے کامل کی طرح گوشت خوری کے خلاف تھے۔ آپ تنبیہہ کرتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کا گوشت کھائے گا۔ اس کو ایک دِن اس کا حساب چُکانے کے لئے" اجل کا بکرا بننا پڑے گا۔

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے:۔

جُز شکارِ دِل کہ بُوئے مُشک مے آید ازو

بُوئے خُوں آید زہر صیدے کہ در عالم کُشی

بر من است امروز فردا بروئے است

خون چُوں من کس چنیں ضائع کے ست

۱۔ من مانی ۲۔ قبرستان

گفت اولے چہ سلطانِ زماں
لحمِ خود گفتہ نہ لحمِ دیگراں

مطلب:۔ دِل کے شکار کے سوا، جِس سے کہ مُشک نافہ کی خوشبو آتی ہے، ہر ایک شکار سے جسکو اِس دُنیا میں تُو مارے گا خُون کی بُو آتی ہے۔ یہ خون آج میرے سر پر ہے۔ کل اس پر ہو گا۔ مجھ جیسے شخص کا خون کیسے ہو سکتا ہے؟

پیغمبر صاحب نے کیا خُوب فرمایا ہے:۔ اپنا گوشت کھا، نہ کہ دُوسروں کا۔

۲۔ کھاویں ماس چباویں بیڑی انگ نپٹک لگائیا ای
ٹیڈھی پگڑی آکڑ چلیں جُتی پَیر اڑائیا ای
اِک دِن اَجَل[1] دا بکرا بن کے اپنا آپ کہاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں کد تک حُکم چلاویں گا؟

انسان دُوسروں کا حق مار کر خوش ہوتا ہے، وُہ اس سچائی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کو یہ قرض ادا کرنے کے لئے پھر واپس دُنیا میں آنا پڑے گا۔ زور و جبر سے دُنیاوی فتوحات حاصل کرنے والا آدمی زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔

حق پرایا جاتو نا ہیں کھا کر بھار اُٹھاویں گا
پھیر نہ آکے بدلہ دیسیں لاکھی[2] کھیت لٹاویں گا
داؤ لا کے وِچ جگ دے جُوئے جِتے دَم[3] ہراویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں کد تک حُکم چلاویں گا؟

سائیں بُلھے شاہ اپنی کافی "نِت پڑھنا ایں استغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار" میں فرماتے ہیں کہ آدمی بگلے بھگت کی طرح اپنی طرف سے بہت ہوشیاری کرتا ہے۔ وُہ شرع کا پابند ہونے کا سوانگ بھی بھرتا ہے۔ مندروں، مسجدوں اَور گرجا گھروں میں جاکر توبہ کرنے کا

---

[1] مَوت۔ [2] انسانی جنم کا لاکھوں روپے کا کھیت فضُول برباد کرے گا۔
[3] جِتے دَم = جیتا ہُوا دَھن۔

دکھاوا بھی کرتا ہے۔ وُہ بات بات پر مذہبی کتابوں کی قسمیں بھی کھاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ظلم، جبر، بے ایمانی، لالچ اَور دھوکے بازی سے باز نہیں آتا۔ زبان سے توبہ کرنے والے، لیکن عملی طَور پر طَمع، فریب اَور کئی قسم کے عَیبوں اَور بُرے اعمال میں پھنسے ہُوئے لوگ "یہاں" اَور "وہاں" دونوں جہان میں خوار ہوتے ہیں۔ اُن کے اعمال ہی اُن کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ آخری وقت جب اُن کے اعمال کا حساب مانگا جاتا ہے تو وُہ بہت پچھتاتے ہیں۔ لیکن اُس وقت کیا ہو سکتا ہے؟ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اِنسان نَفس کے تابع نہ ہو کر کسی مُرشدِ کامل کی ہدایت پر عمل کرے، جو اُس کو بُرے اعمال سے بچا کر بحرِ فنا سے پار لے جا سکے۔ ؎

نِت پڑھنا ایں اِستغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!
جِتھے نہ جانا اوتھے جائیں۔ مال پرایا مُنہ دھر کھائیں
کُوڑ کتاباں سِر تے چائیں۔ ایہہ تیرا اعتبار
نِت پڑھنا ایں استغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!
ظالم ظُلموں ناہیں ڈردے۔ اپنی عملیں آپے مَردے
مُونہوں توبہ دِلوں نہ کردے۔ ایتھے اوتھے ہون خوار
نِت پڑھنا ایں استغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!

بابا فریدؒ نے نادان اَور غافل اِنسان کو ایسے اعمال ترک کرنے کی ترغیب دی ہے جن کے باعث اُسے مالک کے دَربار میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اَور ایسی طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تاکید کی ہے کہ جس سے وُہ دائمی راحت و مسرّت حاصل کر سکے۔

۱۔ فریدا جِنہیں کمیں نا ہِہ گُن تے کمڑے وِسار
مَت سرمندہ تھیوہی سائیں دے دربار (آدگرنتھ: صفحہ ۱۳۸۱)

۲۔ آپ سوارہہ مَیں مِلہہ مَیں مِلیا سُکھ ہوئے
فریدا جے توں میرا ہوئے رہیں سبھ جگ تیرا ہوئے

(آدگرنتھ: صفحہ ۱۳۸۲)

اِس لئے سائیں جی اِنسان کو مشورہ دیتے ہیں "کبیرا بیج جو کیسر ہووے لَسن بیج ٹھگاویں گا"۔ "کیسر بونا" اُس خداوند کریم کی عِبادت کرنا ہے[1]۔ جو اِنسان کو دُنیاوی بندشوں سے آزاد کر کے خُدا سے مِلا سکتی ہے۔ "سَیے ونجارے آئے نی مائے" میں آپ بے بس اِنسان کی بس وپیش کا ذِکر کرتے ہیں جو کامِل فقیروں سے اللہ تعالےٰ کے کلمہ کے لعل وگوہر خریدنے کی خواہش تو رکھتا ہے، مگر اِن کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اِن لعل وگوہر کی قیمت "سر" یعنی خودی یا نفس کا ترک ہے جس نے کبھی سُوئی کی چُبھن تک برداشت نہ کی ہو وُہ سر کیسے کٹوا سکتا ہے؟

سَیے وَنجارے آئے نی مائے سَیے ونجارے آئے
لالاں دا اوہ وَنج کریندے ہو کا آکھ سُنائے
جاں میں مُل اونہاں توں پُچھیا مُل کرن اوہ بھاسے
ڈُھہ سُوئی دا اکدے نہ کھادا، اوہ پُچھن سر بالے

سائیں بُلھے شاہ "کر کتن وَل دھیان کُڑے" والی کافی میں نصیحت کرتے ہیں کہ جب تک سانسوں کا سِلسلہ جاری ہے تب تک مُرشد کی بتائی ہُوئی ترکیب کے مطابق زندگی کی رات میں عرفان کی شمع روشن کر کے خُدا کی عبادت کا سُوت کات لینا چاہیئے، کیونکہ وقتِ آخر جب موت کے فرشتے سرہانے آکر کھڑے ہو جائیں گے۔ تو کچھ نہ بن پائے گا۔

دِیوا اپنے پاس جگاویں، کت کت سُوت بھڑولی پاویں[2]
اکھیں وِچوں رات لنگھاویں[3]، آوکھی کر کے جان کُڑے
آجے اَیڈا تیرا کم کُڑے، کیوں ہوئی ایں بے غم کُڑے
کی کر لینا اُس دم کُڑے، جد گھر آئے مہمان[4] کُڑے
کر کتن وَل دھیان کُڑے

---

[1] بابا فرید نے خُدا کی عبادت کو کستوری کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ جو لوگ رات کو جاگ کر محنت کرتے ہیں اُنہیں ہی یہ بیش قیمت شئے حاصل ہوتی ہے۔ ؎

فریدا رات کتھوری وَنڈِیئے سُتیاں مِلے نہ بھاؤ۔ جنہاں مِن نیندراولے تنہاں مِلن کواؤ دا آدگرنتھ - ۱۳۸۲ -

[2] بھڑولی پاویں = ذخیرہ بڑھاؤ۔ [3] اکھیں وِچوں رات لنگھاویں = رات کو بھی آرام نہ کرنا۔ [4] موت کے فرشتے

ذریعۂ نجات

عشقِ الٰہی

پتیاں[1] لکھاں میں شام نوں، پیا مینوں نظر نہ آوے
آنگن بنا ڈرا ونا، کِت بِدھ رین وہاوے[2]
کاغذ کروں لکھ دامنے، نین آنسو لاؤں
برہوں جاری ہوں جری، دل پھوک جلاؤں

دُنیا کے جال میں پھنسا ہُوا انسان کس طرح اس سے آزاد ہو سکتا ہے؟ مولانا آزاد "رباعیاتِ سرمد" کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ مادی بندشوں میں جکڑا ہوا انسان ان سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کے دِل پر کوئی گہری چوٹ نہ لگے۔ شہد پر بیٹھی مکھی بغیر اڑائے نہیں اُڑتی، جب تک انسان کا دِل چوٹ نہ کھائے، وہ دُنیا کی لذات نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق کے ہاتھوں ہی لگ سکتی ہے۔ فرشتۂ عشق کے بازوؤں میں وہ زبردست طاقت ہے کہ اُس کی تلوار کا پھلا وار ہی خون کے رشتے اور دُنیاوی کشش کی زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔[3] آپ مشہور صوفی عطار کے کلام کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ کافر کو کفر اور مومن کو دین مبارک ہو۔ عاشق کو تو صرف عشق کے درد کا ایک ذرہ ہی کافی ہے:

کفر کافر را و دیں دیندار را، ذرۂ دردِ دلِ عطار را

کامل پیر فقیروں اور ولی اولیا نے انسانی زندگی کا یہ بنیادی راز عیاں کیا ہے کہ دُنیا اور دُنیاوی اشیا کی رغبت انسان کو آواگون کے چکر میں پھنساتی ہے لیکن خدا اور اس کے

---

[1] خطوط [2] رین وہاوے = رات گزرے

[3] "رباعیاتِ سرمد" جہانگیر بک ڈپو، کھاری باؤلی دِلّی۔

کلمہ کا عشق اُس کو اِن بندھنوں سے آزاد کرکے خُدا سے مِلا دیتا ہے۔[1]

انسان دُنیاوی چیزوں کی خواہش کا شکار ہے۔ اولاد، دولت، رُتبہ، حکومت وغیرہ ہر طرح کی دُنیاوی خواہش کا چھوٹا سا بیج ایک بڑے درخت کو جنم دیتا ہے۔ ہر خواہش کو پُورا کرنے کے لئے انسان کو دُکھوں اور مُصیبتوں کی مُسلسل جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے۔ ادھوری خواہش دُکھوں اور پریشانیوں کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ اور بر آئی مُراد کئی طرح کے بندھنوں اور ذمہ داریوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ایک خواہش سے کئی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں، جو انسان کو مضبُوطی سے دُنیاوی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دِل میں ہمیشہ اَیسے خوفناک جوار بھاٹے اُٹھتے رہتے ہیں کہ اُس کو لمحہ بھر کے لئے بھی سکُون نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن جب شاہ عنایت جیسے کسی کامِل مُرشِد کی صحبت کے فیض سے اِنسان کو فانی دُنیا کی اصلیت کا علم ہو جاتا ہے، اور اُس کے دِل میں مقامِ حقیقی پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اُس کی رغبت اور جستجو کا رُخ ہی بدل جاتا ہے۔

سائیں بُلھے شاہ کا کلام اُس عاشق کے دِل کا درد ظاہر کرتا ہے۔ جس کے اندر محبُوب کے وصال کی تڑپ کا شعلہ بھڑک اُٹھا ہے۔ آپ اشارہ کرتے ہیں کہ رُوح کا اپنے اَصل کی طرف رُجحان کوئی نئی بات نہیں، یہ ازل سے ایک کُھلا افسانہ ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے۔ جُونہی اِنسان کے اندر خُدا کے ساتھ وصال کی خوابیدہ محبت بیدار ہو جاتی ہے، اُس کے لئے جُدائی کی تپش کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔[2] ہجر کی آگ تن کو تپاتی ہے، جِگر کو چیرتی ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے جسم کو کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈالکر جلا رہی ہو۔ ایک عجیب سا درد کلیجے میں گھر کر لیتا ہے۔

---

[1] خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ وُہ شخص کبھی نہیں مرتا، جس کا دِل عشق سے زندہ ہو چکا ہے، یہ حقیقت دُنیا کی تختی پر تحریر ہے:-

ہر گز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شُد بعشق۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

[2] سائیں بُلھے شاہ نے مُرشد کے ہجر کو خُدا کے ہجر کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ مُرشِد کے ہجر کے بیان کیلئے دیکھیں اِس کتاب کا صفحہ ۱۰ تا ۲۲

دکھاوا بھی کرتا ہے۔ وُہ بات بات پر مذہبی کتابوں کی قسمیں بھی کھاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ظلم، جبر، بے ایمانی، لالچ اَور دھوکے بازی سے باز نہیں آتا۔ زبان سے توبہ کرنے والے، لیکن عملی طَور پر طمع، فریب اَور کئی قسم کے عیبوں اَور بُرے اعمال میں پھنسے ہُوئے لوگ "یہاں" اَور "وہاں" دونوں جہان میں خوار ہوتے ہیں۔ اُن کے اعمال ہی اُن کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ آخری وقت جب اُن کے اعمال کا حساب مانگا جاتا ہے تو وُہ بہت پچھتاتے ہیں۔ لیکن اُس وقت کیا ہوسکتا ہے؟ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اِنسان نفس کے تابع نہ ہوکر کسی مُرشدِ کامل کی ہدایت پر عمل کرے، جو اُس کو بُرے اعمال سے بچاکر بحرِ فنا سے پار لے جاسکے۔

نِت پڑھنا ایں اِستغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!
جیتھے نہ جانا اوتھے جائیں۔ مال پرایا مُنہ دھر کھائیں
کُوڑ کتاباں سِر تے چائیں۔ ایہہ تیرا اِعتبار
نِت پڑھنا ایں استغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!
ظالم ظُلموں ناہیں ڈردے۔ اپنی عملیں آپے مَردے
مُونہوں توبہ دِلوں نہ کردے۔ ایتھے اوتھے ہون خوار
نِت پڑھنا ایں استغفار۔ کیسی توبہ ہے ایہہ یار!

بابا فرید نے نادان اَور غافل اِنسان کو ایسے اعمال ترک کرنے کی ترغیب دی ہے جن کے باعث اُسے مالک کے دَربار میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اَور ایسی طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تاکید کی ہے کہ جس سے وُہ دائمی راحت و مسّرت حاصل کرسکے۔

۱۔ فریدا جنہیں کمیں نا ہہ گُن تے کمڑے وِسار
مَت سرمندہ تھیوہی سائیں کے دربار (آدگرنتھ: صفحہ ۱۳۸۱)

۲۔ آپ سوارہہ مَیں ملیہ مَیں ملیا سُکھ ہوئے
فریدا جے توُں میرا ہوئے رہیں سبھ جگ تیرا ہوئے
(آدگرنتھ: صفحہ ۱۳۸۲)

اِس لئے سائیں جی اِنسان کو مشورہ دیتے ہیں "کبیرہ بیج جو کیسر ہووے لسن بیج ٹھگا دیں گا"۔ "کیسر بونا" اُس خداوند کریم کی عِبادت کرنا ہے[1]۔ جو اِنسان کو دُنیاوی بندشوں سے آزاد کر کے خُدا سے مِلا سکتی ہے۔ "سے ونجارے آئے نی مائے" میں آپ بے بس اِنسان کی پس وپیش کا ذِکر کرتے ہیں جو کامِل فقیروں سے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے لعل و گوہر خریدنے کی خواہش تو رکھتا ہے۔ مگر ان کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان لعل و گوہر کی قیمت "سر" یعنی خودی یا نفس کا ترک ہے جس نے کبھی سُوئی کی چُبھن تک برداشت نہ کی ہو وُہ سر کیسے کٹوا سکتا ہے؟

سَے وَنجارے آئے نی مائے سَے ونجارے آئے
لالاں دا اوہ وَنج کریندے ہو کا آکھ سُنائے
جاں میں مُل اونہاں توں پُچھیا مُل کرن اوہ بھاسے
ڈھہ سُوئی دا اکدے نہ کھاہدا، اوہ پُچھن سر بارے

سائیں بُلھے شاہ "کر کتن وَل دھیان کُڑے" والی کافی میں نصیحت کرتے ہیں کہ جب تک سانسوں کا سِلسلہ جاری ہے تب تک مُرشد کی بتائی ہُوئی ترکیب کے مطابق زندگی کی رات میں عرفان کی شمع روشن کر کے خُدا کی عِبادت کا سُوت کات لینا چاہیئے۔ کیونکہ وقتِ آخر جب موت کے فرشتے سرہانے آ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ تو کُچھ نہ بن پائے گا۔

دِیوا اپنے پاس جگاویں ، کَت کَت سُوت بھڑولی[2] پاویں
اکھیّں وِچوں رات لنگھاویں[3] ، اَ وکھی کر کے جان کُڑے
اَجے اَیڈا تیرا کم کُڑے ، کیوں ہوئی ایں بے غم کُڑے
کی کر لینا اُس دم کُڑے ، جد گھر آئے مہمان[4] کُڑے
کر کتن وَل دھیان کُڑے

---

[1] بابا فرید نے خُدا کی عبادت کو کستُوری کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ جو لوگ رات کو جاگ کر محنت کرتے ہیں اُنہیں ہی یہ بیش قیمت شئے حاصل ہوتی ہے۔ ے
فریدا رات کتھوری وَنڈیئے سُتیاں مِلے نہ بھاؤ۔ جنہاں مین نیندراولے تنہاں مِلن کواؤ دآدگرنجہ - ۱۳۸۲ -
[2] بھڑولی پاویں = ذخیرہ بڑھاؤ [3] اکھیّں وِچوں رات لنگھاویں = رات کو بھی آرام نہ کرنا [4] موت کے فرشتے

ذریعۂ نجات

عشقِ الٰہی

پتیاں[1] لکھاں میں شام نوں۔ پیا مینوں نظر نہ آوے
آنگن بنا ڈراونا، کِت بِدھ رین[2] وہاوے
کاغذ کروں لکھ دامنے۔ نین آنسو لاوؤں
برہوں جاری ہوں جری۔ دِل پھونک جلاؤں

دُنیا کے جال میں پھنسا ہُوا انسان کس طرح اِس سے آزاد ہو سکتا ہے؟ مولانا آزاد "رباعیاتِ سرمد" کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ مادّی بندشوں میں جکڑا ہُوا انسان ان سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کے دِل پر کوئی گہری چوٹ نہ لگے۔ شہد پر بیٹھی مکھی بغیر اُڑائے نہیں اُڑتی، جب تک انسان کا دِل چوٹ نہ کھائے۔ وُہ دُنیا کی لذّات نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق کے ہاتھوں ہی لگ سکتی ہے۔ فرشتۂ عشق کے بازوؤں میں وُہ زبردست طاقت ہے کہ اُس کی تلوار کا پھلاوا رہی خون کے رِشتے اور دُنیاوی کشش کی زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے[3]۔ آپ مشہور صوفی عطّار کے کلام کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ کافر کو کفر اور مومن کو دین مبارک ہو۔ عاشق کو تو صرف عشق کے درد کا ایک ذرہ ہی کافی ہے ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را ، ذرۂ دردِ دلِ عطّار را

کامل پیر فقیروں اور ولی اولیا نے انسانی زندگی کا یہ بنیادی راز عیاں کیا ہے کہ دُنیا اور دُنیاوی اشیا کی رغبت انسان کو آواگون کے چکّر میں پھنساتی ہے، لیکن خدا اور اس کے

---

[1] خطوط [2] رین وہاوے = رات گزرے
[3] "رُباعیاتِ سرمد" جہانگیر بُک ڈپو۔ کھاری باؤلی دِلّی۔

کلمہ کا عشق اُس کو اِن بندھنوں سے آزاد کر کے خُدا سے ملا دیتا ہے۔[1]

انسان دُنیاوی چیزوں کی خواہش کا شکار رہتا ہے۔ اولاد، دولت، رُتبہ، حکومت وغیرہ ہر طرح کی دُنیاوی خواہش کا چھوٹا سا بیج ایک بڑے درخت کو جنم دیتا ہے۔ ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے انسان کو دُکھوں اور مُصیبتوں کی مُسلسل جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے۔ ادھوری خواہش دُکھوں اور پریشانیوں کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ اور بر آئی مُراد کئی طرح کے بندھنوں اور ذمہ داریوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ایک خواہش سے کئی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں، جو انسان کو مضبُوطی سے دُنیاوی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دِل میں ہمیشہ ایسے خوفناک جوار بھاٹے اُٹھتے رہتے ہیں کہ اُس کو لمحہ بھر کے لئے بھی سکُون نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن جب شاہ عنایت جیسے کسی کامِل مُرشِد کی صحبت کے فیض سے اِنسان کو فانی دُنیا کی اصلیت کا علم ہو جاتا ہے، اور اُس کے دِل میں مقامِ حقیقی پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اُس کی رغبت اور جستجو کا رُخ ہی بدل جاتا ہے۔

سائیں بُلھے شاہ کا کلام اُس عاشق کے دِل کا درد ظاہر کرتا ہے، جس کے اندر محبُوب کے وصال کی تڑپ کا شعلہ بھڑک اُٹھا ہے۔ آپ اشارہ کرتے ہیں کہ رُوح کا اپنے اصل کی طرف رُجحان کوئی نئی بات نہیں، یہ ازل سے ایک کھلا افسانہ ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے۔ جُونہی اِنسان کے اندر خُدا کے ساتھ وصال کی خوابیدہ محبت بیدار ہو جاتی ہے، اُس کے لئے خُدائی کی تپش کو برداشت کرنا مُشکل ہو جاتا ہے۔[2] ہجر کی آگ تن کو تپاتی ہے، جگر کو چیرتی ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے جسم کو کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال کر جلا رہی ہو۔ ایک عجیب سا درد کلیجے میں گھر کر لیتا ہے۔

---

[1] خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ وُہ شخص کبھی نہیں مرتا، جس کا دِل عشق سے زندہ ہو چکا ہے، یہ حقیقت دُنیا کی تختی پر تحریر ہے:-

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شد بعشق۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

[2] سائیں بُلھے شاہ نے مُرشِد کے ہجر کو خُدا کے ہجر کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ مُرشِد کے ہجر کے بیان کیلئے دیکھیں اِس کتاب کا صفحہ ۲۱ تا ۲۲

ہجر کی لپٹیں دِن بدن بھڑکتی جاتی ہیں ۔

۱۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا[1]

کُن فیکون[2] اگے دیاں لگیاں۔ نیہوں نہ لگڑا چوری دا

۲۔ نی مینوں لگا عشق اولڑا۔ روز ازل دا

وِچ کڑاہی تل تل پاوے۔ تلیاں نوں چا تلدا

موئیاں نوں ایہہ ول ول مارے۔ ولیاں نوں چا ولدا

کیا جاناں کوئی چِنگ کِکھیں[3] اے۔ نِت سُولاں[4] کلیجے سَلدا[5]

تیر جگر وِچ لگا عشقوں۔ ہلایاں بھی نہیں ہلدا

بُلھا شوہ دا نیہوں انوکھا۔ نہیں رلایاں رلدا

سائیں بُلھے شاہ کی کافیاں "بوہڑیں وے طبیبا منیڈھی جند گئیا"، "نسیں کرو اساڈی کاری"، "اب لگن لگی کیہہ کریئے"، "متر پیارے کارن نی"، "مینوں چھڈ گئے آپ لد گئے"، "مینوں درد اولڑے دی پیڑ" وغیرہ مُرشد کے ہجر میں پارہ پارہ ہُوئے دِل کی درد بھری پُکار کی شکل میں اُبھری ہیں۔

کئی اور صوفی درویشوں نے بھی محبوب کے ہجر کی ٹیس کے درد بھرے گیت گائے ہیں۔ مولانا رُوم اپنی مثنوی کی ابتدا رُوح کی جُدائی کی آہ و زاری سے کرتے ہیں۔ رُوح کی بانسری کہتی ہے کہ "میں اپنی جُدائی کی شکایت بھری داستان بیان کر رہی ہُوں۔ جب سے مَیں جنگل (مقامِ حق) سے بچھڑی ہُوں، مَیں خوار و پریشان ہُوں۔ جس کسی کو بھی اُس کی اصلی ذات سے جُدا کیا جاتا ہے اُس

۱ ے چاہیئے۔ ۲ ے کُن فیکون۔ قرآن شریف کی آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے ذریعہ مخلوق کے پیدا کرنے کا حُکم کئے جانے کی طرف اشارہ ہے۔ کُن۔ ہو جا۔ فیکون۔ ہو گیا۔ سائیں بُلھے شاہ اشارہ کرتے ہیں کہ رُوح خُدا کے حُکم سے عالمِ آب و گِل میں آئی تب اس کے اندر جُدائی کی تڑپ پیدا ہو چکی ہے۔

۳ ے چِنگ کِکھیں: تنکوں میں چھپی آگ کی چنگاری۔

۴ ے کانٹا ناقابلِ برداشت درد ۵ ے کلیجے سَلدا: کلیجے کو چھیدنا ہے۔

میں اپنے اصل سے دوبارہ ملنے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند، وز جدائیہا شکایت می کند[1]

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند، از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق، تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش، باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

من بہر جمعیتے نالاں شدم، جفتِ خوشحالاں و بدحالاں شدم

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من، وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

سرِ من از نالۂ من دور نیست، لیک چشم و گوش را آں نور نیست

بابا فرید نے ہجر کی تڑپ کو "سُلطانی احساس" کا درجہ دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہجر کی تڑپ اعلیٰ سے اعلیٰ اور مبارک سے مبارک جذبہ ہے۔ فرقت عشق کو ایک نئی زندگی دیتی ہے۔ دردِ فرقت محبت کی نشانی ہے۔ یہ محبت کو ظاہر بھی کرتی ہے اور اس کو پختہ بھی۔ جس کے کلیجے میں جدائی کا درد نہیں، وہ وصال کے لئے کیا کوشش کرے گا۔ ؎

برہا برہا آکھیئے برہا تو سُلطان

فریدا جت تن برہا نہ اُپجے سو تن جان مسان

(آدگرنتھ، صفحہ ۱۳۷۹)

سچا عاشق محبوب کی لمحہ بھر کی جدائی بھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ بار بار محبوب کو اپنی طرف

---

[1] بانسری سے سُن کیا بیان کرتی ہے اور جدائیوں کی کیا شکایت کرتی ہے۔ کہ جب سے مجھے بنسلی سے کاٹا ہے میرے نالہ سے مرد و عورت (سب) روتے ہیں۔ میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو، تاکہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں۔ جو کوئی اپنے اصل سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے۔ میرا ہر مجمع میں غم کی طرف رُجحان رہا۔ خوش اوقات اور بداحوال لوگوں کے ساتھ بھی رہی۔ مگر میرا حال بد سے بدتر ہوتا گیا۔ میرا راز میرے نالہ سے دور نہیں ہے۔ لیکن آنکھ اور کان کے لئے وہ نور نہیں ہے۔

رُجوع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو سینے سے لگانے کے لئے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا ہے۔

۱۔ دِل لوچے ماہی یار نُوں
۲۔ ساتُوں آ مِل یار پیاریا
۳۔ ساڈے وَل مُکھڑا موڑ
وے پیاریا
ساڈے وَل مُکھڑا موڑ
۴۔ اپنے سنگ رَلائیں پیارے،
اپنے سنگ رلائیں۔

محبُوب کی طرف سے کی گئی ایک لمحہ کی تاخیر بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ جیسے بھی ممکن ہو وصال ہونا چاہیئے، چاہے اُس کے لئے عاشق کو اپنی جان بھی دینی پڑے۔

۱۔ اَب کیوں ساجن چِرلائیو رے
۲۔ آ سجن گل لگ اساڈے۔ کیہا جھیڑا لائیو ای
۳۔ تُم سُنو ہمارے بَینا، موہے رات دنے نہیں چَینا
ہُن پی بِن پَلک نہ سرئیے۔ اَب لگن لگی کیہہ کریئے

آپ کے کلام میں صرف ہجر کے دَرد بھرے بیان ہی نہیں، بلکہ وصل کے خُوبصورت لمحات کا دلکش ذکر بھی ملتا ہے۔ اس طرح کی سب سے خوبصُورت کافی " گھڑیالی دیئو نکال نی، ہُن پی گھر آیا لال نی" ہے۔ محبُوبہ چاہتی ہے کہ اب جب کہ محبُوب گھر آ گیا ہے، وقت تھم جائے اور فراق کی سب صُورتیں ختم ہو جائیں، تاکہ محبُوب کا وِصال اَور اُس کا حقیقی سُرور کبھی ختم نہ ہو۔

آپ کے دِل میں عشقِ الہٰی کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ آپ نے خُداوند کریم کو قادرِ مُطلق، عالمِ مُطلق، وحدت اُلوجُود، حاکم، رازق، خالق وغیرہ ظاہر کرنے پر کم، لیکن محبُوبِ حقیقی یا دلبر جانی ثابت کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔ "عشق اللہ

کی ذات ہے[۱]۔ اِس لئے آپ نے اپنے آپ کو محبوبہ اور خدا کو محبوب کے طور پر ظاہر کیا ہے۔ آپ کے لئے وُہ خدا سجن یا ساجن، ماہی یا سائیں، شوہ یا شوہر، رانجھا یا رانجھن ہوت یا پنوں اور کرشن یا کاہن ہے۔ آپ اُس محبوبِ حقیقی کو لیلے، مہینوال، ڈھولا، پریتم، جانی دلبر، یار اور سوہنا یار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کا محبوب کے ساتھ ایسا انوکھا رشتہ ہے کہ آپ اُسے چھلیا، جادُوگر، بھیکھی، چور اور ٹھگ بھی کہہ دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے محبوب کے ساتھ کئی طرح کی ادائیں کی ہیں۔ آپ کے اندازِ بیاں میں پیار ہے، اُلفت ہے، ناز و ادا ہے، شکایت بھی ہے اور اعتقاد بھی۔ آپ ایک بے نیازی اور مستی کے عالم میں محبوب سے پوچھتے ہیں: "کچھ اسیں بھی تینوں پیارے ہاں کہ مہیوں گھول گھمائی ہاں[۲]"؟ اِسی محبت بھرے انداز میں آپ کہہ اُٹھتے ہیں:

۱۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا
۲۔ ستی دا دِل لُٹن کارن ہوت پنوں بن آیا
۳۔ تک بوجھ کون چھُپ آیا اے کِس بھیکھی بھیکھ وٹایا اے
۴۔ میری بُکل دے وِچ چور رسادھو۔ کِس نوں کوک سُناواں
۵۔ لُکن چھپن تے چھپ جاون۔ ایہہ تیری وڈیائی

مالکِ کُل دُنیا کے پردے کے پیچھے چھُپا نُور کا سرچشمہ ہے۔ سائیں بُلھے شاہ کے لئے وُہ ایک

---

[۱] دادُو صاحب نے بھی فرمایا ہے "رب کی ذات عشق ہے اور اُس کا وُجود ہی عشق ہے" ۔
عِشق اللہ کی ذات ہے ۔ عِشق اللہ کا انگ
عِشق اللہ اوجُود[+] ہے ۔ عِشق اللہ کا رنگ

[۲] ایک صُوفی فقیر نے فرمایا ہے: عِشق پہلے معشوق کے دِل میں پیدا ہوتا ہے ۔
"عشق اوّل در دِلِ معشوق پیدا میشود"

حضرت بُو علی قلندر فرماتے ہیں کہ اگر تجھے اُس کے پیار کی خبر ہو جائے تو تجھے معلوم ہو جائے کہ وُہ تجھے تجھ سے کہیں زیادہ پیار کرتا ہے ۔
گر ترا از عِشق او باشد خبر
از تو مُشتاق ست او مُشتاق تر

* جوہر + وجُود

ایسا معشوق ہے جس نے عاشق کو تڑپانے کے لئے اپنے جمال کو چلمن کی اوٹ میں چُھپا لیا ہے ؎

اُس دا مُکھ اِک جوت ہے، گھونگھٹ ہے سنسار
گھونگھٹ میں وُہ چُھپ گیا، مُکھ پر آنچل ڈار

سائیں بُلھے شاہ کے لئے آسمان میں چمکتے ستارے محبوب کے جادُو کا کرشمہ ہیں۔ مادی کائنات بھی اُس محبُوب کے جادُو کا ہی کمال ہے جو رسّی میں سانپ کے ہونے کا دھوکا دے سکتا ہے ؎

وے تُوں کیسے چینچر چلائے، تارے کھاری ہیٹھ لکائے
مُنج دی رسّی ناگ بنائے، تیرے سحراں[1] توں بلہاری

خُدا کو حسب نسب، زبان و بیان اور ذات پات سے بالاتر کہا گیا ہے۔ سائیں جی اُس ذاتِ مُطلق کے اِس خاصہ کو بھی ایسی پُرلُطف شوخی کے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وُہ ذاتِ لامحدُود بھی نزدیک ترین پیارے محبُوب کی شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ ؎

واہ واہ رمز سجن دی ہور، عاشق بِنا نہ سمجھے کور[2]
بُلھا شَوَد نُوں کوئی نہ ویکھے، جو ویکھے سو کِسے نہ لیکھے
اُس دا رنگ نہ رُوپ نہ ریکھے[3]، اوہ وی ہووے ہو کے چور

وُہ مالک قادرِ مُطلق ہے۔ جو کُچھ بھی ہوتا ہے اُس کی رضا سے ہوتا ہے، لیکن سائیں جی کے لئے مالکِ کُل ایک ایسا البیلا دلبر ہے جو نہ کِسی سے پوچھتا ہے، نہ ہی کِسی کی بات مانتا ہے۔ وُہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُس کی دانائی اِس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ وُہ اوٹ میں چُھپ کر رمز میں بات کرتا ہے۔ کُھل کر سامنے نہیں آتا ؎

صلاح نہ منّدا وات نہ پُچھدا، آکھ ویکھاں کیہہ کردا
کل میں کملی[4] نے اوہ کملا[5]، ہُن کیوں میتھوں ڈردا

---

[1] جادُو [2] اندھا، بے بصر [3] شکل، صُورت، رنگ وغیرہ سے بالاتر [4] دیوانی [5] دیوانہ

اوبلے بہہ کے رمز چلائی، دِل نوں چوٹ لگائی
جند کُڑِکی دے مُنہ آئی۔

"وَتّ نہ کرساں مان رنجھیٹے یاردا وے اَڑیا" میں سائیں جی یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اپنی مَن آئی کرنے والے اُس دِلبر کی رمز سمجھ پانا ناممکن ہے۔ وُہ گنہگاروں کے ساتھ محبت کرتا ہے اَور بے گناہوں کو تڑپا رہا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کیوں؟ وہ اپنے کھیل کا راز آپ ہی جانتا ہے ے

اِک کردیاں خودی ہنکار، اوہناں نُوں تارنا ایں وے اڑیا
اِک رہندیاں نِت خوار، سَڑیاں نُوں ساڑنا ایں وے اڑیا
چِکڑ[1] بھریاں نال، اُٹھ جھمر گھتنا[2] ایں وے اڑیا
مَیں لایا ہار شنگار، میتھوں اُٹھ نسنا ایں، وے اڑیا
وَتّ نہ کرساں مان، رنجھیٹے یاردا دے اڑیا

چُونکہ وُہ کُل مالک واحد، لاشریک ہے، بہتری اِسی میں ہے کہ اس کی رضا میں مُطمئن رہا جائے خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشای
کہ بر من و تو درِ اختیار نکشا دست

سب کچھ اس کی رضا پر چھوڑ دے اَور ماتھے پر تیوری نہ چڑھا۔ یہ سمجھ لے کہ اختیار کا دروازہ تیرے اَور میرے لئے کُھلا نہیں ہے۔

کامِل فقیروں نے اشارہ کیا ہے کہ جب خُداوند کریم نے کائنات کو پیدا کیا تو کئی رُوحیں ذاتِ مطلق سے علیحدہ ہو کر عالمِ آب و گِل میں آنے کیلئے راضی نہ تھیں، مگر اللہ تعالےٰ نے اُن کو یہ کہہ کر مادّی دُنیا میں بھیج دیا کہ مَیں تمہیں عالمِ ارواح میں واپس لانے کے لئے خُود خاکی دُنیا میں آؤں گا۔ سائیں بُلھے شاہ یہ لطیف نکتہ بھی نہائت پُرلطف انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔

---

[1] پھندہ۔ [2] کیچڑ سے لت پت۔ [3] جھمر گھتنا = ناچنا

آپ ذاتِ حق سے شکوہ کرتے ہیں۔ قادرِ مطلق خداوند کریم سے نہیں، بلکہ اپنے محبوب حقیقی سے۔ کہ تو نے ہم سے جھوٹا اقرار کرکے مادی دُنیا میں بھیج دیا، اور بعد میں خود پردہ نشین ہوکر ہمیں حرص و ہوا کی دُنیا میں لاکر اس قدر بھرما دیا کہ اب اس بحرِ حیات سے نجات پانا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ؎

میں گل اوتھے دی کردا ہاں۔ پر گل کردا وی ڈردا ہاں
نال رُوحاں دے لارا لایا۔ تُسیں چلو میں نالے آیا
ایتھے پردہ چا بنایا۔ میں بھرم بُھلایا پھردا ہاں

کامل فقیروں نے رب کے بے صورت سے باصورت اور کامل وحدت سے لامحدود کثرت میں جلوہ گر ہونے کا بیان کمال خوبی سے کیا ہے۔ سائیں بلھے شاہ اپنے محبوبِ حقیقی کی صفات کا بیان نہایت دلکش انداز اور پیار بھرے رنگ میں کرتے ہیں۔ آپ خداوند کریم کو "سوہنا یار" اور اُس کی بنائی ہوئی کائنات کو اُس کے حُسن کا گرم بازار" کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ آپ نورِ مطلق کے اِس عالمِ آب و گِل میں کامل وحدت سے لامحدود کثرت میں ظاہر ہونے کے کمال کی توصیف میں فرماتے ہیں۔ ؎

ہُن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حُسن دا گرم بازار
جد احد[1] اِک اِکلا سی۔ نہ ظاہر ہوئی تجلّی[2] سی
نہ رب رسُول نہ اللہ سی۔ نہ جبّار[3] تے نہ قہار[4]

اِس مکمل وحدت میں وُہ رنگ، رُوپ، شکل، صورت سے بالاتر تھا۔ وُہ لاثانی اور بے مثال تھا۔ اپنے جیسا آپ ہی تھا۔ اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں جس کے ساتھ اس کو تشبیہہ دی جا سکے۔ پھر وُہ خود ہی ہزاروں رنگوں میں رُونما ہو گیا۔ ؎

---

1. واحد: ایک 2. تجلّی: نور
3. جبر کرنے والا۔ 4. قہر ڈھانے والا۔

بے چُون و بے چگوُ نہ سی، بے شبیہ بے نمُونہ سی
نہ کوئی رنگ[1] نہ نمونہ سی، ہُن گوُ ناگوُں[1] ہزار
ہُن میں لکھیا سوہنا یار

کثرت کی کیفیت میں وُہ ایک دِلدارِ حقیقی خود ہی طرح طرح کی پوشاکیں پہن کر سامنے آ گیا۔ وُہ کہیں آدم بن گیا، کہیں پیغمبر اور کہیں مُرشد۔ اُس محبُوب نے اپنے حکم سے لا انتہا وُسعت اور رنگا رنگ کائنات کی نمود کی۔

پیارا پہن پوشاکاں آیا، آدم اپنا نام دھرایا
احد[2] توں بن احمد آیا، نبیاں دا سردار
کُن[3] کہیا فیکُون کہایا، بے[4] چُونی سے چُون بنایا
احد دے وِچ میم رلایا، تاں[5] کیتا ایڈ پسار
ہُن میں لکھیا سوہنا یار

آپ نے اپنی کافی "رُہ رُہ وے عِشقا ماریا ای" میں اپنے محبُوب کے انوکھے ڈھنگ میں عمل پیرا ہونے کا رمز یہ انداز میں ذِکر کیا ہے۔ عیسیٰؑ، رام، مُوسیٰؑ، کرشن میں اپنا نُور رکھنے والا بھی وُہی محبُوب ہے۔ زکریا، سرمد، شمس تبریز اور شاہ شرف وغیرہ میں عِشقِ حقیقی کی خاطر طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرنے والا بھی وُہی محبُوب ہے۔ یُوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، سسّی پُنّوں، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں وغیرہ میں عشق کی آگ بھڑکانے والا بھی وُہی ہے۔ شیطان، نمرود، فرعون، ہرناکش، راون اور کوروں وغیرہ میں خودی اور تکبّر پیدا کر کے ان کو نیست و نابُود کرنے والا بھی وُہی محبُوبِ حقیقی ہے۔ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، سب اُسی

---

[1] طرح طرح کے رنگ رُوپ میں ظاہر ہو گیا۔

[2] رَبّ سے رسُولؐ بن گیا۔ [3] رَبّ نے کہا "ہو جا" تو ہو گیا۔ اشارہ حکم، کلمہ یا شبد کے ذریعہ کائنات کی تخلیق کی طرف ہے۔ [4] بِلا مادّہ کیفیت سے مادّی جہان کی تخلیق کی [5] مکمّل وحدت سے کثرت کی توسیع کی۔

محبوب کا رنگین ناٹک ہے۔ آپ "کنہوں لامکانی وسدے ہو، تُسیں ہر رنگ دے وِچ وسدے ہو" کا قی میں بھی دُنیائے فانی کو محبوبِ حقیقی کے عشق کا کھیل کہتے ہیں۔ ؎

کُن فیکون تیں آپ کہایا ۔ تیں باجھوں ہور کیہڑا آیا
عِشقوں سب ظہور بنایا ، عاشق ہو کے وسدے ہو
کِنہوں لامکانی وسدے ہو

سائیں جی فرماتے ہیں کہ میرا محبوب سب سے اعلےٰ ۔ سب سے بڑی سرکار ہے۔ دیوی دیوتے، پیر پیغمبر، سب اسی محبوب کو سجدہ کرتے ہیں، لیکن وہ میرا "دِل جانی" ہے۔ اس کو خوش کرنے کے لئے مجھے مندر، مسجد میں جانے، فاقہ کرنے یا روزہ رکھنے اور وضو کرنے یا نماز گزارنے کی ضرورت نہیں۔ میرے مُرشد نے مجھے یہ پوشیدہ راز سمجھا دیا ہے کہ وہ "دِل جانی" جان نثار کرنے سے مائل ہوتا ہے۔ اِس لئے میں اُس پر اپنی جان قربان کرتا ہوں ؎

تجوں مسیت، تجوں بُت خانہ ، برتی رہاں نہ روزہ جانا
بُھل گیا وضو نماز دوگانہ ۔ تیں پر جان کراں بلہار
پیر پیغمبر اس دے بردے[1] ، اِنس[2] ملائک[3] سجدے کردے
سر قدماں دے اُتے دھردے ، سب توں وڈی اوہ سرکار
جو کوئی اُس نوں لکھیا چاہے ، باجھ وسیلے لکھیا نہ جائے
شاہ عنایت بھید بتائے ، تاہیں کُھلے سب اسرار[4]
ہُن میں لکھیا سوہنا یار
جس دے حُسن دا گرم بازار

خدا کا عاشق اپنے آپ کو ادنےٰ اور محبوبِ حقیقی کو عظیم ترین تصور کرتا ہے جس سے اُس کے اندر عاجزی، حلیمی اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے، جو کاملِ فقیروں کا سب سے اعلیٰ زیور ہے۔ سائیں جی ایک سچے عاشق کی طرح اپنے لئے نہایت عاجزانہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

---

[1] غلام [2] انسان [3] مَلک کی جمع، جس کا مطلب ہے فرشتے [4] بھید یعنی راز۔

۱ اینہاں سبھناں تھیں، ہے بلھا او گنہار پرانا
۲ میں چوہڑ بیڑی ہاں. سچّے صاحب دے درباروں
پیروں ننگی، سروں جھنڈولی، سنیہا آیا یاروں

آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کرنے والے اور یادِ خدا میں مشغول رہنے والے میرے تمام ساتھی نجات حاصل کر چکے ہیں مگر میرے پاس کوئی وصف نہیں۔ مجھے فقط اپنے محبوب کی رحمت پر اعتقاد ہے ؎ عملاں والیاں لنگھ لنگھ گئیاں، ساڈیاں لاج سائیں نوں

محبوبِ حقیقی اگر میرے اعمال دیکھے تو میری کوئی وقعت نہیں، میرا سہارا فقط اُس کی رحمت ہے[1]۔

---

[1] حضرت سرمد فرماتے ہیں ؎

از کردۂ خویش منفعل بسیارم ۔ عمریست کہ پیوستہ دریں آزارم
چیزی کہ نباید لشود از من شد ۔ برفضل نظر بکن نہ بر کردارم

مطلب:۔ میں اپنے کئے ہوئے اعمال پر بہت شرمندہ ہوں۔ میری عمر اِسی آزار میں بسر ہوگئی ہے کہ جو گناہ نہیں کرنے چاہیئے تھے، مجھ سے ہو گئے ہیں۔ اب تو بس یہی چارہ ہے کہ تو میرے گناہوں کی بجائے اپنی رحمت کی طرف دیکھ۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

۱۔ فقیر و خستہ بہ درگاہت آمدم رحمے۔ کہ جز ولائے توام نیست ہیچ دستاویز
۲۔ آبرو میرو د اے ابرِ خطا پوش ببار۔ کہ بدیوانِ عمل نامۂ سیاہ آمدہ ایم

مطلب:۱۔ میں فقیر اور خستہ حال ہو کر تیری پناہ میں آیا ہوں، رحم کر۔ سوائے تیری دوستی کے میرے پاس دکھانے کیلئے کوئی دوسری دستاویز نہیں۔ ۲۔ میری آبرو جا رہی ہے۔ اے گناہوں پر پردہ ڈالنے والے ابر برس کیونکہ میں اپنا سیاہ اعمال نامہ لئے ہوئے آیا ہوں۔

اِسی موضوع پر حضرت باہُو فرماتے ہیں:۔

بُہتی میں اوگنہاری تاں بھی لاج پئی گل اُس دے ہُو (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۔ عدل کریں تاں جا نہیں کائی فضلوں بخرا پاواں
۲۔ تُدھ باجھوں میرا ہور نہ کوئی، کے دَل کروں پکاروں
بُلھا شاہ عنایت کرکے بخرا ملے دیداروں

راہِ تصوف راہِ عشق ہے۔ یہ رَب یا مُرشد کی محبت کی بُنیاد پر قائم ہے منصور کہتا ہے کہ اللہ کی رُوح عشق ہے۔ اللہ نے آدمی میں سب اَوصاف پیدا کئے ہیں تاکہ اُن کے ذریعے اپنے آپ سے محبت کر سکے[1]۔ رَب یا مُرشد کا عشق صُوفی کے خیال کو ہر طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ شیخ ابوسعید (پیدائش ۹۶۷ئ) فرماتے ہیں کہ صُوفی تعلیم ایک ہی طرف دیکھنا اور ایک ہی طرح کا جینا سکھاتی ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ صُوفی خُدا کے عشق میں اِسقدر کھو جائے کہ اس کے لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دُوسرے وجُود کا احساس تک باقی نہ رہے۔ سچا صُوفی مکمل طور پر خُدا کی رضا پر اکتفا کرتا ہے، اور اپنی رُوح کو سوائے خُدا کے ہر شئے سے بچا کر رکھتا ہے[2]۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ مَیں کعبہ کو آگ لگانا چاہتا ہُوں تاکہ آئندہ لوگ کعبہ کی بجائے

بقیہ: فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ سے آگے

اور گورُو ارجن دیوجی نے کہا ہے:۔

کہہ نانک ہم نیچ کرما ۔ سرن پڑے کی راکھو سرما (آدگرنتھ صفحہ ۱۲)

کبیر صاحب نے بھی لکھا ہے:۔

کبیرا ہم سَب بھلے ہم سو بُرا نہ کوئے

اِن تمام حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ درویش، انکساری اور عاجزی کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنا تکیہ اپنے نیک اعمال نہیں سمجھتے، بلکہ خُدا کی رحمت کو سمجھتے ہیں۔

[1] R. A. Nicholson, **Studies in Islamic Mysticism**, Cambridge, 1976, p. 80 cf. **History of Sufism in India**. V-I, p. 73.

[2] **History of Sufism in India**, p-49-50.

کعبہ کے مالک اُس خداوند کریم کی طرف ہی رجوع کریں۔ آپ دوزخ اور بہشت کو جلانا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اس طرف سے ہٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے[1] رابعہ بصری چاہتی تھی کہ دوزخ اور جنت جل کر راکھ ہو جائیں، تاکہ بہشت کے لالچ یا دوزخ کے ڈر کی بجائے لوگ صرف خدا سے خدا کی خاطر ہی محبت کریں۔ وہ کہا کرتی تھی: "اے خدا! اگر میں نے تجھے بہشت کے لالچ سے پیار کیا ہے تو مجھے اس سے محروم رکھنا۔ اگر میں نے تجھے دوزخ کے ڈر سے چاہا ہے، تو مجھے دوزخ کی آگ میں جلانا لیکن میں نے اگر تجھے تیری خاطر پیار کیا ہے تو مجھے اپنے جمال سے ہرگز محروم نہ رکھنا۔

فقیروں کو کعبہ، دوزخ یا جنت کے جلانے سے کیا واسطہ؟ یہ تو اُن کا اپنی بات سمجھانے کا ایک ڈرامائی انداز ہے۔ مگر کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ باہری پرستش گاہوں کی بات تو کیا کرنی ہے، جسم کو سچا کعبہ ماننے والے لوگ بھی اس فانی جسم کے عشق میں اس قدر غلطاں ہیں کہ اُن کی اس کے اندر بیٹھے محبوبِ حقیقی کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔ صوفی درویش ابوالمجد مجدود سنائی (وفات ۱۱۳۰-۳۱ء) فرماتے ہیں: "اے خدا! میں تیری محبت اور فقط تیری ہی محبت چاہتا ہوں۔ اگر میری تقدیر میں دُنیا کی دولت نہیں ہے تو نہ سہی، کیونکہ دُنیا اور خدا کی محبت اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔[2]

کامل فقیروں نے رُوح اور خدا کی محبت کو ظاہر کرنے کیلئے دو قسم کی مثالیں منتخب کی ہیں، جو خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ پہلی قسم کی مثالیں مادی دُنیا سے لی گئی ہیں۔ کنول اور سورج، کنول اور پانی، چاند اور سمندر، زمین اور پانی، چکوی اور سورج، چاند اور چکور، پپیہا اور بارش، شمع اور پروانہ، بھنورا اور پھول، مچھلی اور سمندر وغیرہ کی مختلف مثالیں دے کر اس محبت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ محبت جتنی قدرتی ہے اُتنی ہی بے اختیار اور پائیدار بھی۔ دوسری قسم کے رشتے جیسے باپ بیٹا، ماں بیٹا، مالک اور خادم، بیوی اور شوہر کے پیار پر مبنی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول مثال، بیوی اور شوہر کی ہے۔ اس رشتے میں محبت

۱؎ History of Sufism in India, p. 59-60.

۲؎ Ibid p. 79.

کا جذبہ کارفرما ہے۔ اِس رشتے میں مائیکے کے طور طریقے ، سُسرال کے طریقوں سے بالکل مختلف دکھائے گئے ہیں۔ سسرال میں عزت و مقبولیت حاصل کرنے کیلئے مائیکے کا لگاؤ ترک کرنا پڑتا ہے ، اور ہر طرح کی دُوسری محبت کو اپنے شوہر کی محبت میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ بیوی جس قدر اپنے آپ کو شوہر کی محبت میں جذب کرتی ہے ، اُتنی ہی وُہ دُوسرے ہر قسم کے پیار کے بندھنوں سے آزاد ہوتی جاتی ہے۔ رُوح کا خدا کے لئے سچا پیار یہی کام کرتا ہے۔ سنت نامدیو فرماتے ہیں کہ خدا کا عشق اِنسان کو دُنیاوی لگاؤ سے چھڑانے کی قدرتی طاقت رکھتا ہے ؎

نامے پریت نارائن لاگی ، سہج سُبھائے بھیو بیراگی

(آدگرنتھ صفحہ ۱۱۶۴)

مولانا رُوم اِسی نُکتے پر روشنی ڈالتے ہُوئے فرماتے ہیں کہ خدا کا عشق ہی دنیاوی لگاؤ سے نجات دِلا سکتا ہے :۔

عِشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت

ہر چہ جُز معشوق باقی جملہ سوخت (مثنوی رُوم جلد ۵ صفحہ ۶۹)

مطلب :۔ عشق وُہ شعلہ ہے۔ جب روشن ہوا ، معشُوق کے سوا سب کچھ جل گیا۔

حدیث میں بعینہٖ کہا گیا ہے :۔

اَلعِشقُ نَارٌ یُحرِقُ مَاسِوَی المَحبُوبُ

مطلب :۔ عشق کی آگ محبُوب کی یاد کے سوا کِسی کو دِل میں نہیں رہنے دیتی۔

یہی وجہ ہے کہ کامِل فقیروں نے " مذہب ، شرلعیت یا عقل و ادراک کی جگہ طریقِ عِشق کو ہی خدا کے وصال کا سچا راستہ قبول کیا ہے۔

خُدا کا عشق تمام اوصاف کی کان ہے۔ خُدائی محبت کی جڑ کے بغیر نیکی اور اخلاص کے درخت کبھی خوشنما ، مضبُوط اور تناور نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وُہ خوشگوار ، خُوبصورت اور میٹھے پھُول اور پھل لا سکتے ہیں۔ محبت کی کمی کِسی دُوسری شے سے پُوری نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی ہر کمی کی دوا محبت ہے ، لیکن محبت کی کمی کی دوا سوائے محبت کے اور کچھ نہیں۔

محبت سے پیدا ہوئے عمل میں جان ہوتی ہے، سرور ہوتا ہے۔ پیار سے خالی مجبوری میں کئے گئے اعمال میں نہ کوئی وصف ہوتا ہے، نہ ہی بھلائی۔ پیار بھرا عمل ہی صحیح معنوں میں مقدس عمل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقرائے کامل نے روحانیت کے پودے کو، شریعت، زہد اور خرد کے خشک ریگستان سے نکال کر، عشق و عقیدت کی خوشگوار و پُر لطف وادی میں لا اگایا ہے۔ اسی لئے سنت نامدیو، بابا فرید، گورو نانک اور دیگر سنتوں، عارفوں اور صوفی فقیروں نے "روح اور خدا" کے رشتہ کو بیوی اور شوہر، محبوب اور محبوبہ کے زندہ و جاوید رشتہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان سب کامل انسانوں کے کلام اور طریقِ عمل کی بنیاد عشق ہے۔ ان سب کے فلسفہ کا لُبِّ لُباب عشق ہے۔

سچا عشق عاشق کو مکمل طور پر محبوب کا محتاج بنا دیتا ہے۔ ایسا عشق ہی اس کے اندر صبر شکر، فقر، توکل اور رضا کی رغبت پیدا کرتا ہے اور عاشق دُکھ سُکھ کو اس محبوبِ حقیقی کی عنایت سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ہر حال میں خود کو محبوب کی یاد میں محو رکھتا ہے۔ وہ محبت میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ دُنیاوی نشیب و فراز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ "اس نیہوں دی اُلٹی چال" کافی میں سائیں جی صابر، زکریا، یحییٰ اور سلیمان کے حوالے دے کر بتلاتے ہیں کہ سچا عشق عاشقوں کے دلوں میں ہر طرح کے ترک، قربانی اور محبوب کی خاطر ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرنے کی لاانتہا طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ محبوب کی آنکھ کا اشارہ ہی تھا جس نے منصور کیلئے پھانسی کی تلخی کو بھی شہد کا پیالہ[1] بنا دیا ہے۔

آپ اشارہ اکھ دا کیتا، تاں مدھوا[2] منصور نے پیتا
سولی چڑھ کے درشن کیتا، ہوئیے عشق کمال
ایس نیہوں دی اُلٹی چال

محبوب کی تلاش میں جو بھی نکلتا ہے، ہنستے ہنستے اس کے لئے قربان ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے جگر کا لہو پیتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا کفن سی لیتا ہے، اور محبوب کی خاطر نبر میں پاؤں رکھنے

---

[1] "کیوں عشق اساں تے آیا اے" کافی میں آپ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ [2] شہد کا پیالہ۔

سے دریغ نہیں کرتا ہے

۱۔ ساجن کی بھال سر دیا، لہو مدھ آپنا پیا
کفن باہوں سے سی لیا، لحد[۱] میں پا آنائے گا
بُلھا شوہ عشق ہے تیرا، اُسی نے جی لیا میرا
میرے گھر بار کر پھیرا، دیکھاں سر کون والے گا
۲۔ جے کوئی عِشق وہاجھیا لوڑے[۲]، سِر دیوے پہلے سائیں نوں[۳]
کدی آ ل برہوں ستائی نوں

دُوئی کے پردے چاک کر کے وحدت میں پہنچانے والی طاقت عشق ہے عاشق خُودی، کو محبُوب کے عشق میں اس طرح فنا کر دیتا ہے کہ اس کی رَگ رَگ سے "پیا پیا" کی پکار اُٹھتی ہے ؎

عشق کی تیغ سے مُوئی، نہیں وُہ ذات کی دُوئی
اور پیا پیا کر مُوئی، موئیاں پھر رُوح جیائے گا

عشق عاشق کے اندر عاجزی، حلیمی، انکساری اور بُردباری پیدا کرتا ہے، کیونکہ اس کو اپنے محبُوب کی پیدا کی ہُوئی مخلوق بھی پیاری لگتی ہے۔ عشق ہی اس کو دُشوار راستہ طے کرنے اور تلوار کی دھار پر چلنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ عشق ہی اس کی جُستجو کو مُسلسل قائم رکھتا ہے اور راستہ کی دُشوار گزار گھاٹیوں کو عبُور کرتے ہُوئے منزل تک پہنچنے کی طاقت دیتا ہے۔ عشق عاشق کو عقل و

---

[۱] گور: نمبر[۲] وہاجھیا لوڑے: بیوپار کرنا چاہتا ہے۔
[۳] اِس بارے میں سرمد کہتا ہے:۔

تا نیست نہ گردی رہِ ہستن نہ دہند
ایں مرتبہ با ہمتِ پستن نہ دہند

اگر تُو نے اپنی ہستی نابُود نہ کی۔ تو تیرے لئے "نیستی" یعنی لاالحاد، ہستی کا دروازہ نہیں کُھل سکتا، کیونکہ یہ مرتبہ پست ہمت والوں کو نہیں دیا جاتا۔ [۴] پار اُتارے گا۔

خرد بالائے طاق رکھ کر مکمل طور پر اپنے محبوب کی پناہ میں آنے کا طریق سکھلاتا ہے۔ اِن اوصاف سے خوش ہو کر محبوب خود ہی اپنے عاشق کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ بُلھے شاہ نے اس کیفیت کو عاشق نے "ہری جیتا" کا نام دیا ہے۔ عاشق محبوب کے تصور میں اِس طرح کھو جاتا ہے کہ وُہ اپنی خودی اور الگ ہستی کو محبوب میں فنا کر کے ہُو بہُو محبوب کی ہی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ؎

ہُن مینُوں مجنوں آکھو ناں، دِن دِن لیلےٰ مُنہدا جاں
ڈیرا یار بنائے تاں، ایہہ تن بنگلہ بنایا اے

ہمہ اوست

ہندو نہیں، نہ مسلمان

سائیں بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ میرا محبوب نہ صرف ساری مخلوق کا خالق ہے۔ بلکہ وہ اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں سمایا ہوا ہے۔ اور وہ خود ہی اپنا کھیل دیکھ کر مسرور ہو رہا ہے۔ سائیں جی کے لئے جو کچھ ہے محبوب سے ہے، ہر شے میں وہی سمایا ہوا ہے اور جو کچھ دکھائی دیتا ہے اُسی کا جلوہ ہے۔ اِس کو صوفی درویشوں نے 'ہمہ اوست'، ہمہ از وست یا وحدۃ الوجود' کا نام دیا ہے۔ سائیں بلھے شاہ جذبہ سے بھرپور انداز میں اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

پردہ کس توں راکھی دا ، کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا
پہلوں آپے ساجن ساجے دا ، ہُن دسنا ایں سبق نمازے دا
ہُن آیا آپ نظارے نوں ، وِچ لیلیٰ بن بن جھاکی دا
ہُن ساڈے وَل دھایا اے ، نہ رہندا چھُپیا چھپایا اے
کِتے بلھا نام دھرایا اے ، وِچ اوہلا رکھیا خاکی دا

وُہ محبوب ایسا بہروپیا ہے جو ہر اداکار میں کھیل رہا ہے۔ وُہ ایسا پتلی گر ہے جو بے شمار پُتلیوں میں سے ہو کر ناچ رہا ہے۔ انسان، حیوان، چرند، پرند غرضیکہ سب میں اُس کے نور کا ظہور ہے۔ قاتل اور مقتول، آقا اور غلام، شاہ اور گدا، جوگی اور بھوگی، سب میں اسی کا نور جلوہ گر ہے۔ یہ مرشدِ کامل کی بزرگی کا کمال ہے، جو لا انتہا کثرت کو مکمل وحدت کے دھاگے میں پروئی ہوئی دیکھنے کی ترکیب سکھلاتا ہے۔

آپے آہو آپے چیتا، آپے مارن دھایا
آپے صاحب آپے بردا، آپے مُل وِکایا
کدی ہاتھی تے اسوار ہویا، کدی ٹھوٹھا ڈانگ بھوایا
کدی راول جوگی بھوگی ہوکے، سانگی سانگ بنایا
بازی گر کیا بازی کھیلی، مینوں پُتلی وانگ نچایا
میں اس پڑ تالی نچدا ہاں، جس گت مت یار لکھایا
ڈھولا آدمی بن آیا

اس پہلو سے آپ کی کافیاں، "کیہنوں لامکانی دسدے ہو"، "ذرہ ذرہ دے عشقا ماریا ای" اور "کی کردا بے پرواہی جے"، عجیب مستی کے عالم میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ "کیہنوں لامکانی دسدے ہو" کافی میں آپ کہتے ہیں ؎

آپ سُنیں تے آپ سناویں، آپے گاویں آپ بجاویں
تینھوں قول سرود سناویں، اناالحق دی تار ہلاویں
سولی تے منصور چڑھاویں، اوتھے کول کھلوکے تکدے ہو
کتے رومی ہو کتے زنگی ہو، کتے ٹوپی پوش فرنگی ہو
کتے میخانے وچ بھنگی ہو، کتے دہر دہری بن دسدے ہو
کیہنوں لامکانی دسدے ہو

خود ہی مرنے والا ہرن اور خود ہی مارنے والا چیتا، خود ہی منصور کو سولی پر چڑھانے والا اور خود ہی ایک طرف تماشائی بن کر ہنسنے والا؛[1] یہ اندازِ بیان محض شاعرانہ نازک خیالی نہیں بلکہ کامل فقیروں کا زندہ روحانی مشاہدہ ہے۔ جب جلاد سرمد کو قتل کرنے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے کر آیا، تو وحدت کی مستی میں مخمور سرمد جلاد سے کہہ اٹھا: "میرے محبوب! میں تجھ

[1] آپ ہی مرنے والا ہرن ہے اور آپ ہی مارنے والا چیتا ہے۔

پر تو بان ہُوں، آجا! آجا کہ تو جس صُورت میں بھی آئے، میں ہر شکل میں تجھے بخوبی پہچان لیتا ہوں۔

فدائے تو شوم، بیا! بیا! کہ تو بہر صُورتے کہ می آئی من تُرا خوب می شناسم"

دسویں نامور صُوفی نوشاہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ توحید یا وحدۃ الوجود کے پیروکار درویش اپنے مخالفین کے ساتھ بھی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے تھے[۵۵] کیونکہ ان کو ہر قالب میں ایک ہی نور جلوہ گر دکھائی دیتا تھا۔

تاریخ کے صفحات بے شمار خدا رسیدہ کامل درویشوں کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں، جنہوں نے اپنے قاتل میں بھی اپنے محبوب کا جلوہ دیکھا۔ وہ حقیقی عاشق تھے جن کی آنکھوں پر لگا دُوئی کے کفر کا پردہ چاک ہو چکا تھا، اور وہ سر بہ سر وحدت میں فنا ہو چکے تھے۔ کبیر صاحب فرماتے ہیں کہ مالک کا سچا خادم یا پرستار وہی ہے جو کثرت کے پردے میں چھپی وحدت کا دیدار کرتا ہے ؎

اوّل اللہ نور اُپائیا، قدرت کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اُپجیا، کون بھلے کون مندے
لوگا بھرم نہ بھولو بھائی
خالق خلق خلق مہہ خالق پور رہیو سرب ٹھائیں
ماٹی ایک انیک بھانت کر ساجی ساجن ہارے
نہ کچھ پوچ ماٹی کے بھانڈے نہ کچھ پوچ کمہارے
سبھ میں ساچا ایکو سوئی تس کا کیا سبھ کچھو ہوئی
حکم پچھانے سو ایکو جانے بندا کہیئے سوئی
اللہ الکھ نہ جائی لکھیا گورو گڑ دینا میٹھا
کہہ کبیر میری سنکا ناسی سرب نرنجن ڈیٹھا

(آدگرنتھ، صفحہ ۱۳۴۹)

---

۵۵ A History of Sufism in India, V. II, P, 439.

سنت نام دیو جی اسی خیال کو اپنے پیرائے میں "سبھ گوبند ہے، سبھ گوبند ہے۔ گوبند بن نہیں کوئی" اور گھٹ گھٹ انتر سرب نرنتر کیول ایک مُراری" کہہ کر بیان کرتے ہیں ؎

سبھ گوبند ہے سبھ گوبند ہے، گوبند بن نہیں کوئی
سوت[1] ایک منی ست سہنس جیسے، اوت پوت پربھ سوئی
جل ترنگ اُر پھین بدبدا، جل تے بھن نہ ہوئی
....
کہت نامدیو ہری کی رچنا، دیکھو ردے بچاری
گھٹ گھٹ انتر سرب نرنتر، کیول ایک[3] مُراری

(آدگرنتھ صفحہ ۴۸۵)

گورُو نانک صاحب فرماتے ہیں۔ کہ وُہ ایک صاحب انیک رنگوں میں ہر جگہ ظہور پذیر ہے۔ وُہ آپ ہی رسیلا ہے، آپ ہی رس ہے اور آپ ہی رسیا یعنی رس سے لطف اندوز ہونے والا ہے۔ دُلہن، سیج اور دُولہا بھی وُہی ہے۔ مچھیرا، مچھلی، پانی اور جال بھی وُہی ہے۔ تالاب بھی وُہ خود ہے اور ہنس بھی خود آپ ہے۔ دِن کو کھِلنے والا کنول بھی وُہی ہے، رات کو کھِلنے والی کمودنی بھی وُہی ہے۔ اور ان کو دیکھ کر خوش ہونے والا بھی وُہ آپ ہی ہے ؎

آپے رسیا آپ رس آپے راون ہار
آپے ہووے چولڑا[4] آپ سیج بھتار
رنگ رتا میرا صاحب رو رہیا بھرپور۔ رہاؤ
آپے ماچھی مچھلی آپے پانی جال
آپے[5] جال منکڑا آپے اندر لال
....
پرہ نوں[6] نانک بینتی تو سرور تو ہنس
کول[7] تو ہے کویّا[8] تو ہے آپے دیکھ وگس (محلہ ۱، صفحہ ۲۳)

---

[1] سینکڑوں ہزاروں موتی ایک سوت میں پروئے ہوئے ہیں۔ [2] لہریں، جھاگ اور بلبلے سب پانی کی صورتیں ہیں۔ [3] عورت [4] دُولہا [5] جال کو بھاری کرنیوالا منکا اور مچھلی کے پیٹ سے نکلنے والا لعل بھی وُہی ہے۔ [6] کنول کا پھول [7] گُلِ شب، جو رات کے وقت کھِلتا ہے۔

پلٹو صاحب نے بھی کائنات کی کثرت میں سمائی ہوئی اللہ کے نور کی وحدت کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے ؎

جگن ناتھ جگدیس ، جگ میں ویاپ رہا
چارے کھانی میں لکھ چوراسی. اور نہ کوئی دوجا
آپوئی ٹھاکر آپوئی سیوک . کرت اپنی پوجا
آپوئی داتا آپوئی منگتا . آپوئی جوگی بھوگی
آپوئی لیتا آپوئی بسنی . آپ بید آپ روگی
برہما بشن مہیش آپوئی . سُر نر مُنی ہوئیا
آپو سہ برہم بِد ویم گاوے . آپو سہ پر پریت مائیا
آپوئی کارن آپوئی کاج . بِسو رُوپ درسائیا
پلٹو داس درشٹ تب آئے . سنت کرے جب دائیا

(بھاگ ۳ ، شبد ۱۰)

اِسی موضوع پر ایک صوفی فقیر نے کیا خوب کہا ہے :-

ہم کوزہ و ہم گِلِ کوزہ و ہم کوزہ گر
وبر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد

وُہ خود ہی کوزہ ہے، خود ہی اُس کی مٹی اور خود ہی کوزہ بنانے والا. اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ وُہ خود ہی خریدار کی شکل میں آجاتا ہے.

سائیں بُلھے شاہ نے کافی "سبھ اِکو رنگ کپاہیں دا" میں اِس خیال کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جس طرح ایک کپاس طرح طرح کے کپڑوں کو اور ایک چاندی کئی قسم کے زیورات کو جنم دیتی ہے اُسی طرح کائنات میں مختلف شکلوں کے پسِ پردہ ایک ہی حقیقت کارفرما ہے۔

چونسی پینسی کھدر دھوتر . ململ خاصہ اِکا سوتر[۲]

۱؎ طوائف بھی آپ ہی ہے ۔ بھوگی بھی آپ ہی ہے. ۲؎ جس کے بننے میں چار یا پانچ سو دھاگے لگیں.

ٹونی وِچّوں باہر آوے ۔ بھگوا ویس گسائیں دا
کُرڑیاں سَیتھیں چھاپاں چھلے ۔ آپو اَپنے نام نسوتے
ستھا ہکا چانڈی آکھو ۔ کنگن چُوڑا باہیں دا

" پا یا ہے کچھ پایا ہے" کافی میں آپ نے اس خیال کی تفصیلاً تشریح کی ہے ۔

پایا ہے کچھ پایا ہے ۔ ستگور نے الکھ لکھایا ہے
کہوں ویر پڑا کہوں بیلی ہے ۔ کہوں مجنوں ہے کہوں لیلی ہے
کہوں آپ گورو کہوں چیلی ہے ۔ سب اپنا راہ دکھایا ہے
کہوں مسجد کا ورتارا ہے ۔ کہوں بنیا ٹھاکر دوارا ہے
کہوں بیراگی جٹ دھارا ہے ۔ کہوں شیخن بن بن آیا ہے
کہوں ترک کتاباں پڑھتے ہو ۔ کہوں بھگت ہندو جپ کرتے ہو
کہوں گور کنڈی[2] میں پڑتے ہو ۔ ہر گھر گھر لاڈ لڈایا ہے

یہ کیفیت اُن حقیقی عاشقوں کی ہے ۔ جو اپنے آپ کو فنا کر کے خداوند کریم میں جذب کر لیتے ہیں ۔ ان کو عملی طور پر اس کا جلوہ ہر طرف دکھائی دیتا ہے ۔

بلھا ! شوہ کا میں محتاج ہوا ۔ مہاراج ملے میرا کاج ہوا
درشن پیا دا میرا علاج ہوا ۔ لگا عشق تاں ایہہ گن گایا ہے
ستگور نے الکھ لکھایا ہے ۔

آپ" دو ہیں جہانی کوئی نہ دسدا غیر" اور" بلھا سائیں گھٹ گھٹ رویا" کے زوردار نعرے لگا کر یہ خیال پختہ کروانا چاہتے ہیں کہ مذہب و ملت کی بڑائی کا غرور لاعلمی اور جہالت سے پیدا ہوتا ہے ۔ رنگ و نسل ، ملک و قوم ، مرد و زن کی تفریق وہ کرتے ہیں ۔ جو ہر جاندار شئے میں کارفرما ایک ہی حقیقت سے بے بہرہ ہیں ۔ چند لوگوں کا اپنے آپ کو رب کے خاص بندے سمجھنا یا کسی قوم ، مذہب ، ملک کا اپنے آپ کو خدا کی خاص رحمت کا حقدار مان لینا یا قرار دینا بے عقلی ہے ۔ خدا نے انسان

---

[1] وِرس کے لئے دیکھو " قانونِ عشق" صفحہ ۲۰۶ کافی ۵۸) ۔ [2] گور کھ دھندہ ۔

پیدا کیا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو قوموں، مذہبوں، مُلکوں میں تقسیم کر کے ہزار ہا قسم کے فضول جھگڑے پیدا کر لئے ہیں۔ سائیں جی یہاں تک کہتے ہیں کہ کافر اور مومن کا جھگڑا کھڑا کرنا ہی سب سے بڑا کُفر ہے۔ کیونکہ دُوئی یا دوبیت سے بڑا کفر اور کیا ہو سکتا ہے؟ (اَلرُّوحُ مِنْ اَمرِ رَبّی) یعنی رُوح اللہ کا جُزو ہے اور عشقِ اللہ ہی رُوح کی سچی ذات یا مذہب ہے۔ یہی خدا سے وِصال کا ذریعہ ہے۔ مذہبوں مُلکوں یا ذاتوں کا تکبر نہیں۔

۱۔ اَلیسا جگیا گیان پلیتا
نہ ہم ہندو نہ تُرک ضروری۔ نام عشق کی ہے منظوری
عاشق نے ہر جیت

۲۔ ہندو تُرک نہ ہُندے ایسے۔ دو جنے تڑے جنے
حرام حلال پچھاتا ناہیں۔ دو ہاں تے نہیں بھرمے
گورو پیروی پرکھا سانوں۔ سبھناں توں سر واریں

۳۔ مومن کافر مینوں دوویں نہ دسدے۔ وحدت دے وچ آ کے

اللہ تعالےٰ کی ذات ہی کو ہر شئے میں دیکھنا تصوّف کی اصل کسوٹی ہے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:۔ ہرگز یہ نہ کہو کہ کعبہ بُت خانہ سے بہتر ہے۔ جس جگہ بھی اُس محبوب کا جلوہ عیاں ہے وُہی جگہ مبارک ہے۔ ؎

ہرگز مگو کہ کعبہ زبُت خانہ بہتر ست
ہر جا کہ ہست جلوۂ جاناناں خوشتر ست

آپ فرماتے ہیں: کوئی تُرکی ہے کہ تازی۔ اس بات کی پروا نہ کر۔ تو ہر زبان میں اُس محبوبِ الٰہی کی محبت بھری داستان سُن۔ کیونکہ مندر اور مسجد کے پردے کے پیچھے وُہی ایک محبوب جلوہ فگن ہے۔ آپ پُوچھتے ہیں کہ اگر دو پتھروں کا رنگ جُدا جُدا ہو تو کیا اُن میں سے نکلنے والی آگ کا رنگ بھی جُدا ہو گا؟ جب مندر اور مسجد دونوں ایک ہی نُور سے روشن ہیں، تو پھر معلوم نہیں کُفر اور دین کا جھگڑا کس بنا پر کیا جاتا ہے؟

۱۔ یکبیت ترکی و نازی دریں معاملہ حافظ
حدیث عشق بیان کن بہر زباں کہ تو دانی
نیست غیر از یک صنم در پردۂ دیر و حرم
کے شود آتش دو رنگ از اختلاف سنگہا

۲۔ از یک چراغ مسجد و بت خانہ روشن است
در حیرتم کہ دشمنئ کفر و دیں چراست

آپ فرماتے ہیں کہ جس روز سے میں نے مذاہب کے جھگڑے دیکھے ہیں، میرا نہ شیخ سے کوئی تعلق رہا ہے، نہ برہمن سے سروکار ہے

از آنروز یکہ دیدم اختلافِ مذہب و ملت
مرا با شیخ ربطے نیست و نے با برہمن ھم

کبیرؔ صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ فضیلت خدا کے عشق اور اس کی عبادت میں ہے۔ ذات پات میں نہیں ہے۔ ے

جات پات پوچھے نہ کو ، ہر کو بھجے سو ہر کا ہو

پلٹوؔ صاحب نے بھی یہی تعلیم دی ہے ے

پلٹو اونچی جات کا جن کوئی کرے ہنکار
صاحب کے دربار میں کیول بھگتی پیار

سائیں بلھے شاہ بھی کہتے ہیں، کہ خدا کی درگاہ میں فضیلت اعمال کی ہے۔ ذات پات کی نہیں :۔ عملاں اُتے ہون نبیڑے۔ کھڑی رہن گیاں جاتاں

مولانا رومؔ نے اس گڈریئے کی داستان لکھی ہے جس نے کہا تھا: "اے ربّ! اگر تو مجھے مل جائے تو میں تجھے اپنی بھیڑوں کا دودھ پلاؤں اور بھیڑوں کی اون کا کمبل اوڑھاؤں ..... موسیٰؑ نے اسے ڈانٹا کہ ربّ سے اس طرح مخاطب نہیں ہوتے۔ اِس بات سے اُس معصوم کا دِل ٹوٹ گیا۔ وُہ گھبرا گیا کہ شاید اس سے کوئی بڑا گناہ ہو گیا ہے۔ اِس پر ربّ نے موسیٰؑ کو کہا: "میں

نے تجھے دِل جوڑنے کے واسطے بھیجا تھا، دِل توڑنے کے لئے نہیں۔ میں نے ہر بشر کو علیحدہ علیحدہ لہجہ اور محاورہ عطا کیا ہے جو دُوسروں کو چاہے پسند نہ ہو، اس کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ ہندیوں کے لئے ہندوستانی محاورہ مُبارک ہے، سندھیوں کے لئے سِندھی محاورہ۔ اُن کی تعریف سے مَیں عظیم یا قابلِ پرستش نہیں بنتا۔ برخلاف اِسکے وُہ میری تعریف و تحسین سے عظیم یا پرستش کے قابل بنتے ہیں۔ میں زبان یا تلفظ نہیں دیکھتا، اندرُونی احساس یا دل کی کیفیت دیکھتا ہُوں"۔[1]

کامِل فقیروں اور خُدا رسیدہ سنتوں مہاتماؤں نے دُنیا میں آدمی آدمی کے درمیان انسانی بھائی چارہ (Brotherhood of Mankind) پیدا کرنے کیلئے ہی یہ ضرُوری سمجھا ہے کہ خُدا کو سب کا باپ مانا جائے۔ اِس پدری احساس (Fatherhood of God) کی بنیاد کے بغیر انسانی بھائی چارے کے احساس کا محل کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ گُورو ارجن دیو جی فرماتے ہیں ۔

ایک پِتا ایکس کے ہم بارک

(محلہ ۵، صفحہ ۶۱۱)

گُورو امرداس جی فرماتے ہیں کہ جب خالق ایک ہے اور سب میں اُسی "کرتا" کا نُور سمایا ہُوا ہے تو بُرا کِس کو کہا جاسکتا ہے ۔

جِیہ جنت سبھ تِس دے سبھناں کا سوئی
مندا کِس نو آکھیئے جے دُوجا ہوئی

حضرتِ عیسیٰؑ نے فرمایا ہے: "سب سے اوّل اور مقدّس حکم یہ ہے کہ تُم مکمل طور پر اپنے دِل و جان سے مالکِ کُل سے محبّت کرو: دُوسرا حکم جو پہلے جیسا ہی ہے کہ تُم اپنے ہمسائے سے ایسی ہی محبّت کرو جیسی خود سے کرتے ہو۔ سبھی مذہب اور سب پیغمبر انہی دو اصُولوں کے سہارے قائم ہیں۔"[2] آپ اپنے متعلق کہتے ہیں: آدمؑ کا بیٹا لوگوں کی زندگی تباہ کرنے کے واسطے نہیں

---

[1] History of Sufism in India, vol. I, P. 82-83.

[2] Thou shalt love the Lord thy God with all thy heart and with all thy soul, and with all thy mind. This is the first and great commandment. And the second is like unto it, Thou shalt love thy neighbour as thyself. On these two commandments, hang all the law and the prophets. (Matthew 22 : 37-40)

آیا، بلکہ اُن کو بچانے کیلئے آیا ہے[1]۔ پھر فرماتے ہیں: "مجھے رحم پسند ہے قربانی نہیں"[2]۔
سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ مذہبوں اور عبادت گاہوں اور الگ الگ قسم کی پرستش کے جھگڑے حقیقت سے بے بہرہ اور خود غرض لوگوں کے پیدا کئے ہُوئے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ رب کے سچے عاشقوں کا صُلح کُل وطیرہ سب کے ساتھ ایک جیسے پیار کا ہوتا ہے۔ انہیں سب مذہبوں، قوموں، ذاتوں کے لوگوں میں ایک خُدا کا نُور دکھائی دیتا ہے۔

۱۔ کِتے رام داس کِتے فتح محمد ایہو قدیمی شور
مُسلمان سوے توں چڑدے ہندُو چڑدے گور
مُک گئے سب جھگڑے جھیڑے، نِکل پیا کوئی ہور

۲۔ ہندُو نہیں، نہ مُسلمان، بہیئے ترنجن، تج ابھمان
سُنی نہ، نہیں ہم شیعا، صُلح کُل کا مارگ لیا
بُلھے شاہ! جو ہر چِت لاگے، تُرک اور ہندُو دُوجن تیاگے

ابن العربی قرآن شریف (۲ : ۱۱۵) کے حوالے سے کہتے ہیں، کہ مشرق اور مغرب سبھی طرف ایک ہی خُدا کا نُور پھیلا ہوا ہے، اس لئے مومن یا بُت پرست کا فرق لاعلمی کا پیدا کردہ ہے[3]۔
پلٹو صاحب بھی ہدایت کرتے ہیں، کہ مشرق، مغرب اور ہندو مُسلمان، کے جھگڑے کھڑے کرنا فضول ہے، کیونکہ اصل میں سب میں ایک ہی خُدا سمایا ہوا ہے ؎

پُورب میں رام ہے پچھم خدائے ہے
اُتر اور دکھن کہو کون رہتا
صاحب وُہ کہاں ہے، کہاں پھر نہیں ہے
ہندُو اور تُرک طوفان رہتا

۱؎ The son of man is not come to destroy men's lives, but to save them. (Luke 9:56)
۲؎ I will have mercy, and not sacrifice. (Matthew 9: 13)
۳؎ **History of Sufism in India,** V. II, p. 50.

ہندو اور تُرک مِل پڑے ہیں کھینچ میں
اپنی برگ[1] دوؤ دین بہتا
داس پلٹو کہے صاحب سب میں رہے
جُدا نہ تنک[2] میں سانچ کہتا

(بھاگ ۲ - ریختہ ۱۰)

گورو گوبند سنگھ جی فرماتے ہیں کہ جس طرح سب مذہبوں، مُلکوں اور قوموں کے لوگوں کی جسمانی بناوٹ اُنہی پانچ عناصر (پانی، مٹی، آگ، ہوا اور آسمان) سے ہے، اور سب کے ہاتھ پاؤں، ناک، مُنہ آنکھیں ایک جیسی ہیں، اُسی طرح اُن کے اندر سمایا ہوا خُدا بھی ایک ہی ہے یعنی ایک ہی نُور مختلف شکلوں میں رونما ہے۔

دیہرہ مسیت سوئی پُوجا او نواج اوئی
مانس سبھے ایک پے انیک کو بھرماؤ ہے
دیوتا ادیو جچھ گندھرب تُرک ہندو
نیارے نیارے دیس کے بھیس کو پربھاؤ ہے
ایکے نین ایکے کان ایکے دیہہ ایکے بان
خاک[3] باد آتش او آب کو رلاؤ ہے
اللہ ابھیکھ سوئی، پوران او قرآن اوہی
ایک ہی سروپ سبھے ایک ہی بناؤ ہے

---

[1] برگ = ورگ = جماعت۔

[2] تنک = ذرا بھی

[3] خاک = مٹی - باد = ہوا - آتش = آگ - آب = پانی - آپ کا اشارہ پانچ عناصر کی طرف ہے، جن کی ترتیب سے انسانی قالب بنتا ہے۔

مولانا رومؒ نے توحید کا کتنا خوبصورت پیغام دیا ہے ؎

غیرِ اُو را از نظر بیروں فگن، چشمِ دل نہ بر جمالِ ذُو المنن

کیست دیگر در جہاں غیر از خدا، از چہ احول گشتۂ اے ژاژ خا!

خود توئی گر غیرِ حق خُود را بسُوز، چشمِ دل بر وحدہٗ ہر دم بدُوز

مطلب: تُو خدا کے سِوا غیر کو نظر سے باہر پھینک دے۔ تُو ہمیشہ رحیم و کریم خدا کے حُسن و جمال پر اپنا ایمان لا۔ دُنیا میں خدا کے سِوا کون ہے؟ اے نااہل تُو بھینگا[1] کیوں بن گیا ہے؟ اگر تُو خُود کو خدا سے جُدا سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو آگ کی نذر کر دے۔ تُو دل کی آنکھ ہمیشہ اس ایک کے اُوپر رکھ۔

سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ ایسے مُرشدِ کامل اور رب کے سچے عاشق کی تلاش کرنی چاہئے جو بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو دُوئی کے کُفر سے چھڑا کر وحدت کے رنگ میں رنگتا ہو۔ ؎

چلو دیکھئے اُس مستانڑے نُوں، جہدی ترنجناں دے وِچ پئی اے دُھم
اوہ[2] تے مئے وحدت وِچ رنگدا اے، نہیں پُچھدا ذات دے کی ہو تُم

---

[1] آپ اشارتاً یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ جس انسان کی نظر خراب ہو اُس کو ایک کے دو دو نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جاہل کو دُوئی نظر آتی ہے۔

[2] مئے۔ شراب۔ وُہ بلا تفریق ہر ایک کو وحدت کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

تلاشِ محبوب

محبوب تمہارے اندر ہے

سائیں بُلّھے شاہ بے خبر ہیر (رُوح) کو خبردار کرتے ہُوئے فرماتے ہیں کہ جس رانجھے (خُدا) کو تُو باہر تلاش کر رہی ہے وُہ تیرے اندر ہے۔ ؎

بُھلّی ہیر ڈھوڈیندی بیلے[1]، رانجھن یار بُکّل[2] وِچ کھیلے
مینوں سُدھ بُدھ رہی نہ سار[3]، عِشق دی نَوِیُوں نویں[4] بہار

"میری بُکّل دے وِچ چور سادھو۔ کِس نُوں کُوک سُناواں" اور "مُنہ آئی بات نہ رہندی اے" وغیرہ کافیوں میں یہ خیال بار بار دوہرایا گیا ہے کہ گھر میں گُم ہُوئی شے گھر میں ہی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ باہر بھٹکنے اور خوار ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رب کے سچے عاشق باہر ٹکریں مارنے کی بجائے اُسے اپنے اندر تلاش کرتے ہیں۔ ؎

جِس پایا بھیت قلندر دا، راہ کھوجیا اپنے اندر دا
اوہ واسی ہے سُکھ مندر دا، جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی اے
اِک لازم بات ادب دی اے، سانوں بات مَلُومی سب دی اے
ہر ہر وِچ صُورت رب دی اے، کِتے ظاہر کِتے چھپیندی اے
ایتھے دُنیا وِچ ہنیرا اے، ایہہ تِلکن بازی ویہڑا اے
وڑ اندر ویکھو کیہڑا اے، کیوں خلقت باہر ڈھونڈیندی اے

پھر کہتے ہیں ؎

---

[1] جنگل [2] گود [3] خبر [4] نوِیُوں نویں بہار = نئی سے نئی خوشی۔ [5] بے عقل عورت (ہیر یعنی رُوح)

بُلھا شَوہ اساں تھیں وکھ[1] نہیں
بِن شَوہ تھیں دُوجا کجھ[2] نہیں
پَر ویکھن والی اَکھ نہیں
تاں ہی جان جُدائیاں سہندی اے
مُنہ آئی بات نہ رہندی اے

وُہ مالک ہر وجُود میں رہتا ہے، لیکن خوش قسمت ہے وُہ قلب جہاں وُہ آشکار ہو چکا ہے۔

سب گھٹ میرا سائیاں سُونی سیج نہ کوئے
بلہاری وا گھٹ کے جا گھٹ پرگٹ ہوئے (کبیر)

سائیں جی نے عام طور پر جسم کو گھر یا آنگن کہا ہے۔ آپ کہتے ہیں: وُہ محبوب اِس گھر میں رہتا ہے لیکن اُس کو پکڑ پانا بہت مشکل ہے ۔

اوہ گھر میرے وِچ آیا، اُس آ مینوں بھرمایا
پُچھو جادُو ہے کہ سایا، اُس توں لَو حقیقت ساری

خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے کہ پرستش گاہوں کو ترک کر کے اپنے اندر خدا کی تلاش کر

تگا پوئے حرم تا کے خیال از طبع بیروں کُن
کہ محرم گر شوی ذاتت حقائق را حرم گردد

تُو کتنی دیر حرم کے گرد طواف کرے گا؟ یہ خیال اپنے دِل سے نکال دے۔ اگر تجھے اپنی ذات کا عِلم ہو جائے تو حقیقت ہی تیرا حرم بن جائے۔

جسم خُدا کا گھر ہے۔

آپ نے انسانی وجُود کو خُدا کا گھر (ٹھاکر دوارا) اور ہری مندر بھی کہا ہے۔ اُس خُدا نے اپنے رہنے کے لئے خود اس کو بنایا ہے۔ سچے عاشق کی الف، ب، ہی یہ ہے کہ رَب باہر مندروں

---

۱ الگ۔ ۲ کچھ نہیں۔

مسجدوں، گرجا گھروں وغیرہ میں نہیں بلکہ انسانی وجود کے اندر بستا ہے۔ باہر کے ٹھاکر دواروں میں نقلی شنکھ اور گھڑیال بجائے جاتے ہیں، لیکن جسم کے ٹھاکر دوارے میں وُہ انحد ناد گونج رہا ہے جس کا کوئی اوّل و آخر نہیں۔ بیرونی مندروں مسجدوں میں تو مٹی کے چراغوں میں تیل جلایا جاتا ہے، لیکن اس مسجد میں مالکِ کُل کے نُور کی آسمانی تجلی روشن ہے۔

جاں میں سبق عشق دا پڑھیا، مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا، جتھے وجدے ناد ہزار
بید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے، سجدے کردیاں گھس گئے متھے
ناں رب تیرتھ نہ رب مکّے، جس پایا تِس نُور انوار
عشق دی نویوں نویں بہار

انجیل میں ذکر ہے: "تم (بُرے اعمال کا) پچھتاوا کرو۔ خُدا بالکل نزدیک ہے"[1] "خُدا کی بادشاہت تمہارے اندر ہے"[2] "زمین و آسمان کا مالک انسانی ہاتھوں سے بنائے مندروں میں نہیں رہتا۔ نہ ہی انسانی ہاتھوں سے اس کی پرستش کی جا سکتی ہے"[3]

خواجہ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری (۱۰۰۶ تا ۱۰۸۹) لکھتے ہیں: "مٹی و پانی سے بنا بیرونی کعبہ حضرت ابراہیمؑ نے بنایا، لیکن اندرونی دِل و جان کا قُدرتی کعبہ خُداوند کریم کے نُور سے بھرپور ہے۔ خُدا کی راہ میں دو پرستش گاہیں ہیں، باہر کا بناوٹی کعبہ اور اندر کا قُدرتی کعبہ۔ تُم اندرونی کعبہ میں خُدا کی پرستش کرنے کی کوشش کرو"[4]

شمس تبریز انسانی وجود کی اہمیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

[1] Repent : for the Kingdom of heaven is at hand. (Matthew 4 : 17)

[2] Kingdom of God is within you. (Luke 17 : 21)

[3] Lord of heaven and earth, dwelleth not in temples made with hands ; Neither is worshipped with men's hands (Acts 17:24, 25)

[4] **History of Sufism in India**, V. I, p. 78.

تن را چہ مشت کاہ داں در زیر او دریائے جاں
گرچہ ز بیروں ذرّۂ صد آفتابی از دروں

تُو اپنے جسم کو تنکوں کی محض ایک مُٹھی سمجھ۔ لیکن اِس کے نیچے زندگی کا سمندر بہہ رہا ہے۔ اگرچہ بیرونی طور پر تُو ایک ذرّہ ہے۔ لیکن اندرُونی طور پر تُو سَو سُورجوں کے برابر ہے۔
پلٹُو صاحب کہتے ہیں ؎

صاحب صاحب کیا کرے صاحب تیرے پاس
صاحب تیرے پاس یاد کر ہووے حاضر
اَندر دَھس کے دیکھ مِلے گا صاحب نادر (حِصّہ ۱، کنڈلی ۹۳)

وجُود اصلی مکّہ اَور کعبہ ہے۔

سائیں جی نے جسم کو سچّا مکّہ اَور پیشانی کو اس کی محراب کہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ بیرُونی مکّے کا حج کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ قالب ہی وُہ حقیقی مکّہ ہے جس کے اندر مالکِ کُل کا جمال دیکھا جا سکتا ہے ؎

"حاجی لوک مکّے نُوں جاندے، میرے گھر وِچ نوشوہ مکّہ"

اِسی طرح آپ کہتے ہیں ؎
مَتھّے محراب لکائیوائی[۱]

---

[۱] ماتھے کو محراب کئی کامل فقیروں نے کہا ہے۔ ماتھے کی بناوٹ محراب جیسی ہے۔ اس کے اندر اس مالک کا قدرتی نُور برس رہا ہے اَور ندائے سُلطانی کی سُریلی دھن دِن رات اُٹھ رہی ہے۔ حضُور تُلسی صاحب نے فرمایا ہے کہ قدرتی کعبہ (ماتھے کی محراب میں توجہ سے سُنو تو وہاں مالک کی درگاہ سے آ رہی کلمہ کی آواز سنائی دینے لگے گی ؎

قدرتی کعبے کی تُو محراب میں سُن غور سے۔ آ رہی دُھر سے صدا تیرے بُلانے کے لئے

ایک اَور جگہ آپ کہتے ہیں ؎

"جِت وَل یار اُتے وَل کعبہ بھاویں پھول کِتاباں چار ے[1]"

وُہ محبُوب دِل کے اندر ہے اَور دِل کے اندر پیار کی لہر اُٹھا کر ہی تُم اُس کو پا سکتے ہو ؎

سَت سمندر دِل دے اندر۔ دِل سے لہر اُٹھاواں گی
ٹُونے کامن کر کے نی مَیں، رُٹھڑا یار مناواں گی

"اُلٹی گنگ بہائیو" کافی میں آپ نے انسانی جسم کو وُہ لنکا کہا ہے جس کے اندر دس سروں والے راون (حواس) کو زیر کر کے محبُوب کے ساتھ وِصال کیا جا سکتا ہے۔ سچی زیارت گاہ جس میں نہا کر رُوح پاک و صاف ہو جاتی ہے، انسانی قالب ہے۔

"پیار پیا سانوں مِٹھڑا نہ لگدا شور" میں آپ نہایت خُوبصورت انداز میں کہتے ہیں کہ محبُوب کے وِصال میں باہری شور و غُل ناخوشگوار لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ باطن میں محبُوب سے وصال ہونے پر اندر دلکش گُلزار مہک اُٹھتی ہے۔ فرقت کی خزاں وصل کی خوشگوار اَور دائمی بہار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ؎

مَیں گھر کھِلا شگوفہ ہور۔ دیکھیاں باغ بہاراں ہور
ہُن مَینُوں کُجھ نہ کہنا۔ دِلبر دے وِچ رہنا

پَردہ

سائیں جی کہتے ہیں کہ رُوح (محبُوبہ) رَب (محبُوب) کے فراق میں پریشان ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان جہالت، نفس یا خودی کا پردہ حائل ہے ؎

---

[1] جس طرف محبُوب ہے اُسی طرف ہمارا کعبہ (عبادت گاہ) ہے۔ بے شک چاروں الہامی کُتب توریت، زبُور، انجیل اَور قرآن پڑھ کر دیکھ لو۔

۱۔ تیڑے وَتے تھاں نہ دِتے۔ ڈھونڈاں کِت وَل جاہیں
اِکسے گھر وِچ وَسدیاں رَسدیاں، کِت وَل کُوک سُناہیں

۲۔ بُھلّے رہے نام نہ جَپیا۔ غفلت اندر یار تے چھپیا
اَوہ سِدھ پڑھ کھا اندر وَسیا۔ تکیاں نفس دُ ہاں چاناں نی

ایک ہی گھر میں رہنے والے رُوح اور خدا کو ایک دوسرے سے دُور رکھنے والی شے
خودی یا نفس ہے۔ ے

" ایکا سنگت اکت گر ہہ بسنے مِل بات نہ کرنے بھائی
اَنتر الکھ نہ جائی لکھیا وِچ پڑدا ہَومے پائی

(محلہ ۵، صفحہ ۲۰۵)

سائیں جی یہ بات ذہن نشین کرواتے ہیں کہ جب تک نفس، مَیں، میری یا جہالت کا پردہ
قائم ہے، بے شک دُنیا کی تمام زیارت گاہیں چھان مارو اور ہر قسم کی شریعت کی پابندی کرلو،
تلاش کے شجر کو وِصال کا پھل نہیں لگ سکتا۔ ے

مکّے گیاں گل مُکدی ناہیں۔ جچر دِلوں نہ آپ مکائیے!
گنگا گیاں گل مُکدی ناہیں۔ بھاویں سو سو غوطے لائیے!
گیا گیاں گل مُکدی ناہیں۔ بھاویں کِتنے پنڈ بھرائیے!
بُلھا شاہ گل تاں ہی مُکدی۔ جد ہہ ،نوں کھڑے لٹائیے

جب تک حواس پر قابو نہیں پالیا جاتا، نفس نہیں مرتا، دُوئی کے کُفر کا سر نہیں کاٹا جاتا،
اور محبُوب سے وصال نہیں ہوسکتا ے

بُلھا ئیں جوگی نال ویاہی۔ لوکاں کملیاں خبر نہ کائی
مَیں جوگی دا مال، پنجے پیر[1] مناکے

---

[1] پنج پیر = عام عقیدہ کے مطابق پنج پیر یہ ہیں: غازی میاں (سالار مسعُود) زندہ غازی

(باقی اگلے صفحہ پر)

وار یا کُفر وڈا ہیں دل تھیں۔ تلی تے سیس ٹکا کے
ہیں وڈ بھاگی ماریا خاوند۔ جنھیں زہر پلا کے

دسواں دروازہ

اگر قالبِ انسانی ہی اصل مکہ اور کعبہ ہے تو اس میں محبوب کی تلاش کیسے اور کہاں کریں؟ دیگر فقرائے کامل کی طرح سائیں بُلھے شاہ بھی سمجھاتے ہیں کہ جسم کے گھر یا آنگن کے نو دروازے (دو آنکھیں، دو کان، ناک کے دو سوراخ، منہ اور رفع حاجت کے دو سوراخ) رُوح کے جسم اور دُنیا میں کام کرنے کے لئے ہیں۔ مگر دسواں دروازہ باطن میں روحانی مقامات کی جانب کھلتا ہے۔ یہ دسواں دروازہ ہی رُوح کا اندر مقام ہے۔ رُوح اس مقام سے نیچے اُتر کر نو دروازوں کے ذریعے جسم اور دُنیا کے ساتھ بندھ چکی ہے۔ نو دروازوں کے ذریعہ باہر کی طرف پھیل رہی رُوح حواس کی لذتوں کی غلام بن چکی ہے۔ یہ محبوب کے مقام اور اس کے وصال کے سرور سے ناواقف ہے سائیں

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

شیخ فرید، خواجہ خضر اور پیر بدر۔ وارث شاہ نے روحانی نظریئے سے پانچ حواسِ باطنی کو پنج پیر کہا ہے ے "پنج پیر نے پنج حواس تیرے"۔ ایک لُغت کے مطابق پنج پیر یہ ہیں (۱) حضرت بابا فرید شکر گنج رح (۲) حضرت نظام الدین اولیا (۳) حضرت علی الہجویری (۴) حضرت شیخ معین الدین چشتی رح (۵) حضرت شمس تبریزی رح

صُوفی فلسفہ میں پانچ علتوں یا پانچ حواسِ باطنی کے زیر کرنے کے عمل کو پانچ پیر منانے کا نام دینا غیر قدرتی نہیں ہے سائیں جی نے اپنی کافی "اُلٹی گنگ بہائیو رے سادھو" میں دہسر (دس سر) یعنی دسوں حواس کو مارنے کی بات کہی ہے۔ یہاں آپ نے نفس (خاوند) کو جس کو دُنیا نے اپنا خصم کُسائیں بنایا ہوا ہے، کو قابو کرنے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ جو اس خیال کے بہت مشابہ ہے۔

موجودہ حالت میں نفس اور حواس ہمارے حاکم بنے ہوئے ہیں ان پر فتح حاصل کرنے کی حالت کو ہی ان کا مان جانا کہا گیا ہے۔

جی فرماتے ہیں کہ جب تک رُوح کو دسویں دروازہ کا پتہ نہیں مِلتا۔ جہاں محبوب رہتا ہے۔ اس کا کبھی بھی اس کے ساتھ وصال نہیں ہو سکتا۔ ؎

اِسؔ و بیہڑے دے نوں دروازے ، دسواں گُپت رکھاتی
اوس گلی دی مَیں سار نہ جاناں ، جہاں آوے پیا جاتی[۲]

کبیر صاحب کہتے ہیں کہ جسم کے نو دروازوں میں بھٹک رہی رُوح دسویں دروازے میں پہنچ کر ہی وہاں پڑی بے مثال شئے کو حاصل کر سکتی ہے۔ ؎

نو گھر دیکھ جو کامن بھولی بست انوپ نہ پائی
کہت کبیر نوے گھر مُوسے دسویں تت سمائی
(آدگرنتھ۔ صفحہ ۳۳۹)

حضرت شمس تبریز کہتے ہیں: تو حیوانوں کی طرح سرنگوں ہونے یعنی سر کو نچلی طرف گرانے

[۱] (ا) نو دروازے نوے دریچے رس اَمرت دسوے چوئیجے
(محلہ۔ ۴۔ صفحہ ۱۳۲۳)

(ب) نو دروازے دسویں مکتا انحد سبد وجاونیا (محلہ ۳۔ صفحہ ۱۱۰)

(پ) چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی سرّ حق بر من بخند (رُومیؔ)

آنکھ بند کر، کان بند کر اور ہونٹ بند کر۔ پھر بھی اگر تجھ پر حقیقت کا راز افشا نہ ہو تو مجھ پر ہنس (مخول اُڑا)

(ت) کاں دو اندر چو در آئی وا رہی
از غم و شادی قدم بیروں نہی

جب تو اپنے اندر اُس دروازے سے داخل ہوگا۔ تو تجھے غم اور خوشی دونوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

[۲] پیا جاتی ۔ مالک کی ذات ، ذاتِ الٰہی۔

کی بجائے مقامِ بالا کی جانب دیکھ. جب تُو جسم کے تنگ غار سے باہر نکلے گا. تو آسانی ایک نئی دُنیا میں داخل ہو جائے گا.

۱- اندر حیوان بنگر سر سُوئے زمین دارد
گر آدمے آخر سر جانبِ بالا کُن

۲- از مضیقِ جسم چُوں یابی خلاص
بے تجدد عالمے یابے جدید

خواجہ حافظ فرماتے ہیں: جب تک تُو قالب کی سرائے (جسم کا آنکھوں سے نیچے کا حصہ) سے اُوپر نہیں اُٹھتا. تُو حقیقت کی گلی میں داخل نہیں ہو سکتا ؎

تُو کز سرائے طبیعت نمیروی بیرُوں
کُجا بکُوئے حقیقت گُذر توانی کرد

مولانا رُوم فرماتے ہیں: جب تک انسان اِن حواس سے باہر نہیں نکلتا، غیبی تصویر کے دیدار سے اجنبی رہتا ہے.

چُوں زحِس بیرُون نیامد آدمی
باشد از تصویرِ غیبی اعجمی

آنکھوں کے پیچھے دسویں دروازے سے نکل کر ایک حسین وسیع دُنیا قائم ہے[۱].
اِس میں بے شمار رُوحانی دَولت بھری پڑی ہے. اس میں سے ہو کر محبُوبِ حقیقی کے مقام کو راستہ جاتا ہے. سائیں جی نے اس دروازے کو باطن میں 'پیا' کے دیس کی طرف کُھلنے والا "آلا" یا کھڑکی بھی کہا ہے ؎

کھیڈ لے ویہڑے[۲] گُھمّی گُھم[۳]

---

[۱] ایں جہانے چیست بس تاریک و تنگ. ہست بیرُوں عالمے بے بُو و رنگ. (رُومی)

[۲] آنگن (مُراد جسم) [۳] گُھمی گُھم = گھوم پھر کر.

اِس وہیڑے وِچ آلا[1] سوہندا آپے دے وِچ تاکی[2]
تاکی دے وِچ سیج وچھاواں نال پیا سنگ رانی[3]

سنت تبینی جی نے سائیں جی سے کئی سو سال پہلے سمجھایا تھا کہ اِس اندرُونی کھڑکی کو کھول کر انسان ہمیشہ کے لئے بیدار اور ماضی، حال اور مستقبل سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اُوپر ہاٹ، ہاٹ پر آلا، آلے بھیتر تھاتی
جاگت رہے سو کبھُو نہ سووے۔ تین تلوک سماوہ بلووے

(آدگرنتھ۔ صفحہ ۹۷۴)

حضرت سُلطان باہُو فرماتے ہیں: "دِل دی تاکی لاہ فقیرا پا اندرُونے جھاتی ہُو"

محبُوب کو دیکھنے والی آنکھ

آنکھوں کے پیچھے واقع اِس پوشیدہ دروازے کو پیروں، پیغمبروں اور فقرائے کامل نے اندرونی آنکھ، تیسری آنکھ، دِوّیہ درشٹی، شِو نیتر، تِل یا تیسرا تِل کہا ہے۔ مُسلمان فقیروں نے اِس کو غیبی آنکھ، نقطۂ سویدا، وغیرہ کہہ کر بیان کیا ہے۔ سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ جب تک[4] باطن میں دیکھنے والی آنکھ نہیں ملتی اندر رب کا دیدار نہیں ہو سکتا۔

بُلھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں، پر ویکھن والی اَکھ نہیں
تاہیوں جان جُدائیاں سہندی اے

---

[1] آلا = طاق [2] تاکی = کھڑکی۔
[3] پیا سنگ رانی = محبُوب کے ساتھ رنگی ہُوئی۔ محبُوب میں مجذُوب۔
[4] حضرت شمس تبریز کہتے ہیں کہ اولیا یا مُرشد جن کی غیب کی آنکھ کھول دیتے ہیں، وُہ اپنے معشوق کی موجودگی میں با خوشی اور با خبر مرتے ہیں۔ باقی سب اندھوں کی طرح بے خبر جاتے ہیں۔

عاشقانے کہ با خبر میرند، پیشِ معشوق چوں شکر میرند
اولیاء چشمِ غیب بکشایند، باقیاں جملہ کور و کر میرند

اندرونی آنکھ کُھلے بغیر انسان بھکاری کی مانند ہے، اگرچہ اُس کے گھر میں روحانی دولت کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اِس آنکھ کو کھولے بغیر اس کی حالت سمندر کے کنارے پیاسے مرتے مُسافر کی سی ہے۔ ؎

موتی چُونی پارس پاسے . پاس سمندر مرو پیاسے
کھول اکھیں اُٹھ ہَو بھکارے، اَب تو جاگ مسافر پیارے

آپ نے اِس نُقطہ کو سیاہ زُلف کے اندر چُھپے بیضا سے تشبیہ دی ہے، جس میں نُورِ الٰہی جھلک رہا ہے۔ ؎

' زُلف سیاہ دے وِچ یدِ بیضا دے چمکار دکھالی اوبار '

آپ نے اِس کو سر کے اندر بنا ہُوا اُوہ سوراخ بھی کہہ کر بیان کیا ہے جس میں اُنحد شبد کا باجہ بجنا سُنائی دیتا ہے ؎

انحد واجہ سرب ملاپی ، بردیری سِرناجا[1] رے

اَور بھی کئی فقیروں نے اِس چشمِ باطن کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ انجیل میں آتا ہے کہ اگر تُو ایک آنکھ والا بن جائے، تو تیرا سارا جسم نُور سے بھر جائے گا[2]۔ یہاں یہ اشارہ "چشمِ باطن" کی طرف ہے۔

طرف ہے۔ ایک صُوفی فقیر نے اِس بارے میں کہا ہے :۔

چشمِ دیگر بابدت تا حُسن او دیدن تواں

ایک اَور ہی آنکھ چاہیئے، جس سے اس کا حُسن دیکھا جا سکے۔

تُلسی صاحب نے اپنے کلام میں اس نقطہ کو پُتلی کا تِل کہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس سیاہ پَردے یا تِل کے پیچھے ساری رُوحانی حقیقت پوشیدہ ہے۔ اِس نُقطے کے پار دیکھنے سے

---

[1] ناجا = سوراخ۔ سِرناجا = سر کا سوراخ، تیسری آنکھ جو اندر ماتھے میں دو آنکھوں کے درمیان ہے۔

[2] The light of the body is the eye. If, therefore, thy eye be single, thy whole body shall be full of light. (Matthew 6 : 22)

چودہ طبق کی کیفیت اندرونی آنکھ کے سامنے کھل جاتی ہے۔ اِس نقطہ پر پہنچ کر باطن میں کلمہ یا شبد کی دائمی آواز سنائی دینے لگ جاتی ہے جو رُوح کو رب کی درگاہ کی طرف بُلا رہی ہے۔ آپ ہدایت کرتے ہیں کہ محبوب کا جلوہ دیکھنے کے لئے باہر بھٹکنے کی بجائے باطن میں تیسرے تِل یعنی نقطۂ سویدا میں پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ؎

سُن[1] اے تقی نہ جائیو زنہار دیکھنا | اپنے میں آپ جلوۂ دِلدار دیکھنا
پُتلی میں تِل ہے تِل میں بھرا راز کُل کا کُل | اِس پردۂ سیاہ کے ذرا پار دیکھنا
چودہ طبق کا حال عیاں ہو تجھے ضرور | غافل نہ ہو خیال سے ہُشیار دیکھنا
سُن[2] لامکاں پہ پہنچ کے نبری پکار ہے | ہے آ رہی صدا سے صدا یار دیکھنا
ملنا تو یار کا نہیں مشکل مگر تقی | دشوار تو یہ ہے کہ ہے دشوار دیکھنا
تُلسی[3] بنا کرم کسی مُرشد رسیدہ کے | راہِ نجات دُور ہے اُس پار دیکھنا

تُلسی صاحب نے اس غزل میں اشارہ کیا ہے کہ باطن میں جانے اور تِل کو پار کرنے کا راز کسی مُرشدِ کامل سے ملتا ہے۔ کبیر صاحب کہتے ہیں کہ جب تک اِس تِل میں داخل ہونے کی ترکیب سکھانے والے مُرشد کی صحبت و قربت نصیب نہیں ہوتی، "گیان دھیان اور جپ تپ" سب بیکار ہیں۔

---

[1] یہ غزل تُلسی صاحب نے ایک مُسلمان درویش کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ آپ سمجھاتے ہیں کہ اے تقی! دلدار کا جلوہ دیکھنے کیلئے کہیں باہر نہ جا، اپنے باطن میں ہی اس کا جلوہ دیکھ۔

حضرت شاہ نیاز بھی کہتے ہیں ؎

اے دِل کہیں نہ جائیو، زنہار دیکھنا
اپنے ہی بیچ یار کا دیدار دیکھنا

[2] اِس نقطہ کو پار کر کے اندرونی روحانی سفر طے کرتا ہُوا تو منزل بہ منزل لامکاں پہنچ جائے گا، جہاں نبری انتظار ہو رہی ہے اور جہاں رُوح کو اُوپر کھینچنے کے لئے کلمہ کی آواز ہمیشہ سے نیچے کی طرف آ رہی ہے۔

[3] کسی مرشدِ کامل کی عنایت کے بغیر اس آواز کو حاصل کرنا اور نجات کا سفر طے کر کے مقامِ حق میں رسائی حاصل کرنا ناممکن ہے۔

رُوحانی شغل

ذِکر اور تصوّر

نو دروازوں میں قید رُوح آنکھوں کے پیچھے آکر دسویں دروازے میں کس طرح داخل ہو، اور اندرُونی آنکھ کیسے کھولے؟ فقراء سمجھاتے ہیں کہ فطرتاً ہمارا مَن ہمیشہ کسی نہ کسی شے کے بارے میں سوچنے میں مصروف رہتا ہے جن چیزوں کے بارے میں یہ سوچتا ہے، اُن کی خیالی شکلیں اور تصویریں بھی بناتا رہتا ہے۔ فقیروں نے من کے سوچنے کی اِس عادت کو ذکر اور چیزوں کی خیالی تصویریں بنانے کی عادت کو تصوّر کہا ہے۔ ہم اندھیری سے اندھیری کوٹھڑی میں آنکھیں بھی بند کر کے کیوں نہ بیٹھ جائیں، ہمارا مَن پھر بھی دُنیاوی چیزوں کے ذِکر اور تصویریں لگا رہتا ہے دُنیا کی فانی اشیاء کا متواتر ذکر اور تصور کرنے سے مَن کی ان کیساتھ وابستگی اور لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب تک مَن دُنیاوی اشیائ سے لاتعلق نہیں ہوتا، اس کا رُخ کبھی بھی اُوپر اور اندر کی طرف نہیں پلٹ سکتا۔

فقرائے کامل سمجھاتے ہیں کہ اگر مَن کو دُنیا کی فانی اشیائ کے ذکر اور تصوّر کی جگہ، ذاتِ لافانی کے ذکر اور اُس میں سمائے ہوئے مُرشد کے تصوّر میں لگا دیا جائے تو اِس کے اندر قائم ہوچکا دُنیاوی لگاؤ توڑا جا سکتا ہے، اور خدا سے لگاؤ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مُرشد کی ذات خُدا کی ذات میں فنا ہوچکی ہوتی ہے۔ اِس لئے مُرشد کی ذات کا تصوّر ہی خُدا سے وِصال کا واحد وسیلہ ہے۔ دُوسرے ہر بشر اور ہر شے کا تصوّر ہمیں اِس دُنیا میں محدُود رکھے گا۔ اور ہم کبھی بھی اِس مادّی کائنات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ کا قول ہے :-

۱۔ جب تک کوئی خود خدا سے نہ آیا ہو، وُہ کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔

۲۔ یقین رکھو کہ مَیں باپ میں ہُوں اور باپ مجھ میں ہے۔
۳۔ .... جس نے مجھے دیکھا ہے، اس نے خدا کو دیکھا ہے۔

سائیں بُلّھے شاہ بھی مُرشد کی ذات کے بارے کہتے ہیں:۔
بُلھیا ایس نوں ویکھ ہمیشہ۔ ایہہ ہے درشن سائیں دا۔

دراصل مَن دنیاوی اشیأ کے ذکر اور تصوّر کے سبب ہی پہلے آنکھوں کے نیچے سے نَو دروازوں میں اُترتا ہے اور پھر انہیں نَو دروازوں کے ذریعے ساری دُنیا میں پھیل جاتا ہے۔ رُوح کو آنکھوں کے پیچھے قائم کرکے خدا کے نام کا ذکر اور مُرشد کی صُورت کا تصوّر کرنے سے مَن اور رُوح قدرتی طور پر نَو دروازوں میں سے سمٹ کر دسویں دروازے میں اکٹھے ہونے شُروع ہو جاتے ہیں۔ رُوح کے آنکھوں کے پیچھے مکمل طور پر یکسُو ہوتے ہی دسواں دروازہ خُود بخُود کُھل جاتا ہے اور مَن اور رُوح اس کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا ہے "دستک دو تو (دروازہ) کُھل جائے گا، تلاش کرو تو تمہیں مِل جائے گا۔"[1] آپ کا اشارہ ذکر کے ذریعہ مَن کو دسویں دروازے پر یکسُو و قائم کرکے اندر داخل ہونے کی طرف ہے۔ سائیں بُلّھے شاہ فرماتے ہیں کہ اے محبُوب! مَیں نے تیری خاطر نَو دروازے پار کرکے دسویں دروازے پر آ ڈیرا لگایا ہے۔ اب تُو میری محبت قبُول کرکے مجھے اپنا دیدار بخش دے۔

تدھ کارن مَیں ایسا ہویا، نَو دروازے بند کر سویا
دَر دسویں تے آن کھلویا، کدے مَن میری آشنائی

آپ نے اُوپر 'سویا' لفظ کا استعمال کیا ہے، جس کا اشارہ عام نیند کی طرف نہیں ہے۔ مَن اور رُوح کے نَو دروازوں میں سے سمٹ کر آنکھوں کے پیچھے یکسُو ہونے سے جسم کا آنکھوں سے نیچے کا حصہ پوری

---

[1] Seek & ye shall find ; knock & it shall be opened unto you. (Matthew 7 : 7)

طرح بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ یعنی سو جاتا ہے۔ لیکن رُوح باطن میں بیدار ہو جاتی ہے۔

سائیں جی کہتے ہیں کہ دُنیا کی طرف بیدار لوگ در اصل سوئے ہُوئے ہیں۔ اور رُوحانی ریاضت کے ذریعے دُنیا کی جانب سے سو چکے لوگ اصل میں بیدار ہو چکے ہیں۔ دُنیا کی طرف جاگ رہے[1]، مگر اندر کی طرف سوئے ہُوئے لوگ جب وقتِ آخر اندر کی طرف جاگتے ہیں تو پچھتاتے ہیں کہ زندگی کے قیمتی وقت کو فضول ضائع کر دیا ہے

میں جاگی سبھ جگ سویا ، کُھلّھی پلک تاں اُٹھ کے رویا

سائیں بُلھے شاہ سمجھاتے ہیں کہ رُوح اور خدا کے درمیان ایک تاریک پردہ حائل ہے۔ یہ پردہ پُرانے جنموں کے تاثرات (اچھے یا بُرے) کا ہے۔ ان تاثّرات کو دھو کر رُوح کو پاک صاف کرنے کا کام ذکر اور تصوّر کرتے ہیں ؎

میں جھوٹر بڑی ہاں سچے صاحب دی سرکاروں

دھیان کی چھجلی گیان کا جھاڑُو کام کرودھ نت جھاڑوں

کامل فقیروں نے زندگی کا ہر ایک لمحہ ذِکر اور تصوّر میں صَرف کرنے کی تعلیم دی ہے۔ یہی انسان کو گناہوں سے بچانے والا، اس کے جنم جنم کی غلاظت اتارنے والا عمل ہے۔ یہ اس کو خلقت کی طرف سے اُکھاڑ کر خالق کے ساتھ جوڑنے والا قدرتی طریقہ کار ہے۔ گورو ارجن دیو فرماتے ہیں ؎

اُوٹھت بیٹھت سووت جاگت ساس ساس ہر جپیئے

(محلہ: ۵ صفحہ ۱۲۹۸)

---

[1] حضرت عیسٰی نے فرمایا ہے: "میں آنکھوں والوں کو اندھا کرنے آیا ہُوں اور اندھوں کو بصیرت دینے آیا ہُوں۔" (جان ۹ : ۳۹)

آپ کا مطلب ہے کہ جو لوگ دُنیا کی طرف دیکھتے ہیں اور اندر کی طرف سے اندھے ہیں، میں اُن کو دُنیا کی طرف دیکھنے والی آنکھیں بند کر کے یعنی دُنیا کی طرف سے کور چشم ہونے اور اندر کی آنکھ کھول کر اُنہیں باطن میں دیکھ پانے کی ترکیب سکھانے آیا ہُوں، تاکہ لوگ اپنے رُوحانی اصل کو پہچان سکیں۔ کیونکہ ہماری رُوح اور شبد کا اصل ایک ہے۔

خواجہ مُعین الدین چشتی فرماتے ہیں :۔ اگر تیرے اندر خُدا کا نام گھر کر گیا ہے، تو یقین رکھ کہ تُو دِن رات خُدا کی صحبت میں ہے :۔

یقین بدان کہ تو باحق نشستۂ شب و روز
چُو ہم نشین تو باشد خیال نامِ خُدا

حضرت سُلطان باہُو کہتے ہیں کہ ذکر کرنا مُشکل ہے۔ مگر ہمیشہ ذکر کا فکر ہونا چاہیئے۔ ذِکر سے غفلت میں بتایا گیا سانس کُفر میں بِیتا ہُوا سانس ہے، کیونکہ اُس وقت دِل لافانی خالق کی عبادت کی بجائے عالمِ فانی کے فِکر میں لگا رہتا ہے۔ ے

۱۔ ذِکر کنوں کر فِکر ہمیشہ، ایہہ لفظ تکھّا تلواروں ہُو
ذاکر سوئی جیہڑے ذکر کماون، اِک پَل نہ فارغ یاروں ہُو
۲۔ جو دم غافل سو دم کافر، سانوں مُرشد ایہہ سمجھایا ہُو

سائیں بُلھے شاہ کے مُرشد نے بُلھے کو اپنی پہلی مُلاقات میں سمجھایا تھا:

"بلھیا رَب دا کی پاؤنا، ایدھروں پُٹنا۔ اودھر لاؤنا"

توجہ کو اِدھر سے اکھاڑ کر اُدھر لگانے کا کام ذِکر اور تصور کی مدد سے ہی سرانجام ہونا ہے سائیں جی نے اپنی کافی "اُلٹی گنگ بہایو رے سادھو تب ہر درشن پائے" میں ذکر اور تصور کے رُوحانی عمل اور اس سے حاصل ہُوئے تجربے کا مُفصل بیان کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ باطن میں ذاتِ الٰہی کا دیدار حاصل کرنے کیلئے اُلٹی گنگا بہانا پڑتی ہے، یعنی رُوح کو ذکر کے نکلے اور تصور کے چرخے کے ذریعے اُلٹا گھمانا ضروری ہے۔ اُلٹے چکر گھُمانے کا مطلب رُوح کو باہر سے اندر اور نیچے سے اُوپر لانے کا عمل ہے۔ اس طرح دسہرد دس سروں والا راون) مارا جاتا ہے، یعنی دس حواس قابُو میں آجاتے ہیں۔ خرد کا لچھمن دس حواس کے چنگل سے آزاد ہو کر بیہوشی کے عالم سے بیدار ہو جاتا ہے۔ جسم نما لنکا کے سب راز ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور باطن میں مُرشد سے وصال کر کے سالک سچا "گورُوسیوک" بن جاتا ہے۔ رُوح اندرونی طبقات

عبور کرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے، جس کو سائیں جی نے "امرت منڈل" کہا ہے[1] شبد یا کلمہ کے حوضِ کوثر میں نہا کر روح کی تمام کثافتیں دور ہو جاتی ہیں، اور یہ مکمل طور پر پاک ہو کر خدا میں سما جانے کے قابل بن جاتی ہے۔

اُلٹی گنگ بہائیو رے سادھو
تب ہر درشن پائے
پریم کی پونی ہاتھ میں لیجے
گجھ[2] مروڑی پڑنے نہ دیجے
گیان کا نکلا دھیان کا چرخہ
اُلٹے پھیر بھوائے
اُلٹے پاؤں پر کنبھ کرن جائے
تب لنکا کا بھید اُپائے
دھسر لٹیا ہن لچھمن باقی
تب انحد ناد بجائے
ایہہ[3] گت گورو کی پیریں پاوے
گور کا سیوک تبھی سدائے

---

[1] مسلمان فقیروں نے اس کو حوضِ کوثر یا آبِ حیات کا چشمہ کہا ہے۔
" لکھ آبِ حیات منور چشمہ او تھے سائے نے زلف عنبر دے ہو" (سلطان باہو)
دیگر سنتوں مہاتماؤں نے اس کو امرت سر، مانسرور، وغیرہ ناموں سے پکارا ہے؟
" کائیا اندر امرت سر ساچا من پیوے بھائے سبھائی ہے"۔ (محلہ ۳، صفحہ ۱۰۴۶)

[2] سُرت کی تار میں خم نہ پڑنے دو۔ یعنی روح کو با احتیاط ذکر اور تصور کے روحانی شغل میں لگاؤ۔

[3] یہ اشارہ اندر مرشد کی نورانی صورت کی طرف ہے۔ اندر مرشد کی نورانی صورت ظاہر ہونے

(باقی اگلے صفحہ پر)

امرت منڈل مُوں تب ایسی دے
کہ ہری ہر ہو جائے
اُلٹی گنگ بہا یُو رے سادھو
تب ہر درشن پائے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کافی میں سائیں جی نے رُوح کو اندر لے جانے کے سارے رُوحانی عمل کو "اُلٹی گنگا بہاؤنا" "اُلٹے پھیر پھواؤنا" اور "اُلٹے بہریں کُنبھ کرن جائے" کہا ہے۔ مُرشدِ کامل سمجھاتے ہیں کہ کائنات کے ظہور کے وقت رُوح مقامِ حق سے عالمِ آب و گل میں اُتری اور روحانی طبقات سے گزرتی ہوئی دسویں دروازہ (نقطۂ سویدا) میں آ گئی، جو اس کا جائے مقام بن گیا۔ مگر یہ یہاں بھی نہ ٹک سکی، اور نو دروازوں کی راہ سے جسم اور دنیا میں پھیل گئی۔ فقرا سمجھاتے ہیں کہ دُنیا کے ذکر اور تصور میں قید رُوح خدا کے 'نام' کے ذکر اور مُرشد کے تصور کے ذریعے اپنا رُخ موڑ سکتی ہے اور آنکھوں کے پیچھے واپس لوٹ کر خدا کی درگاہ سے آ رہے کلمہ یا شبد کے سہارے دوبارہ اپنے ذاتی مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ سنت بینی جی اپنی بانی میں فرماتے ہیں، مَن اور رُوح کی جسم میں پھیلی ہوئی دھاروں کو اِدھر سے سمیٹ کر اندر اِڑا، پنگلا اور سُشمنا کے سنگم پر لے آؤ، جہاں شبد (کلمہ) کے سرِوور (حوضِ کوثر) میں نہا کر رُوح پاک ہو کر خدا کے ساتھ وصال کرنے کے قابل بن جاتی ہے۔

اِڑا، پنگلا اور سُکھمنا تین بسے اِک ٹھائی
بینی سنگم تہہ پراگ من مجن کرے تتھائی
سنتہو تہاں نرنجن رام ہے۔ (آدگرنتھ۔ صفحہ ۹۷۴)

(بقیہ: فٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آگے)۔

سے ہی سالک سچا "گور سیوک" بنتا ہے۔ اس کی گورو بھگتی مکمل ہو جاتی ہے اور اس کا رُوح بانی کا روحانی سفر اندر مُرشد کی رہنمائی میں طے کرتی ہے۔

اِسی موضوع پر سائیں بُلھے شاہ کی کافی" چینا ایں چھڑیندا یار" قابلِ غور ہے۔ یہ کافی قلمی نُسخہ جات میں نہیں ملتی۔ مگر قوّال اکثر اسے گاتے ہیں۔ اِس کافی میں رُوحانی شُغل کے بارے میں بہت خُوبصورت اشارے ملتے ہیں، کافی کے پہلے بند میں آتا ہے :۔

کُن فیکون فرمایا جداں اساں کول تُساں دے ہاسے
نفس پلیت پلیت کیتا اساں اصل پلیت نہ ہاسے
فُرقت خیر خراب کیتا نہ تاں جاتی ہاسے خاصے
وَجے الہہ والی تار وَجے مُرشد والی تار
الہہ - الہہ - الہہ - الہہ الہہ الہہ
چینا ایں چھڑیندا یار

مطلب :۔ رُوح کہتی ہے، جب آپ (خداوند کریم) نے اپنے حُکم سے کائنات کی تخلیق کی۔ تو اُس وقت میں آپ کے حضُور میں موجود تھی۔ خُدا کا جُزو ہونے کے ناطے میرے اندر کوئی ذاتی پلیدگی ہرگز نہ تھی۔ جب مجھے آپ سے جُدا کر دیا گیا اور نفس میرے ساتھ لاحق ہو گیا۔ تو پلیدگی بھی میرے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ اِس پلیدگی کو دُور کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ میں خُدا کی عبادت کا چینا چھڑوں۔ یہ چینا کیسے چھڑا جائے؟ اِس کے لئے ضرُوری ہے کہ میں خداوند کریم کے اسم کا ذکر کروں اور مُرشد کے تصوّر میں کھو جاؤں۔

کافی کا دُوسرا بند اس طرح ہے

پہلے اُکھلی صاف کرائیں ۔ روڑا مٹی دُھوڑ مٹائیں
پھر اُکھلی وِچ چینا پائیں ۔ چھج صبر دا رکھیں تیار
وَجے الہہ والی تار ....

مطلب :۔ پیشتر اس کے کہ مَن کی اُکھلی میں خدا کی عبادت کا چینا ڈالا جائے۔ اس کو نفسانی پلیدگیوں سے پاک وصاف کرنا ضروری ہے۔ یہ پاکیزگی خُدا کے اِسم کے ذکر اور مُرشد کے تصوّر سے حاصل ہو گی۔ یہ عمل جلد بازی میں سرانجام پانے والا نہیں،" چھج صبر دا رکھیں تیار"۔

اِس میں تحمل اَور استقلال درکار ہیں۔ کافی کا ایک اَور بند اِس طرح ہے ؎

کاں حرامی چھـڑن نہ دیندا ۔ اُڈدا تِچھّے جھاٹ مریندا
کیتا کم خـراب کریندا ۔ اُڈجا کاواں وِچ پلکار
وَجے الہہ والی تار..........

مطلب :۔ نفس کا کوّا عبادت کے عمل میں خلل ڈالتا ہے۔ یہ بار بار ریاضت کی جمع ہو چکی پونجی پر جھپٹتا ہے۔ لازم ہے کہ اِس کو اڑانے کے لئے مستقل مزاجی سے ذکرِ الٰہی اَور تصور پر زور دیا جائے۔

کافی میں آگے آتا ہے ؎

عاشق عشق نماز ہمیشہ لاحرفوں کرن ادائی
سُنّت نفل فرض واجب اُنہاں سمجھ گھِدی یکتائی
چراغ سکُوت تے سجدہ خفیہ ایہو خفتن کھاناجاہی
خبر عشق دی خیر ملی ول ول خبر نہ کائی
وَجے الہہ والی تار..............

ذکر اَور تصور کا عمل پختہ ہو جانے پر خُدا کے سچے عاشقوں کی حالت بدل جاتی ہے۔ ان کے اندر وُہ کلمۂ الٰہی جاری ہو جاتا ہے جو زبان اَور الفاظ سے مبّرا ہے۔ اِسی لاحرف کلمہ کے جاری ہو جانے سے خُدا کے عاشق کثرت سے یکتائی یعنی وحدت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اندر خاموشی کا چراغ نمودار ہو جاتا ہے، اور وُہ ایسا پنہاں سجدہ ادا کرتے ہیں، جو کسی دُوسرے کو دکھائی نہیں دیتا۔ اِس حالت میں وُہ دُنیا کی طرف سے بے ہوش ہو کر اندر، خدا اَور اُس کے عشق کی طرف باہوش ہو جاتے ہیں۔

شاہ رَگ میں داخلہ

نقطۂ سویدا کو پار کر کے رُوح جب لطیف رگ میں داخل ہوتی ہے، اس کو سنتوں، مہاتماؤں نے "سُشمنا" یا "سُکھمنا" ناڑی کہا ہے۔ سائیں بُلھے شاہ اَور دیگر کئی صوفی فقیروں نے اس کو "شاہ رگ" کہا ہے۔ "شاہ رگ" گردن کی درمیانی رَگ نہیں، صوفی اصطلاح میں یہ رُوحانی سفر کے لئے آنکھوں کے پیچھے ہی ایک لطیف شاہراہ ہے۔ سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ جو لوگ باہر کی بھاگ دوڑ چھوڑ

کر شاہ رگ میں پہنچ جاتے ہیں، اُن کے لئے خدا کی درگاہ دُور نہیں رہ جاتی۔ ؎

شاہ رگ تھیں رب وسدا نیڑے، لوکاں پائے ملے جھیڑے

واکے جھگڑے کون نبیڑے، بھج بھج عمر گوائی اے

گل رو وے لوکاں پائی اے

سائیں جی نے اِس تعلیم کی تصدیق میں اپنے کلام میں کئی جگہ قرآن شریف کی آیتوں کے حوالے دیئے ہیں، جن میں خدا بندے سے کہتا ہے: میں شاہ رگ کے ذریعے تیرے نزدیک ہوں۔ اور تو مجھے اپنے آپ میں پہچان ؎

نَحْنُ اَقْرَبُ[1] لکھ دِتوئی

ھُوَ مَعَکُمْ[2] سبق دِتوئی

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ[3] حکم کیتوئی

پھر کیہا گھونگھٹ پائیوئی

نَحْنُ اَقْرَبُ[4] کی بنسی بجائی

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ کی کُوک سُنائی

آپ نے "ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللّٰہ" "چاو دیکھئے اُس مستانڑے نوں" اور "فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ دستا ایں اَج او یار" نامی کافیوں میں بھی قرآن شریف کی اِسی مفہوم کی آیتوں کے حوالے دیئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ اسلام میں بھی شروع سے رُوحانی ترقی کے لئے یہی طریقِ ریاضت مقبولِ عام تھا حضرت باہُو بھی اس طرح کی آیتوں کے حوالے دے کر فرماتے ہیں، کہ رب کے سچے عاشق باہر کے ہر طرح کے جھگڑے اور فساد دُور کر کے رب کو شاہ رگ میں تلاش کر لیتے ہیں، اور ہمیشہ کے لئے وحدت میں سما جاتے ہیں ؎

---

[1] میں شاہ رگ کے ذریعے تیرے نزدیک ہوں۔ [2] میں تیرے ہمراہ ہوں۔

[3] تو مجھے اپنے آپ میں پہچان۔ [4] یہاں آپ شاہ رگ کے نزدیک کی بانسری کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ شاہ رگ میں داخل ہو کر رب کے کلمہ یا شبد کی بانسری سنائی دیتی ہے۔

جنہاں الف دی ذات صحیح جاتی، اوہ رکھدے قدم اگیرے ہُو
باہُو یَاھُوَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ۔ جھگڑے کُل نبیڑے ہُو

آپ اشارہ کرتے ہیں کہ ذاتی اسم یعنی سُلطان الاذکار کا شغل کرنے والے سالک شاہ رگ میں پہنچ کر اپنے آپ کو پہچان لیتے ہیں، اور وُہ کفر و اسلام، زندگی و موت کی تکرار سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ اُن میں خُودی کا احساس ختم ہو جاتا ہے: وُہ خدا میں اور خدا اُن میں سما جاتا ہے ؎

ھ = ہُو دا جامہ پہن گھر آیا اِسم کماون ذاتی ہُو
نہ اوتھے کفر اسلام دی منزل نہ اوتھے موت حیاتی ہُو
شاہ رگ تھیں نزدیک لدھوسو، پا اندر ونے جھاتی ہُو
اساں اُنہاں وِچ اوہ اساں وِچ، دُور کریئے قرباتی ہُو

سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ اِس رُوحانی ریاضت کے ذریعہ رُوح بغیر روک ٹوک چودہ طبقات کی سیر کر سکتی ہے، جس سے اِس کی دُنیاوی رغبت (کاگاں دی ٹور)[1] ختم ہو جاتی ہے، اور اس کو (مومنوں دہنسوں[2]) والا رُتبہ مِل جاتا ہے ؎

۱۔ چودھیں طبقیں سیر اساڈا، کِتے نہ مُندے قید
۲۔ پیارا آپ جمال وکھالے، ہوئے قلندر مست متوالے
ہنساں دے ہُن ویکھ کے چالے، بُھل گئی کاگاں دی ٹورنی
۳۔ سائیں شاہ رگ توں وی نیڑے، پڑتا لیئو ہُن عاشق کیہڑے

ہا تقرس کے سنت تُلسی صاحب فرماتے ہیں کہ جاہل لوگ اپنے جسم کی قدرتی مسجد یا قدرتی کعبے کی جگہ باہر کے مندروں، مسجدوں میں خُدا کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ اُس محبوب تک پہنچنے کا راستہ شاہ رگ میں ہے۔ اِس لئے مُرشدِ کامل کی مدد سے شاہ رگ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے ؎

---

[1] کاگاں دی ٹور = کوّوں کی چال، بُرے لوگوں کا چلن۔ [2] کہا جاتا ہے ہنسوں کی خوراک موتی ہے ہنسوں کی فطرت کوّوں سے بالکل اُلٹ ہوتی ہے، کاگ سے مُراد نفس کا غلام اور ہنس سے مُراد مُرشد کا بندہ ہے

نقلی مندر مسجدوں میں جائے صدؔ[1] افسوس ہے
قُدرتی مسجد کا[2] ساکِن دُکھ اُٹھانے کے لئے

قُدرتی کعبے کی تُو محراب میں سُن غور سے
آ رہی دُھر سے صدا تیرے بُلانے کے لئے

کیوں بھٹکتا پھر رہا تُو اے تلاشِ یار میں
راستہ شہ رگ میں ہے دِلبر پہ جانے کے لئے

مُرشدِ کامل سے مِل صِدق اَور صبُوری سے تقی
جو تجھے دیگا فہم[3] شہ رگ کے پانے کے لئے

گوشِ[4] باطن ہوں کُشادہ جو کرے کُچھ دِن عمل
لا اِلٰہ اللّٰہُ اکبر پہ جانے کے لئے

یہ صدا تُلسی کی ہے عامِل عمل کر دھیان دے
کُن[6] قرآں میں ہے لکھا اللّٰہُ اکبر کے لئے

عالمِ یکسوئی

رُوح کے باطن میں بیدار ہونے یا مکمّل طور پر یکسو ہونے کی کیفیت کو اَولیاء نے عالمِ یکسوئی یعنی "سمادھی کی اوستھا" کہا ہے۔ اِسی کو کثیف اَور لطیف کی گانٹھ کھولنے کا عمل بھی کہا گیا ہے، کیونکہ رُوح آنکھوں کے پیچھے آکر پہلے جسم اَور پھر اُوپر جا کر من سے الگ[5] ہو

---

[1] صدا: سو یعنی بہت افسوس ہے۔

[2] رہنے والا [3] عقل، طریقہ سوجھ بوجھ، شعور۔ [4] مُرشد کے بنائے ہوئے طریقۂ کار کے مطابق ریاضت کرنے سے شہ رگ میں داخل ہو جاؤ گے، باطن کے کان کُھل جائیں گے۔

[5] باطنی کان کُھل جانے سے اَندر خدا کے کلمے کی آواز سنائی دینے لگے گی۔ [6] قرآن شریف میں خُدا اَور کُن (خُدا اَور خُدا کا حکم) کا ایک ہی مطلب ہے۔

جاتی ہے۔ رُوح کو جسم اَور مَن سے الگ ہونے پر اپنے آپ کی پہچان ہو جاتی ہے اَور یہی خُدا کی پہچان کا وسیلہ ہے۔ سقراط نے کہا ہے: "اپنے آپ کو پہچانو" (Know Thyself)۔ گورو امرداس جی نے فرمایا ہے:

" سو جَن نرمل جِن آپ پچھاتا۔ آپے آئے مِلیا سُکھ داتا

(محلہ ۳، صفحہ ۱۰۴۶)

اِس کا مطلب رُوحانی ریاضت کے ذریعے رُوح کو مَن اَور حواس سے الگ کرنا ہے، کیونکہ جب تک رُوح مَن اَور حواس سے الگ نہیں ہوتی، یہ واپس جاکر اپنے اصل یعنی اللہ تعالےٰ میں نہیں سما سکتی۔ حضرت عیسٰی نے اشارہ کیا تھا کہ مادّہ سے بنی چیز مادّہ ہے، لیکن رُوح (کلمہ یا خُدا) سے بنی چیز رُوح ہے[1]۔ آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادّی (کثیف) اَور روحانی (لطیف) عناصر کی ملاوٹ سے بنا ہے۔ روحانی عنصر کو مادّی عناصر سے علیٰحدہ کرکے ہی رُوحانی عنصر (رُوح) خُدا سے وصال کر سکتا ہے۔ سائیں بُلھے شاہ نے اپنے کلام میں قرآن مجید کی اُن آیات کے حوالے دیئے ہیں، جن میں خُدا بندے کو آگاہ کرتا ہے۔ کہ تُم خود کو پہچانو[2]۔ اِس فرمان کا روحانی مطلب رُوح کو حواس سے الگ کرنا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رُوحانی ریاضت کے عمل میں جسم بے حِس ہو جاتا ہے اَور رُوح جسم اَور مَن سے الگ ہو کر خود کو پہچان لیتی ہے ؎

بُلھا شاہ خود آپ نوں صحیح کیتا
تاں مَیں سُنڑے انگ نہ موڑدی ہاں[3]

سائیں جی اِس کو صُم بُکم عُم یعنی کان، زبان اَور آنکھیں بند کر لینے کا عمل کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ نظر آ رہی دُنیا اَور آنکھوں سے نیچے کا حصّہ کُفر کی بستی ہے۔ خیال کو کُفر اَور بھرم کی بستی میں

---

[1] 'That which is born of the flesh is flesh and that which is born of the spirit is spirit.' (John 3 : 6)

[2] دیکھو کتاب صفحہ ۹۳ پر آپ کے کلام میں دیئے گئے قرآن شریف کی آیات کے حوالے۔

[3] سُنڑے انگ نہ موڑدی = جسم کا بے حِس ہو جانا۔

سے سمیٹ کر ہی محبوب کی لافانی ہستی کا دیدار کیا جا سکتا ہے۔ ؎

چھڈ جھوبڑ بھرم دی بستی نوں، کر عشق دی قائم مستی نوں
گئے پہنچ سجن دی ہستی نوں، جیہڑے ہو گئے صُم، بکم، عُمّ

ایسے عاشق ظاہراً سودائی اور دیوانے معلوم ہوتے ہیں، مگر باطن میں محبوب کے تئیں ہوشیار اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر ہمیشہ دُنیا اور وجود سے بالاتر، جمالِ پاک پر رہتی ہے۔ ؎

ہجر تیرے نے جھلی کر کے کملی نام دھرایا[1]
صُمُّ[2] بکمُ[3]، عُمّ[4] ہو کے اپنا وقت لنگھایا
کر ہُن نظر کرم دی سائیاں نہ کر زور دھگانے[5]

حضرت شاہ نیاز کہتے ہیں، کہ دُنیا کی طرف سے آنکھ، کان اور زبان بند کر کے اپنی توجہ کو حقیقت کی طرف لگاؤ ؎

صُمُّ، بکمُ، عُمّی ہو کے حق سے دھیان لگاؤ جی

جیتے جی مرنا

مکمل بیخودی کی حالت کو کامل فقیروں کی زبان میں "جیتے جی مرنا" کہا گیا ہے کیونکہ اس میں شاغل باہری دُنیا کی جانب سے مُردہ ہو کر باطن میں رُوحانی دُنیا کی طرف زندہ ہو جاتا ہے۔ موت کے وقت جُوں جُوں رُوح جسم کے نچلے حصے سے اُوپر کی طرف سمٹتی ہے نیچے کا حصہ بے حس و حرکت یعنی مُردہ ہو جاتا ہے۔ آخر کار رُوح آنکھوں سے اُوپر پہنچ کر جسم کو چھوڑ کے الگ ہو جاتی ہے جس سے آدمی کی موت ہو جاتی ہے۔ لیکن رُوحانی شغل میں شاغل (ابھیاسی) جب چاہے رُوح کو جسم سے سمیٹ کر دُنیا کے تئیں مُردہ اور باطن میں زندہ ہو سکتا ہے، اور پھر جب چاہے رُوح کو

---

[1] دھرایا = کہلوایا۔ [2] صُمّ = کان بند کرنے۔ [3] بکمُ = زبان بند کرنی
[4] عُمّ = آنکھ بند کرنی۔ [5] زور دھگانے = زبردستی۔

نَو دروازوں میں اُتار کر دُنیا میں دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ سائیں بُلّھے شاہ کہتے ہیں کہ مالکِ کُل کے حقیقی عاشق جِیتے جی مَرنے کی مشق کرتے ہیں، جس سے اپنے باطن میں جھانکتے ہی وُہ سر تا پا لا بیان رُوحانی مسرت سے مخمور ہو جاتے ہیں، اور ان کا اپنے محبوب کے مقام کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے ۔

عِشق جنہاں دی ہڈّیں پَیندا ، سوئی نِرجیوت مَر جاندا
جِس تے عشق ایہہ آیا ہے ، اوہ بے بس کر دِکھلایا ہے
نشہ روم روم وِچ آیا ہے ، اِس وِچ نہ رتّی اوہلا[1] ہے
ہر طرف دِسیندا مولا ہے ، بُلھّا عاشِق وی ہُن تردا ہے
جِس فِکر پیا دے گھردا ہے ، رَب مِلدا و بجھُّا دھردا ہے
مَن اندر ہو یا جھاتا ہے ، جِس پِچّھے مَست ہو جاتا ہے

سائیں جی کہتے ہیں کہ "جِیتے جی مرنے" کا شغل پُختہ ہو کر میری زندگی کا قدرتی حصہ بن گیا ہے۔ مَیں روز مرتا ہُوں اور روز زندہ ہوتا ہُوں۔ اِس عمل کے ذریعہ ہی مَیں روز کُفر سے ہجرت[2] کر کے اسلام میں داخل ہوتا ہُوں ۔

بُلھیا ہجرت وِچ اسلام دے ، میرا نِت ہے خاص مقام
نِت نِت مراں[1] نِت نِت جِیواں ، میرا نِت نِت کوُچ مقام

اِس قسم کے بیان بہت سے فقیروں کے کلام میں ملتے ہیں۔ انجیل میں آیا ہے :- "مَیں روز مرتا ہُوں[3]"۔ جب تک کوئی انسان مرنے کی مشق کر کے دوبارہ زندہ نہیں ہوتا ، وُہ خُدا کی درگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ رُوحانی مشق کے

---

[1] پردہ

[2] اسلامی شرع کے مطابق حضرت محمد صاحب کے مکّہ سے مدینہ منوّرہ چلے جانے کو ہجرت کا نام دیا گیا ہے، اور اسی تاریخ سے مُسلمانوں کا سن ہجری شروع ہوتا ہے۔ سائیں جی اِس عمل کو صوفیانہ انداز میں بیان کرتے ہُوئے کہتے ہیں، کہ رُوح کا نَو دروازوں کے مکّہ سے دسویں دروازہ کے مدینہ میں پہنچنا ہجرت کرنا ہے اور اس کا نَو دروازوں اور کائنات کی کثرت (کُفر) سے آزاد ہو کر اللہ تعالےٰ کے وِصال کی وحدت میں پہنچنا اسلام میں داخل ہو جانا ہے۔

[3] سینٹ I die daily. (1 Corinthians 15 : 31)

ذریعہ "جیتے جی مرنا" ہی آدمی کا جو اس سے علیحدہ ہو کر باطن میں دوبارہ زندہ ہونا ہے۔
کبیر صاحب کہتے ہیں کہ جیتے جی مرنے کا شغل کرنے والے لوگ مایا میں رہتے ہوئے بھی اس سے بے داغ رہتے ہیں، اور وہ ہمیشہ کے لئے جنم مرن کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں ؎

جیوت مرے مرے پھن جیوے ایسے سُن سمایا
انجن ماہہ نرنجن رہیئے بوہڑ نہ بھوجل پایا

(آدگرنتھ صفحہ ۳۳۲)

اولیااللہ سمجھاتے ہیں، جس گھر مر کے جانا ہے وہاں جیتے جی مر کے پہنچ جانا چاہیئے۔ اِس طرح موت کا خوف دُور ہو جاتا ہے، اور ابدی نجات یا لافانی زندگی حاصل ہو جاتی ہے ؎

۱۔ موئیا جت گھر جائیے نت جیو دیاں مر مار

(محلہ ۱ صفحہ ۲۱)

حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں کہ "جیتے جی مرنے" کی مشق کرنے والے انسان آخری وقت بھی باخبر جان دیتے ہیں۔ وُہ اپنے معشوق کے رُوبرو پُرلطف و خوشگوار موت مرتے ہیں۔ مُرشد اُن کی غیب کی آنکھ کھول دیتا ہے۔ باقی لوگ اندھوں کی طرح مرتے ہیں۔ عارف مر کے اپنے محبُوب کی طرف جاتے ہیں، لیکن غافل لوگوں کی جان بے خبری اور خواری کی حالت میں نکلتی ہے۔ جو لوگ ذاتِ کُل کے خوف میں رات کو جاگ کر رُوحانی مشق میں مشغُول رہتے ہیں، وُہ بے خوف مرتے ہیں۔ اور جو آج اس محبوب کی نظر کو ڈھونڈتے ہیں وُہ ہنستے ہنستے جسم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں:- ؎

عاشقانے کہ باخبر میرند، پیشِ معشوق چُوں شکر میرند
اولیاء چشمِ غیب بکشائند، باقیاں جُملہ کور و کر میرند
عارفاں جانبِ نعیم روند!، غافلاں خوار و بے خبر میرند
وانکہ شبہا نخفتہ اندز بیم، جُملہ بے خوف و بیخطر میرند
وانکہ امروز آن نظر جُستند، شاد و خنداں دراں نظر میرند

صُوفی فقیر فرماتے ہیں کہ لافانی زندگی حاصل کرنے کے لئے مرنے سے پہلے مرنا ضروری ہے مرنے

سے پہلے مر کر ہم اپنی جان محبُوب کے حوالے کر کے اپنی مرضی سے اِس زندگی سے پرے جا سکتے ہیں۔

۱۔ بمیر اے دوست پیش از مرگ، اگر مے زِندگی خواہی (حکیم سنائی)

۲۔ پیشِ مُردن بمیر اے نیکو سر، جاں بجاناں دِہ زجان خُود گذر (حافظ)

مولانا روم کہتے ہیں:۔ یہ ایسی موت نہیں ہے کہ جس سے قبر میں جانا پڑے۔ بلکہ یہ ظُلمت سے نُور کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے، جو جشنِ عروسی میں لے جاتی ہے۔

پس تُو جینے جی مرنے سے نہ ڈر کیونکہ اِس جسم کے علاوہ تیرا ایک اَور جسم بھی ہے۔

نے چُناں مرگے کہ در گورے روی
بلکہ از ظُلمت سُوئے نُورے روی

نے چُناں مرگے کہ در گورے روی
مرگ تبدیلی کہ در شورے روی

آں تُوئی کہ بے بدن داری بدن
پس مترس از جسم وجاں بیرُوں شدن

پلٹو صاحب کہتے ہیں کہ موت تو ہر بشر کو آتی ہے، لیکن اصلی مرنا کوئی نہیں جانتا۔ جو شخص جیتے جی مرنا سیکھ لیتا ہے، اُسے ایسی لازوال سرُور کی حالت میسّر ہو جاتی ہے۔ جو ہر اُتار چڑھاؤ سے بالاتر ہے۔

۱۔ مرتے مرتے سب مرے، مرے نہ جانا کوئے
پلٹو جو جیتے مرے، سہج پرائن ہوئے

(بھاگ ۳، ساکھی ۹۹)

داؤد صاحب فرماتے ہیں کہ سچے عاشق تن، من کی ہوش گنوا کر جینے جی مر جاتے ہیں، جس سے اُن کو باطن میں شبد کی بے بہا لذت مِل جاتی ہے۔ اُنہیں رُوح کی پہچان ہو جاتی ہے اور سچے صاحب کا دیدار ہو جاتا ہے۔

ایسی لاگی پرم کی، تن من سب بھُولا

جیوت مرتک ہوئے رہے، گہہ آتم مولا
چیتن چیتہیں نہ بیبرے، مہا رس میٹھا
شبد نرنجن گہہ رہیا، ان صاحب ڈیٹھا

(بھاگ ۱، پرچہ ۳۱۸)

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں کہ سچی فقیری 'جینے جی مرنے' میں ہے، اور رب کو ملنے کا اصل مقصد بھی جینے جی مر کے ہی حاصل ہوتا ہے ۔

۱۔ مندوں نام فقیر تہے سو مندا باہو ۔ جے جیوندیاں مرجاوے ہو
۲۔ باہو مر گئے جو مرنے تھیں پہلے ۔ تناں ہی رب پائیا ہو
۳۔ مرن تھیں مر رہے اگے باہو، جنہاں حق دی رمز پچھاتی ہو

سائیں بلھے شاہ حدیث میں سے "مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا" یعنی (مرنے سے پہلے مرو) کے حوالے سے ہدایت کرتے ہیں کہ مرنے سے پہلے مرنے کی ترکیب سیکھو، کیونکہ اس عمل کا عامل مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ تو درگاہ میں حساب دینا پڑتا ہے اور نہ ہی جہنم کے عذاب سہنے پڑتے ہیں۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد خدا کے ساتھ وصال کرنا ہے جو 'جینے جی مرنے' کے عمل سے ہی حاصل ہوتا ہے ۔

۱۔ مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُو ہویا، مویاں نوں مار جوالی او یار
بُلھا شوہ میرے گھر آیا، کر کر ناچ وکھالی او یار
۲۔ کراں نصیحت وڈی کوئی، جے سُن کر دِل تے لاویں گا
موئے تاں روز حشر نوں اُٹھن، عاشق نہ مر جاویں گا
جے توں مریں مرن توں پہلوں، مرنے دا مُل پاویں گا

نِدا اَور نُور

جیتے جی مَرنے یعنی مکمل یکسُوئی یا سمادھی کی حالت کے حاصل ہونے چشمِ غیب کے کھُلنے اَور دسویں دروازہ میں داخل ہونے سے پہلے شاغل کو باطن میں سُورج، چاند اَور تارے میں سے گُزرنا پڑتا ہے، اِس سے پیشتر کہ وُہ نُقطۂ سویدا تک پہنچے۔ چاند میں سے گُزرنے کے تجربے کا قران شریف (۵۴:۱) میں ذکر آیا ہے۔ اسلام میں یہ روایت ہے کہ حضرت محمدؐ صاحب نے اپنے اندرونی رُوحانی سفر میں چاند کے دو ٹکڑے کئے۔ قران مجید میں یہ ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔

مطلب:۔ وقت قریب آ گیا ہے اَور چاند کے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہر شاغل کو اپنے روحانی سفر میں اس تجربے سے گُزرنا پڑتا ہے۔ شاغل کو باطن میں یہ تجربہ بھی ہوتا ہے، کہ وُہ موت کی وادی پار کر کے دائمی زندگی پانے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ ؎

اسیں مویاں دے پرلے پار، جیوندیاں وِچ بہندے ہاں (بُلّھے شاہ)

آپ کی تعلیم کے مطابق سیاہ زُلف کے اندر پوشیدہ بیضا (نقطۂ سویدا) میں داخل ہونے کے بعد سالِک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اُسے تین قسم کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ اُس کو باطن میں بادل کی گرج سنائی دیتی ہے، صُبح کے سُورج کی لالی دکھائی دیتی ہے، اَور مُرشد کی نُورانی صُورت کا دیدار ہوتا ہے۔

صُورت یُوسف مُزّمل والی ۔ بدلاں گرج سنبھالی او یار
زُلف سیاہ دے وِچ بیضا ، دے چمکار وکھالی او یار
جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا، مرشد والی لالی او یار

اِس کیفیت کو آپ نے دُوسری طرح یُوں بیان کیا ہے ؎

عرش منور بانگاں ملیاں، سُنیاں تخت لاہور
شاہ عنایت کُنڈیاں لائیاں، آپے کھچدا ڈور

اِس نقطے میں داخل ہونے کو سائیں جی نے اَیسے ٹھاکر دوارے میں پہنچنے کا نام دیا ہے جس میں انحد کے بے شمار ناد گُونجتے ہیں، اور رَب کا نُور برستا دکھائی دیتا ہے۔ ؎

جاں میں سبق عِشق دا پڑھیا، مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکرُدے وڑیا، جتھے وجدے ناد ہزار

کئی اَور فقرائے نے بھی اپنے کلام میں اسی حقیقت کا ذِکر کیا ہے۔ خواجہ حافظؒ کہتے ہیں، کہ اگر توجہ کو چھ چکروں اور ساتویں آسمان سے پرے لے جائیں تو باطن میں کلمہ کی پانچ نوبتیں سنائی دینے لگ جاتی ہیں۔ ؎

خاموش پنج نوبت بشنو ترا آسمان تے کال آسمانِ بیروں زاں ہفت و شش ایں آمد

وُہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا کہ معشوق کی منزل کہاں ہے؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہاں سے گھنٹے کی آواز آتی ہے۔

کس ندانست کہ منزل گہِ معشوق کجاست
اینقدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

شمس تبریز کہتے ہیں، کہ اگر خیال کا خیمہ جسم کے چھ چکروں سے اُکھاڑ کر باطن میں ساتویں آسمان میں گاڑ دیں، تو اندر خُدا کے کلمہ کی پانچ نوبتیں سنائی دینے لگ جاتی ہیں۔ ؎

بہ ہفتم چرخ نوبت پنج یابی، چُو خیمہ زِ شش جہت برکندہ باشی

گورونانک صاحب کہتے ہیں کہ جسم کے نَو دروازوں سے اُوپر نجات کا دروازہ ہے، جس کی نشانی یہ ہے، کہ اُس میں رات دِن انحد شبد گونج رہا ہے ؎

نَو دروا جے دسویں مُکتا۔ انحد سبد وجاونیا (محلہ ا، صفحہ ۱۱۰)

آپ اِشارہ کرتے ہیں، کہ ہمارے اندر (آنکھوں کے پیچھے) ایک چراغ روشن ہے جس میں

سے ندائے آسمانی نکل رہی ہے۔ اِس آواز کو سننے سے انسان دُنیا سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور اس کا رب کے ساتھ سچا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

انتر جوت نرنتر بانی، سچے صاحب سیؤ لوِ لائی

(محلہ ۱، صفحہ ۶۳۴)

مولانا رُوم نے بھی اندرونی روشنی اور آواز کا ذکر یُوں کیا ہے: "اُس موسیقی کی تلاش کر جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اُس سُورج کو ڈھونڈ جس کا کوئی زوال نہیں ہے:

بانگ جستے جو کہ آں خاموش نشد

تاب خورشیدے کہ آں آفل نشد (روم)

فنا اور بقا

اِس تذکرہ کے پسِ منظر یہ بات بخُوبی جان لینی چاہیئے کہ صُوفی فُقرا کے فنا فی الشیخ (مُرشد میں سما جانا)، اور فنا فی اللہ (اللہ تعالےٰ میں سما جانا)، کے اصُول کوئی دماغی نہیں، بلکہ ایک عملی رُوحانی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سائیں جی کا سارا کلام اِس خیال کی ترجمانی کرتا ہے کہ رانجھا رانجھا کرتی ہیر خود رانجھا ہو جاتی ہے۔ ذکر اور تصور کے شغل کے ذریعہ رُوح جسم، من اور حواس سے اُوپر اُٹھ کر پہلے مُرشد کی ذات میں اور پھر اللہ تعالےٰ کی ذات میں سما جاتی ہے۔ مُرید کو عملی طور پر رُوحانی مشق کے ذریعے یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اِس کیفیت کو حاصل کرنا ہی ہر سچے صُوفی عامل کی اصل منزل ہے۔

سائیں جی اپنی کافی "نی میں ہُن سُنیا عشق شرع کیہہ ناتا" میں کہتے ہیں:- ؎

"اندر اساڈے مُرشد وسدا، نیہوں لگا تاں جانا"

اِسی طرح ایک اور کافی "کدی اپنی آکھ بلاؤ گے" کے آخری بند میں کہتے ہیں کہ جب تک طالب مُرشد میں جذب نہیں ہو جاتا وُہ باطن میں خُدا کا دیدار نہیں کر سکتا ؎

بُلھا شوہ نُوں ویکھن جاؤگے، اِنہاں اکھیاں نُوں سمجھاؤگے
دیدار تُداں ہی پاؤگے۔ بَن شاہ عنایت گھر آؤگے

آپ اشارہ کرتے ہیں کہ میرا تن من اور جان جو کچھ بھی ہے پیا کا رُوپ ہو چکا ہے۔ اِسلئے مجھے پیا میں ہی سما جانا ہے۔

مَیں بے گُن کیا گُن کیا ہے، تَن پیا ہے مَن پیا ہے
اوہ پیا سو میرا جیا ہے، پیا پیا سے رَل مِل جاؤگے

آپ آگے فرماتے ہیں کہ جب مَیں نے اپنی فنا ہونے والی خودی کو چھوڑ دیا تو خُدا ہی خُدا باقی رہ گیا اور مَیں خود خُدا ہو گیا۔ بے شک اِس راز کو ظاہر کرنے کے لئے مجھے بھی منصُور کی طرح سُولی پر چڑھایا جا سکتا ہے۔

مَیں فانی آپ کو دُور کراں، تَیں باقی آپ حضُور کراں
جے اظہر وانگ منصُور کراں، مجھ سُولی پکڑ چڑھاؤگے
کدی آپنی آکھ بلاؤگے

"نی سَیئو مَیں گئی گواچی" کافی میں بھی آپ اشارتاً کہتے ہیں کہ جب خُودی، نفسِ امّارہ کو فنا کر دِیا تو رُوح وحدۃُ الوجُود میں سما کر اُسی کا رُوپ ہو گئی۔

نی سَیئو[1] مَیں گئی گواچی، کھول گُھنگھٹ مکھ ناچی
جِت وَل ویکھاں اُت وَل اوہی، قسم اوسے دی ہور نہ کوئی
نَحْنُ نَعْلَمُ پھر گئی دُہائی[2]، جَب گور پتری باچی
نام نشان نہ میرا سَیئو، جو آکھاں تُسیں چُپ کر رہیو
ایہہ گل مُول کِسے نہ کہیو، بُلھا خُوب حقیقت جاچی[3]

---

[1] سہیلیو [2] دہائی [3] پہچانی

امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

من تو شُدم تو مَن شُدی مَن تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں مَن دیگرم تو دیگری

مطلب:۔ میں تو ہو گیا، تو میں ہو گیا۔ میں جسم ہوں تو اس میں جان ہے۔ اب اس کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اور ہوں تو اور ہے۔

کبیر صاحب نے بھی بعینہٖ کہا ہے:

کبیر توُ توُ کرتا توُ ہُوا مجھ میں رہی نہ ہُو
جب آپا پر کا مٹ گیا جت دیکھوں تت تُو

خواجہ معین الدین چشتی فرماتے ہیں، کہ جب میں اس میں جذب ہو گیا تو نہ گناہ رہا اور نہ ہی ثواب۔ میری ایسی حالت ہو گئی ہے کہ میں وُہ ہو گیا اور وُہ میں ہو گیا: ؎

نہ عصیاں ماند نے طاعت شُدم محو اندراں ساعت
چناں گشتم در آں حالت کہ وی مَن گشت من ہم وے

اسی موضوع پر مولانا رُوم لکھتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے آپ کو نہیں کھو دیتا، تب تک وُہ خدا کی درگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ؎

ہیچ کس را تا نگردد اُو فنا نیست راہ در بارگاہِ کبریا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کیفیت کا سمجھنا عقل سے بعید ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے، کہ سمندر میں ملا قطرہ نہ تو قطرہ اور نہ ہی سمندر کے نام سے جانا جا سکتا ہے۔ اس راز کو وُہی سمجھ سکتا ہے، جسے اس کا تجربہ ہُوا ہو ؎

دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم
نداند ہیچ کس ایں سِرّ مگر آنکس چنیں باشد (عطار)

گورو ارجن دیوجی بھی لکھتے ہیں کہ جیسے پانی میں پانی مل کر ایک ہو جاتا ہے، اسی طرح رُوح کا نور خدا کے نور میں مل کر ایک ہو جاتا ہے۔ ؎

جیو جل میں جل آئے کھٹانا۔ تیو جوتی سنگ جوت سمانا (آدگرنتھ، صفحہ ۲۷۸)

کلمہ

سائیں جی نے پیچھے سمجھایا تھا کہ جب رُوح جسم کے نو دروازے خالی کر کے دسویں دروازہ میں پہنچ جاتی ہے، تو وہاں کلمہ یا بانگِ آسمانی کے ساتھ جُڑ جاتی ہے۔ یہ کلمہ مقامِ حق سے آرہا ہے، اور یہی رُوح کو اپنے ساتھ مِلا کر اس کو روحانی طبقات پار کرداتا ہوا واپس اپنے آخری رُوحانی مقام پر لے جانے کا کام کرتا ہے۔

کلمہ کو سنتوں مہاتمائوں نے ناد، شبد، انحد شبد اور انحد ناد وغیرہ کہا ہے۔ صُوفی درویشوں نے اِس کو کُن، خُدا کا کلمہ، خُدا کا کلام۔ بانگِ آسمانی۔ ندائے سُلطانی۔ کلامِ الٰہی، بانگِ[1]، صَوت، اِسمِ اعظم، سُلطانُ الاذکار وغیرہ کئی ناموں سے بیان کیا ہے۔ مُرشِد کی مدد سے باطن میں اِس کلمہ کے ساتھ وابستگی کو ہی مُرشد کے ہاتھوں بیعت ہونا یا مُرشد کے کلمہ میں آنا کہا جاتا ہے۔ سائیں جی کہتے ہیں کہ میں عاجز تو علم کے قلعے کے اندر بند تھا، مُرشد اپنی بخشش سے مجھے کلمہ میں لے آیا۔ پھر معلوم ہوا کہ کلمہ کے بغیر اِنسان حقیر ہے اور بغیر کلمہ کے اِس دُنیا سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اسیں عاجز[1] وِچ کوٹ[2] علم دے او سے آندے وِچ کلم[3] دے
بنا کلمے دے ناہیں کم دے باجھوں کلمے پار نہیں

کلمہ کی دو قسمیں

کلمہ دو قسم کا ہے: صفاتی اور ذاتی۔ اِنہیں کو سنتوں نے "ورنا تمک" اور "دُھن آتمک" کہا ہے۔ ایک تو اللہ تعالےٰ کی صفات پر رکھے گئے اس کے بے شمار نام ہیں جو لکھنے، پڑھنے یا

---

[1] لاچار [2] قلعہ [3] کلمہ

بولنے میں آجاتے ہیں۔ یہ صفاتی یا ورناتمک نام ہیں۔ خُدا، اللہ، کریم، رحیم، پرماتما، رام، گردھاری، مُراری، اہرمزد، گاڈ، واہگورو وغیرہ سب اسم صفاتی یا ورناتمک نام (Descriptive names) کہلاتے ہیں۔ دوسرا نام، سچا کلمہ، سچا شبد، یا سچا نام ہے۔ یہ خدا کی کائنات کی تخلیق کرنے والی قوّت ہے، جو آواز اور نور کی لہروں کی شکل میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں اور ہر انسان کے اندر سمائی ہوئی ہے۔ کُن، کلمہ، شبد یا نام ہی مخلوق کا خالق ہے۔ اِسی پر کائنات کا انحصار ہے۔ اور پھر یہی دُنیا سے نجات دلانے والی اصل قوّت ہے۔ تمام فقرائے کامل ازل سے اِس سچے کلمہ کی صِفت کرتے چلے آرہے ہیں، کیونکہ یہ خُدا سے ملنے کے لئے خدا کا ہی تجویز شدہ ہر بشر کے اندر رکھا گیا قدرتی ذریعہ ہے۔ یہ کلمہ ذرّے ذرّے میں سمایا ہوا ہے۔ اس میں سب کچھ جاننے اور کرنے کی طاقت ہے۔ درحقیقت کلمہ ہی خُدا کا رُوپ ہے۔

شاہ نیاز نے اسے یُوں بیان کیا ہے:-

۱۔ عالم از صوت ایں ظہور گرفت ۔ از حضورش لباط نُور گرفت

مطلب:- دُنیا اس آواز سے پیدا ہُوئی، اور اِس کے ظہور سے نُور پھیل گیا۔

۲۔ ہمہ عالم پُر است از آواز ۔ لیک در ہائے گوشِ خود کُن باز

مطلب:- تمام عالم آواز سے پُر ہے، لیکن اسے سُننے کے لئے اپنے کانوں کے دروازوں کو کھولنا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ کامِل فقیروں کی کلمہ، کلام، اَمر، حُکم، کُن، شبد یا نام سے مُراد کِسی بھی زبان کے کِسی خاص لفظ یا جُملہ سے نہیں، بلکہ خُدا کی کائنات کو پیدا کرنے والی اور پیدا شُدہ مخلوق کو دوبارہ خود میں ملانے والی طاقت سے ہے۔ سائیں جی کا کلام اس طاقت کے بیان سے بھرپُور ہے۔ آپ نے اس طاقت کو نام، ناد، انحد ناد، شبد، انحد شبد، انحد کا باجا، عارف کا باجا، انحد کی مُرلی، انحد کی بنسی، انحد کی تار، نحن اقرب کی بنسی، گنجِ مخفی کی مُرلی، کُن فیکون کی آواز غرضیکہ اِسے کئی ناموں سے پکارا ہے۔ اِن ناموں میں متعدد مُلکی، غیر مُلکی، اسلامی اور ہندوی نام شامِل ہیں۔ اِن الفاظ کے اِستعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اُن کے ذریعے اُس مُشترکہ

طاقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو رُوح کو باطن سے ملانے کا واحد قُدرتی ذریعہ ہے۔
اِس سے متعلقہ سائیں جی کی مندرجہ ذیل کافی "بنسی اچرج کاہن بجائی" مطالعہ کی مستحق ہے

بنسی اچرج کاہن بجائی

بنسی والیا چاکا رانجھا، تیرا سُر سب نال ہے سانجھا
تیریاں موجاں ساڈا مانجھا[1]۔ ساڈی سُرتی آپ ملائی
بنسی والیا کاہن کہاویں، شبد انیک انوپ[2] سناویں
اکھیاں دے وِچ نظر نہ آویں۔ کیسی بکھڑی کھیڈ رچائی
بنسی سب کوئی سُنے سناوے، ارتھ ایہدا کوئی ورلا پاوے
جو کوئی انحد دی سُر پاوے، سو اِس بنسی دا شیدائی
سُنیاں بنسی دیاں گھنگھوراں۔ کوکاں تن من وانگوں موراں
ڈِٹھیاں اس دیاں توڑاں جوڑاں۔ اک سُر دی سب کلا[3] اُٹھائی
اِس بنسی دے پنج سَت تارے۔ آپو اپنی سُر بھر دے سارے
اِکو سُر سب وِچ دم مارے، ساڈی اس نے ہوش بھلائی
اِس بنسی دا لمّا لیکھا، جس نے ڈھونڈا اُنس نے دیکھا
سادی اِس بنسی دی ریکھا، ایس وجودوں صفت اُٹھائی
بُلھا بیج سپیئے تکرار، بوہے آن کھلوتے یار
رکھیں کلمے نال بیوپار، تیری حضرت بھرے گواہی
بنسی اچرج کاہن بجائی

آپ نے اِس کافی میں انحد شبد کی بنسی کی صفت کی ہے، لیکن آخری مصرعے میں اس کو کلمہ کہا ہے،
جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ شبد یا انحد شبد اور کلمہ کو ایک ہی معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔
آپ خُدا اور مُرشد دونوں کو "بنسی والا رانجھا" یا "بنسی والا کاہن" کہتے ہیں۔ یعنی مُرشد اور خُدا دونوں

---

[1] بُری حالت [2] بے مثال [3] شکتی، طاقت۔

کی ہستی کا جوہر شبد یا کلمہ ہے۔ اس بنسی کا "سُر سب نال سانجھا" ہے۔ یعنی تمام کائنات میں اِس کی آواز گُونج رہی ہے۔ "ساڈی سُرتی آپ ملائی" یعنی سُرت، شبد، مُرشد اور خُدا، سب کی ہستی کا جوہر ایک ہونے کی وجہ سے ہی یہ ایک دوسرے میں سما سکتے ہیں، کیونکہ صرف ہم جنس ہی آپس میں یکجان ہو سکتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں، کہ باہر کی بنسی تو سب لوگ سُنتے ہیں لیکن انحد کی بنسی کا علم صرف چند لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک بار اس کے متوالے بن جاتے ہیں، اُن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات کو ظہور میں لانے والی طاقت بھی یہی ہے۔ ؎

"اِک سُر دی سب کلا اُٹھائی"

"اس بنسی دا الما لیکھا": یہ کلمہ لا انتہا ہے۔ اس کی "سادی ریکھا": یہ دُوئی اور کثرت سے مُبّرا ہے۔ "ایس وجودوں صفت اُٹھائی": اس کے ذریعے ہی ہستیِ مُطلق سے صفات یعنی جوہر پیدا ہوئے جن سے ساری کائنات وجود میں آئی۔

"اِس بنسی دے پنج ست تارے، اَکو سُر سب وِچ دَم مارے":

یہ آواز ایک ہے، لازوال ہے اور قائم بالذات ہے۔ یہی ایک آواز الگ الگ رُوحانی طبقات میں الگ الگ طرح سے سنائی دیتی ہے۔ عام طور پر فقرا کے مطابق مقدم روحانی طبقات کی تعداد پانچ ہے، جبکہ کُچھ فُقرا نے یہ تعداد سات سے چودہ تک بتائی ہے۔

اِس انحد کی آواز میں سما کر رُوح ہر قسم کی کثافت سے آزاد ہو کر محبُوبِ حقیقی کی پناہ میں آ جاتی ہے۔ ہر قسم کے اعمال کو چھوڑ کر اِس کلمہ کے ساتھ ہی تعلق رکھنا چاہیئے۔ ؎

رکھیں کلمے نال بیوپار، تیری مُرشد بھرے گواہی

آپ نے "آؤ فقیرو میلے چلیئے" میں کلمہ کو "انحد کا باجا"، "عارف کا باجا" یا انحد شبد کہا ہے۔ آپ کہتے ہیں: فقیری یا جوگ ظاہری لباس کا نہیں، بلکہ من کو باطن میں انحد کے باجا میں فنا کرنے کا نام ہے: ؎

قائم کرو مَن باجا رے

اِس کلمہ کے ساتھ ملاپ کئے بغیر دُنیا کا میلہ کوڑی کام کا نہیں۔ کلمہ کے بغیر اصل اَور وجود (انسانی قالب اَور نیک اعمال) فضول بنائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو انسان باطنی کلمہ کے ساتھ ملاپ کر لیتا ہے کلمہ اس کو نیڑے سے خُدا بنا دیتا ہے ے

آؤ فقیرو میلے چلیئے ، عارفؔ کا سُن واجا رے
انحد شبد سُنو بہو رنگی ، تجیئے بھیکھ پیاؔجا رے
انحد واجا سرب ملاؔپی ، ترؔ وَیری سِرؔ ناجا رے
میلے باجھوں میلہ اَوترؔ ، رُڑھ گیا مُول ویاجا رے
کٹھنؔ فقیری رستہ عاشق ، قائم کرو مَن باجا رے
بندہ رَب بھیو اِک مُبھا ، سُکھ پڑا جہان براجا رے

سائیں جی نے کلمہ یا انحد شبد کو "کُن فیکُوُن" کی آواز کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے کہ خُدا کا حُکم یا کلمہ ہی کائنات کا خالق ہے۔ آپ نے اِس کو "گنج مخفی دی منبری" یعنی خُدا کا پوشیدہ خزانہ بھی کہا ہے۔ اِسی کو آپ نے "لامکاں کی پٹڑی پر بیٹھ کر بجایا جانے والا ناد

لے خدا رسیدہ انسان ؎ بناوٹی، دکھاوا ؎ سب کو ملانے والا، کچھ کتابوں میں سَرب ملاپی ہے۔ جس کا مطلب ہے جلدی ملاپ کروانے والا۔ ؎ کلمہ کی مکمل وحدت کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ وَیر دُشمنی، کی بنیاد دُوئی ہے۔ ؎ ناجا = سوراخ ، سرناجا = سر کا سوراخ ، اشارہ نقطۂ سویدا کی جانب ہے۔ ؎ فضول۔ ؎ سچی فقیری اَور سچے عاشق ؎ سچی فقیری اَور سچے عاشق کا اصل راستہ مَن کو اَندر شبد یا کلمہ سے جوڑنا ہے جو بہت مشکل ہے۔

؎ گورو نانک نے بھی کہا ہے : "کیتا پساؤ ایکو کواؤ" یعنی کائنات خُدا کے حُکم یا کلمہ سے وجود میں آئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے بارے میں اِس قسم کے اشارے دُنیا کی دیگر مذہبی کتابوں میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔

بھی کہا ہے۔ اور اسی کو عرشی کرسی (آسمانی تخت) کی بانگ کا نام بھی دیا ہے۔

۱۔ توں آئیوں تے میں نہ آئی۔ گنج مخفی دی نیں مُرلی بجائی
آکھ الست گواہی چاہی، اوتھے قالوا بلیٰ سُنایا ای
تسبیؤ مُہن میں ساجن پائیوا ای

۲۔ بلھا! لامکاں دی پٹڑی اُتے بہہ کے ناد وجاواں گی

۳۔ عرش کرسی تے بانگاں ملیاں، مکّے پے گیا شور

کلمہ کی صفت۔ دیگر فقرا کی زبان سے

سنت نامدیو جی اشارتاً فرماتے ہیں کہ ہم لافانی طبقات میں انحد کی بین بجا کر مقامِ حق میں پہنچ سکتے ہیں۔ ؎

بید پران ساستر آنندا گیت کبت نہ گاوؤ گو
اکھنڈ منڈل نرنکار مہہ انحد بین بجاوؤ گو
بیراگی رامہہ گاوؤ گو
سبد انیت انا حد راتا آکل کے گھر جاوؤ گو

(آدگرنتھ، صفحہ ۹۷۲)

بلھو صاحب کہتے ہیں کہ انسان روحانی طبقات میں جا کر خدا کا کلمہ سن کر اس کی تان میں ہی سما جاتا ہے ؎

پُرش الاپے تان، سُنا میں ایک ٹھو جائی
واہی تان کے سُنت، تان میں گئی سمائی

(بھاگ ۱، کنڈلی ۱۷۵)

؎ بغیر بجائے بجنے والے لاتعلق کلمہ میں سما کر اہل و عیال سے مبرا خدا کے ساتھ ملاپ کرونگا۔

حضرت عیسیٰ کہتے ہیں: "دیکھو آسمان میں دَروازہ کھول دیا گیا اور جو پہلی آواز مجھے سُنائی دی وُہ ایسی تھی جس طرح بِگُل مجھ سے بات کر رہا ہو۔ اُس نے کہا: تو اِدھر آ! میں تجھے اِس سے آگے کی اشیاء دکھاؤں"[1] پھر کہتے ہیں: "میں رُوح میں تھا (یعنی جسم سے اُوپر اُٹھ چکا تھا) اور میں نے بِگُل کی بھاری، اُونچی آواز سُنی"[2]

خواجہ حافظ کہتے ہیں:۔ اگر وُہ ہمارا مُغنّی اُس نغمہ کو گائے، تو بُوڑھے پرہیزگار بھی مستی میں آکر ناچنے لگیں۔ ؎

گر مُطربِ حریفاں ایں پارسی سراید
در رقص حالت آرد پیرانِ پارسا را۔

آپ نے اندر رُوحانی طبقات میں الگ الگ طرح کی سُنائی دینے والی آواز کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ نے کلمہ کی اِن مُختلف آوازوں کو سُننے کی تلقین کی ہے۔

بشنو کہ مُطربانِ چمن راست کردہ اند
آہنگِ، چنگ و، بربط و طنبُور و نای و نے

مولانا رُوم کہتے ہیں: حضرت محمدؐ صاحب نے فرمایا ہے کہ میرے کانوں میں خُدا کی آواز عام آواز کی مانند آ رہی ہے۔ خُدا نے تمہارے کانوں پر مہر لگا رکھی ہے، تاکہ تُم یہ آواز نہ سُن سکو۔ ؎

گفت پیغمبر کہ آوازِ خُدا
مے رسد در گوشِ مَن ہمچو صدا
مُہر بر گوشِ شُما بنہاد حق
تا بہ آوازِ خُدا نارد سبق

---

[1] Behold a door was opened in heaven and the first voice which I heard was as it were, of a trumpet talking with me: which said: Come up hither and I will show thee things which must be hereafter. (Rev. 4 : 1)

[2] I was in the spirit on the Lord's day, and heard behind me a great voice, as of a trumpet. (Rev. 1 : 10)

"اقتباس الانوار" کے مصنف حضرت مولانا شیخ محمد اکرم صابری نے اِس کتاب کے صفحات ۳۶ اور ۱۰۶ پر لکھا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کئی سال تک غارِ حرا میں آوازِ مستقیم یا سلطانِ الاذکار، (سلطان الاذکار یا اسمِ اعظم) کی مشق میں مشغول رہے[1]۔ اِسی کتاب کے صفحہ ۱۰۶ پر لکھا ہے کہ قادری صوفی فرقہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا، کہ پیغمبر چھ سال غارِ حرا میں شغلِ سلطانُ الاذکار میں مستغرق رہے تھے اور میں نے بھی اِسی متبرک غار میں بارہ سال رُوحانی مشق کی تھی[2]۔

محمد دارا شکوہ لکھتا ہے، کہ سارا عالم اللہ تعالےٰ کے کلام کی آواز اور تجلی سے بھرپور ہے پھر بھی اندھے لوگ پوچھتے ہیں کہ خدا کہاں ہے، کانوں میں سے عیاری اور نفسِ امّارہ یا خودی کے پنبے نکال دو، تاکہ کائنات کے حقیقی خالق کی بارگاہ سے آرہی کلمہ کی آواز کو سُن سکو۔ معلوم نہیں لوگ قیامت کے دِن بجنے والے بگُل کا انتظار کیوں کر رہے ہیں، جبکہ کلمہ کے بگُل کی آواز ہر وقت خُدا کی درگاہ سے ہر بشر کے اندر گونج رہی ہے ؎

برآور پنبۂ پندارت از گوش[3]
ندائے وحدت اَلنمہار نہی اوش

ندا می آید از حق بر دوامت
چرا گشتی تو موقوفِ قیامت

---

[1] "چوں آنحضرت (محمدؐ)، بہ سنِ چہل سالگی رسید آثارِ وحی بروئے ظاہر گشت۔ بروائیتے آنکہ پانزدہ سال از وحی آوازِ مستقیم مے شنید، وخواب ہائے راست میدید، و ہفت سال پیش از وحی انوار تجلیات میدید، ودو سال یک مرتبہ بغارِ حرا میرفت و یک ماہ بہ عبادت مشغول میشد۔"

[2] حضرت شاہ میر لاہوری قدس سرہٗ روائیت کردہ آنحضرت عبدالقادر جیلانی فرمود، کہ پیغمبر شش سال در غارِ حرا مشغول بہ سلطان الاذکار بودند۔ ومن درآں غارِ متبرکہ دو از دہ سال بہ ایں شغل اشتغال نمودہ ام۔

[3] رسالۂ حق نما، صفحہ ۱۶

مولانا روم فرماتے ہیں :۔

پنبۂ وسواس بیروں کن ز گوش، تا بگوشت آمد از گردوں خروش

یعنی وسوسوں کی روئی کان سے نکال تا کہ تیرے کان میں آسمانی آواز آ سکے۔

دارا شکوہ کہتے ہیں کہ کلمہ کی مشق سب سے اعلیٰ روحانی عمل ہے۔ آپ حدیثوں، حضرت محمد صاحب کی نیک و پاک اہلیہ معظمہ بی بی خدیجہ، حضرت غوث الثقلین اور اپنے مرشد کے حوالے سے کہتے ہیں، کہ حضرت محمد پیغمبر بننے سے پہلے اور بعد ازاں بھی کلمہ کی آواز کو باطن میں سننے کا شغل کیا کرتے تھے۔[۱]

---

[۱] "This practice of hearing the voice of the silence is path of the Faqirs, the Sultan-ul-azkar or the king of all practices.

"This sound existed from before the creation of the worlds, and exists even now and will continue to exist even when the worlds enter into non-existance. This sound is called the infinite and absolute sound. There is no practice higher than that of hearing this sound."

From many authentic traditions, collected in the six authentic Hadis Volumes, we learn that our Prophet (may the blessing and peace of God be on him) was devoted to this practice, both before and after his attaining the rank of prophethood. But none of the learned men have found out the secret of this mystery, and have not consequently tried to practise it."

"A story is related from our blessed lady Khadjia, that she used to relate the following about the Prophet : The Prophet, before he became inspired, used to go into a cave called the cave of Hurrah, which is a famous and well-known cave in the suburbs of Mecca. He used to take with him there some bread (for he remained there for days together absorbed in his meditation). There he used to practise this hearing of sound. The result of this practice was that the form of Gabriel appreared before him, and that was the commencement of the inspiration of that leader of mankind, and all that followed after that event is well-known to every one, and needs no recounting here."

"Hazrat Mianji used to say that Ghau-us-saqlain ralated, "Our Prophet was in the cave of Hurrah for six years plunged in this meditation of Sultan-ul-azkar, and I myself have been in that cave for twelve years engaged in the practice of this meditation, and many wonderful and mighty things have been revealed to me."

Muhammad Dara Shikoh, Risala-i-Haq-Numa, (The Compass of Truth), English rendering by Rai Bahadur Srisa Chandra Vasu ; Published by The Panini Office, Bhuvaneswari Asrama, Allahabad : 1912 : pp. 16-19.

حضرت سُلطان باہُو نے بھی کہا ہے کہ کلمہ کی مشق لاکھوں گناہگاروں کو پار اُتارنے والی اور عام لوگوں کو ولی اللہ بنانے والی ہے ؎

ک ۔ کلمے لکھ کروڑاں تارے ولی کیتے سے راہی ہُو
کلمے نال بجھائے دوزخ جتھے اگ بلے ازگاہی ہُو

حضرت جلّی (ولادت ۱۳۶۵ء) اپنی نامور تصنیف "الانسان الکامل" میں "حقیقت المحمدیہ" کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسکے لاتعداد اسمأ میں سے اس کا ایک اسم "کلمہ" یا "امرُاللہ" ہے اور وُہ تمام کائنات سے بلند اور سرفراز ہے ۔ اُس کی شان سب سے اعلےٰ ہے ۔ دُوسرا کوئی اس کا ثانی نہیں۔ اِس سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ نہ صرف کلمہ کی مشق ہی اصلی عمل ہے بلکہ پیغمبر کی ہستی کا سب سے مخصُوص پہلو اِس کے اَندر عمل پذیر خُدا کا کلمہ یا امر ہے۔

بزرگُوں سنت شبد میں سما کر شبد رُوپ ہو چکے مردِ کامل کے سوا کسی دُوسرے کو مُرشد نہیں مانتے ۔ گوُرو نانک صاحب فرماتے ہیں کہ خُدا مرشد کی ذات میں سما کر شبد کی دولت بانٹتا ہے ؎

گوُرمہہ آپ سموئے سبد ورتائیا

(محلہ ۱ ، صفحہ ۱۲۷۹)

"ملسی صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے کامل فقراء نے ہی نہیں بلکہ کئی مُسلمان کامل فقیروں نے بھی سلطان الاذکار یا رُوح کو شبد کے ساتھ جوڑنے کے شغل یعنی "سُرت شبد یوگ" کا ہی پرچار کیا ۔ ؎

۱ ۔ سُرت ملے شبد میں جا ئی ۔ یہ سب سنتن نتھ بتائی
۲ ۔ منصُور سرمد بُو علی اور شمس مولانا ہُوئے
پہنچے سبھی اِس راہ سے ، جس نے کہ دِل پختہ کیا

ٓ "One of his names is Word of God (Amru'llah) and he is the most sublime and exalted of all existence. In regard to dignity and rank he is supreme."

John A. Subhan, Sufism—Its Saints and Shrines : The Lucknow Publishing House, Lucknow, 1960, p. 59.

کبیر صاحب فرماتے ہیں کہ دُنیا کی مذہبی کتابوں کا دو حرفی نچوڑ رُوح کو کلمہ سے جوڑنا ہے۔ کیونکہ یہی خُدا سے وصال کا اصل ذریعہ ہے ؎

کبیر آدھی ساکھی یہ کوٹ گرنتھ کر جان
نام ست جگ جھُوٹھ ہے سُرت شبد پہچان

(کبیر۔ ساکھی سنگرہہ)

گورو نانک صاحب فرماتے ہیں، کہ من کو قابُو کرنے اور خُدا سے مِل کر جاودانی راحت حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وُہ ہے سُرت کو شبد میں سمو دینا۔ دوسرے کسی وسیلہ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ؎

رام نام من بیدھیا اور کی کری وچار۔ سبد سُرت سُکھ اُوپجے پربھ راتو سُکھ سار (نخلہ ۱، صفحہ ۶۲)

پلٹُو صاحب فرماتے ہیں ؎

سُرت سبد کے مِلن میں، مجھ کو بھیا آنند
مجھ کو بھیا آنند، مِلا پانی میں پانی
دوؤ سے بھا سُوت، نہیں مِل کے الگانی
پلٹُو ستگورو صاحب، کاٹے میری بند
سُرت سبد کے مِلن میں، مجھ کو بھیا آنند

(بھاگ ۱، کنڈلی ۸۹)

سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باطن میں کلمہ کی مخفی بانسری کا راگ ظاہر ہو گیا، تو من وجد میں آگیا اور دُنیا سے بے نیاز ہو گیا، اور محبُوب کے ہجر کا احساس گہرا ہو گیا۔ انحد شبد کے تیر سے من کا چنچل ہرن قابُو میں آگیا اور یہ عالمِ مستی میں عشقِ الٰہی کا درس پڑھنے لگ گیا ؎

مُرلی باج اُٹھی اَن گھاتاں[1]، سُن کے بھُل گئیاں سب باتاں

---

[1] اپنے آپ : اچانک

لگ گئے خدبان نیارے ۔ سائیں مکھ وکھن وِچارے
ہُن مَیں چنچل مِرگ پھہایا[1] ، اوسے مینوں بنھ بہایا
صرف دوگانہ عشق پڑھایا ، رہ گئیاں ترے چار رکعاناں

جوں جوں کلال (ساقی: مُرشد) انحدشبد کے جام بھر بھر کے پلاتا ہے، رُوح اس کی مستی میں مخمور ہوتی جاتی ہے۔ پھر یہ محبوب کی ایک لمحہ کی فُرقت بھی گوارا نہیں کرتی ۔

انحد واجہ وجے سُہانا ، مُطرب سُگھڑاں تان ترانا
نماز روزہ بُھل گیا دُگانہ ، مد پیا سے دین کلال نی
گھڑیالی دیئو نِکال نی ۔ اج پی گھر آیا لال نی

ایسے درویش کے لئے ہندوؤں کے 'ناد' اور مُسلمانوں کی 'بانگ' کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُس کو اِس حقیقت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ 'ناد' 'بانگ' اور انحدشبد ایک ہی اصلیت کے مختلف نام ہیں ۔

جب جوگی تم وصل کرو گے ۔ بانگ کہو بھاویں ناد وجاوے
بھگتی بھگت نتارو ناہیں ، بھگت سوئی جیہڑا من بھاوے

آپ کلمہ یا 'ناد' کو ہی " رسُولؐ کی بانگ" کہتے ہیں، جس کو سُن کر پھُول کھل جاتا ہے یعنی ازل سے اُوندھا پڑا دِل کا کنول سیدھا ہو جاتا ہے۔ پھر باطن میں ہی مُرشد کے ساتھ وِصال ہو جاتا ہے جو نبی کے ساتھ ملاپ کراتا ہے[2]۔ وہاں پہنچ کر عاشق کی رُوح لمحہ بھر کے لئے بھی اُس صُورت کی فُرقت برداشت نہیں کرتی اور ہمیشہ کے لئے مُرشد میں جذب ہو جاتی ہے ۔

---

[1] چنچل مَن فا بُو کر لیا۔

[2] داراشکوہ نے بھی 'رسالۂ حق نما' کے صفحہ ، پر اشارہ کیا ہے کہ جب ہم صحیح طریق سے عبادت میں مشغُول رہتے ہیں تو روحانی ترقی کرتے ہُوئے ایسی کیفیت میں پہنچ جاتے ہیں جہاں باطن میں مُرشد کی نُوری صُورت ظاہر ہو جاتی ہے جو طالب کی حضرت محمدؐ، اور دیگر فقیروں سے مُلاقات کرواتی ہے۔

۱۔ مِلی بانگ رسولؐ دی پُھل کھِڑیا میرا
سَدا ہوئیا مَیں حاضری ہاں حاضر تیرا
ہر پَل تیری حاضری ایہو سجدہ میرا
۲۔ جیہڑا تن وِچ لگا دُو آرے، ایہہ کون کہے مَیں مُو آرے
تن سجھ عنایت ہُو آرے، پھر بُلھا نام دھرایا ہے

سائیں جی نے "تن سجھ عنایت ہُو آرے"، "اندر ساڈے مُرشد وسدا"، "رانجھا رانجھا کردی نی مَیں آپے رانجھا ہوئی"، "مَیں نوں کوئی نہ مجنوں آکھے، مَیں تن لیلیٰ مُندی جاں" وغیرہ کے اشارے دیئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مُرشد کی ہستی کی بنیاد کلمہ یا شبد ہے اور طالب کی ہستی کی بنیاد سُرت یا رُوح ہے اور پھر دونوں کی بنیاد خُدا یا اس کا کلمہ ہے۔ رُوح باطن میں کلمہ میں سما کر پہلے مُرشد میں اور پھر اللہ تعالےٰ میں جذب ہو جاتی ہے۔

رُوحانی شغل کا حاصِل مقصد

طالب کو جو کچھ حاصِل ہو گا نام یا کلمہ کی کمائی سے ہو گا۔ اس لیئے سائیں جی نے طالب کو عاقبت کی یہ دولت یا وقتِ رحلت کام آنے والا توشہ اکٹھا کرنے کی بار بار تاکید ہے ۔

۱۔ اِک رَب دا ناں خزانہ اے،
سنگ چوراں یاراں دانا اے
اوہ رحمت دا خصمانا اے،
سنگ خوف رقیب بنایا اے
۲۔ بُلھا ایتھے رہن نہ مِلدا، روندے پَنڈے چلّے
اِکو نام اوسے دا خرچی، پیسہ ہور نہ پَلّے

مَیں سُپھنا سبھ جگ بھی سُپھنا، ہور سپھنا لگے بیانا[1]

خاکی خاک سیتُوں رَل جانا

۳. کیا سردھن[2] کیا تردھن[3] پوڑے، ا پنے اپنے دیس کو دَوڑے

لَدھا نام لئے لیئو سبھارے، اَب تو جاگ مُسافر پیارے

۴. بُلھا[4] بات انوکھی ایہہ، بچّن تگی تاں گھونگھٹ کیہا

تسیُں پردہ اکھیّں تھیں چاؤ، تسیں رَل مِل نام دھیاؤ

آپ سمجھاتے ہیں کہ بھُوک برداشت کرنی اور رَب کا نام جپنا دونوں مشکل کام ہیں لیکن بھُوکے آدمی کو مرتے ہُوئے بھی رَب کا نام جپنا چاہیئے۔ کیونکہ یہی انسانی جسم کو کامیاب بنانے والا۔ بحرِ حیات سے پار اُتانے والا اور عاقبت کو سنوارنے کا واحد ذریعہ ہے ؎

۱۔ بھُکھ مرندی نام اللہ دے، ایہو بات چنگیری اے

دووِیں تھوک بیتر بھیں بھاری، اَوکھی جیہی ایہہ پھیری اے

۲۔ نام سائیں دے کنڈے لوائے، کھِڑ ہیّی گلزار

واہ واہ چھنج پئی دَربار

اِس موضوع کے پسِ منظر اگلے صفحات میں دیئے گئے نام یا شبد کے بارے میں الگ الگ فرقوں میں ہُوئے فقرأ کے خیالات توجّہ کے مستحق ہیں۔

ہندو رشیوں مُنیوں نے اکو شبد انحد شبد۔ ناد، واک، آکاش بانی، دِوّیہ دھنی، رام دھن وغیرہ کہا ہے اور اس کو دنیا کا خالق مانا ہے۔[5] سام وید میں آتا ہے کہ شبد ہی خدا ہے اور شبد ہی خالق ہے ؎

---

[1] بیانا = دوسرا، کلمہ کو چھوڑ کر باقی سب خواب یا جھوٹ ہے۔ گورو ارجن دیو جی نے بھی فرمایا ہے ؎

کھوجت کھوجت کھوجیا نامے بن کوڑ۔ (محلہ ۵، صفحہ ۸۱۱)

[2] سردھن = امیر۔ [3] نردھن = غریب۔ [4] آنکھوں سے لاعلمی کا پردہ اٹھا دو۔

[5] "There is a hymn which celebrates Vac, (Speech) as the supporter of the world, as the companion of the gods, and the founda-

(باقی اگلے صفحہ پر)

"شبد برہم نِشبد برہم پر نوو برھم"

اُپنشد شبد انحد شبد، واک، اُم دگیت یا آکاش بانی کی تعریف سے بھرے پڑے ہیں۔ قدیم یونانی فقراء نے خدا کی اِس تخلیقی قوت کو لوگوس کہا ہے۔ لوگوس کی تعریف میں کہا گیا ہے: لوگوس ایک ہے۔ ہمہ جا موجود اور یکساں ہے۔ ہر انسان خودی کی پہچان کے ذریعے باطن میں اس سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ یہ تمام کائنات و بالائی طبقات کو چلانے والا اصول یا آئین ہے: یہ رب کا قانون اور رب کی رضا ہے: یہ خود خدا ہے۔ یہ ازلی ہے، کائنات کا اصل سبب ہے، مگر لوگ اس کی اصلیت کو نہیں پہچانتے۔ یہ رب اور انسان کو ملانے کا وسیلہ ہے۔ یہ سب سے پاک اور سچا راستہ ہے۔ یہ ابدی ہے زندگی ہے اور سب سے اعلیٰ اخلاق کی ترغیب دینے والا ہے۔ یہ خدا کے حضور سب انسانوں کی طرف سے دُعا گو مذہبی پیشوا اور ان کو خدا سے ملانے کا وسیلہ ہے۔[1]

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے۔)

tion of religious activity and all its advantages. She appears as impelling the Father in the beginning of the things and again as born in the waters. This idea which of course, has long ago been compared by Weber with the Greek Logos is ingenious : The will of the creator is thus considered as expressed in Speech." **Religion and Philosophy of the Vedas**, Harvard and Oriental Series Vol. 32. pp. 435-36.

(b) "Prajapati certainly was alone (before) this (Universe). The Word (speech) certainly was His only possession : The word was the second. He desired : Let me emit it this very Word it will pervades this whole (space). He emitted the Word and it pervaded this whole (space). It rose upward and spread as a continuous (well-joined) stream of water." (Tandyabra (20 : 14 : 2) Quoted by Bhagwat Datta in **Story of the Creation**, p. 116.

Logos : It is considered equal to Verbum but whereas in Greek Philosophy the word means the Divine Reason, the authors of the Septuagint use it to translate the Hebrew **Memra** and its poetic synonyms which mean primarily the spoken word of the Deity.

Heraclitus of Ephesus (535-475-B.C.) :

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہبرو زبان میں اِس طاقت کو "میمرا" کہا گیا ہے، جس کو یونانیوں کے "لوگوس" مسلمانوں کے
اَمر، کلمہ، کلام یا کُن کا ہم معنی مانا گیا ہے۔ اِس کا تعلق آرمینی زبان کے لفظ "ایمر" سے قائم

(بقیہ: ۔ فٹ نوٹ ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

(i) There is one Logos, the same throughout the world which is itself homogeneous and one.

(ii) This wisdom we may win by searching within ourselves : 'It is open to all men to know themselves and be wise.

(iii) The divine soul is 'Nature', the cosmic process ; it is God ; it is the life principle ; it is divine law; or will of God.

(iv) It prevails as much as it will and is sufficient for all things.

(v) Logos is the immanent reason of the world ; it existeth from all time yet men are unaware of it, both before they listen it and when they hear it.

(vi) The Logos.........keeps the stars in their courses. It is the hidden harmony which underlines the discords and antagonisms of existence.

In Anaxagoras :

(a) The Logos is intermediater between God and the world, being the regulating principle of the universe, the divine intelligence.

(b) The seminal Logos of the stoics, when spoken of as a single power, is God Himself, as the organic principle of the cosmic process which He directs to a rational and moral end.

(c) The stoics distinguished between the potential unmanifested Reason and the thought of God expressed in action. This distinction led to a new emphasis being laid on other meaning of Logos, as Word or Speech, and in this way stoicism made it easier for Jewish philosophy to identify, the Greek Logos, with the half personified 'Word of Jahweh.

(d) The Logos Christ may be explained stoically as the indwelling revealer of the Father, with whom He is one, as the vital principle of the universe, as the way, the truth and the life, as the inspirer of the highest morality, and last and not the least, as the living bond of union between the various members of his body. The spirit goes through all things, formless itself, but the creator of forms. The Logos as World-Idea is also simple. It assumes manifold forms in its plastic self-unfolding. It is identical with Fate.

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیا جاتا ہے جس کا مطلب شبد یا بانی ہے۔ اِس کا اِستعمال یُونان کے لوگوں سے بھی قدیم ہے۔
اِس لئے اس کی بابت وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہودیوں نے یہ فلسفہ یُونانیوں سے حاصل کیا۔

(بقیہ:۔ فُٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

In Jewish Alexandrian Theology :

The earlier books of the OT connect the operations of the Memra with three ideas—creation, providence and salvation. God spoke the Word and the worlds were made.

THEN at once His spirit or breath, gives life to what the Word creates, and renews the face of the earth. The protecting care of God for the chosen people is attributed by the Jewish commentaries to the Memra. Besides this the word of Lord inspires prophecy and imparts the Law.

Philo : The Logos is declared to be the first born son of God, the prototypal Man in whose image all men are created. The Logos dwells with God as His vicegerent. He is the oldest son of God and wisdom is His mother. In other places, He is identified with wisdom. Again He is the Idea of Ideas, the whole mind of God going out of itself in creation. He represents the world before God as High-priest Intercessor, Paraclete. Occasionally Philo seems to suggest that the Logos is the God of us, the imperfect, as if from the highest point of view, the Logos were only an appearance of the Absolute.

From all eternity before time began, the Logos was ; He is Supra-Temporal, not only the Spirit of the world, He did not become personal either with the creation or at the Incarnation. The Logos is turned towards God. The proposition indicates the closet union, with a sort of transcendental subordination.

The Logos is the light of men as life ; that is to say, revelation is vital and dynamic. God reveals Himself as vital law to be obeyed and lived. The cosmic process, including, of course, the spiritual history of mankind and of the individual is the sole field of revelation...."Salvation is not a physical process but a moral growth through union with God ; knowledge is not merely speculation but a growing sympathy and insight into the character of God and His laws The union of Logos with God is so intimate that we cannot hold (with the Gnostics and some Platonists) that the Father is passive in

(باقی اگلے صفحہ پر)

اِس کو ربّی کلام، ربّی حکم، ربّی رضا کا اظہار، ربّی قوّتِ تخلیق، آئینِ تخلیقِ کائنات، خالق اور قادر بھی کہا گیا ہے۔ عیسائیوں سے بھی پہلے یہودیوں نے شبد یا کلمہ کو ازلی خالقِ کائنات اور رب کا حکم کہا ہے۔ یہ نظریہ یہودیوں، عیسائیوں اور اہلِ اسلام کے روحانی نقطۂ نظر کو ایک لڑی میں پرونے والا ہے[۲]

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

the work of the redemption." Extracted from : **Encyclopaedia of Religion & Ethics**, Vol. VIII. pp. 135-137.

(b) See also : **Dictionary of the Bible** (Ed. James Hastings) Entry : Logos. pp. 549-51.

۲. **Memra** : God's fiat by which creation came into being and continues to exist, is spoken of emanating from Him to execute His will. By the Word of Jahweh 'were the heavens made' (PS 33). In I. S. 55 the Word proceeding from God's mouth assumes form and accomplishes His will as His plenipotentiary. In the aprocypha also we meet with a few instance where the Word stands for God :

It was the Word that descended on the offspring of the fallen angles to pierce them with the sword (Jub 5 : 17); it entered Abraham's heart (12:17); it slew the first born in Egypt ; 'Thine all powerful Word leaped from heaven out of the royal throne' (wis. 18 : 17).

The Amr. Memra, emph. state memra from emar, to speak......... signifies like Logos 'a word', (in certain cases) it also stands for God.

(1) By my Memra I have founded the earth and by my strength I have hung up the heavens (Is. 48 : 13)

(2) The Israelites said, 'Behold, Jahweh our God has shown us His Glory and His greatness and we have heard the voice of his Memra (Dr. 5 : 24).

(3) The Memra gave the law (Ex. 20). There are the statutes which Jahweh made between his Memra and the children of Israel (Lt. 26 : 46).

(4) Its use in all the Targums rather warrants the assumption that its adoption is older than the Alexandrian Logos.........

(5) The Memra, therefore, is the deity revealed in its activity...

(6) The term is based on Gn. I, emphasising the fact that the World came in to being by divine command.

Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. VIII. pp. 242-243.

(باقی اگلے صفحہ پر)

انجیل میں اس کو "ورڈ" "لوگوس" "سپرٹ" "ہولی گھوسٹ" "ہولی سپرٹ" وغیرہ کئی ناموں سے پکارا گیا ہے۔ اِن سب لفظوں سے مُراد خدا کی تخلیقی اور رُوح کو اِس کائنات سے نجات دِلانے والی طاقت ہے۔

انجیل میں کہا گیا ہے:۔ سب سے پہلے ورڈ تھا۔ ورڈ خدا کے ساتھ تھا اور ورڈ ہی خدا تھا۔ یہی ورڈ شروع میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب اشیاء اِس نے پیدا کیں، اور کوئی بھی شے اس کے بنائے بغیر نہیں بنی۔[۱] اِس کو روحِ پاک (Holy Ghost) اور غمخوار (Comforter) بھی کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کہتے ہیں:۔ خدا ایک غمخوار بھیجے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔[۲] یہ غمخوار رُوحِ پاک ہے۔[۳] اور ورڈ ہی نے انسانی جسم اختیار کیا۔[۴] اِس رُوحِ پاک یا کلمہ کی عبادت ہی خدا کی سچی عبادت ہے۔ دوسری کوئی بھی عبادت اُسے قبول نہیں۔[۵] ورڈ کے سننے سے ہی خدا پر ایمان آتا ہے۔[۶] خدا کا نام ایک مضبوط قلعہ ہے۔ جو نیک انسان اِس میں پناہ لیتے ہیں بچ جاتے ہیں۔[۷] ورڈ کے شغل کے بغیر گناہوں سے نجات نہیں مِل سکتی۔[۸]

(بقیہ :- فٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آگے)

[۱] In the beginning was the Word, and the Word was with God, and the Word was God. The same was in the beginning with God. All things were made by him, and without him was not anything made that was made. In him was life, and the life was the light of men. (John 1 : 1-4)

[۲] And I will pray the Father, and He shall give you another comforter that he may abide with you forever. (John 14 : 15)

[۳] But the comforter which is the Holy Ghost. (John 14 : 26)

[۴] And the word was made flesh, and dwelt among us. (John 1 : 14)

[۵] Worship of Spirit is the Worship of Father, no other worship pleases the Father. (John 4 : 24)

[۶] So then faith cometh by hearing and hearing by the Word of God. (Romans 10 : 17)

[۷] The Name of the Lord is a strong tower ; the righteous runneth into it and is safe. (Proverbs XVIII—10)

[۸] Blasphemy against the Holy-Ghost shall not be forgiven unto men. (Methew 12 : 31 : 32)

پارسی مت میں اس کو سروش کہا گیا ہے۔ "سترو" مادہ سے نکلنے کی وجہ سے اس کی سنسکرت
کے "شبد" اور "سترو تی" کے ساتھ مشابہت بتلائی گئی ہے۔ دوسری طرف اس کو "ورڈ" یا
"لوگوس" کا ہم معنی تسلیم کیا گیا ہے۔[1] شبد، ورڈ، لوگوس، کلام، امر، حکم، کن کی طرح "سروش"
بھی ازل سے ہے۔ یہی عظیم الٰہی طاقت ہے، جس سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔[2]

سروش جو مٹی، پانی، آگ، ہوا وغیرہ اور خدا کے بیٹے انسان سے بھی پہلے تھا، حکم الٰہی یا رب کی رضا کا مجسمہ ہے۔ ایک طرف یہ تخلیق کرتا ہے، دوسری طرف "رضا" کا پاک سبق سکھاتا ہے، جو روحانی ترقی کا سب سے صحیح راستہ ہے۔[3] یہ ازل سے آہرمزد کے وائسرائے کے طور پر کارفرما ہے۔ اس کی عظمت اس بات سے ظاہر ہے کہ حضرت زرتشت دعا کرتے ہیں: اے خدا! سروش اس کے پاس جائے جو تجھے عزیز ہے۔[4] یہاں اس کی عیسائی مذہب کے "ہولی گھوسٹ"، ہولی سپرٹ اور کمفرٹر (غمخوار) وغیرہ کے ساتھ یکسانیت قابل غور ہے۔[5] سروش جو ازل سے چلا آرہا ہے، نیکی، دھرم اور روحانی حصول کا مشترکہ سرچشمہ ہے۔[6]

---

[1] (a) 'From the same root as Skt, 'Srutis.' Duncan Greenless, **Gospel of Zarathushtra**, p. 54.

(b) Jullian p. p. Johnson, **The path of The Masters**, p. 51.

[2] Duncan Greenless, **The Gospel of Zarathustra** p. 52.

(Yasna 57 : 1-2)

[3-4] Ibid,

[5] Jullian p. Johnson, **The Path of the Masters**, Radhasoami Satsang Beas, p. 51.

[6] (a) I the Lord God (4.19 ; 3) pronounced this saying...before The Creation of Heaven (4.19 ; 8) the sacred Word of Ahunavairya... the Word which was before the earth, before living beings, before tress before fire. the son of Lord God before The Holy Man, before the demons......before all bodily life, even before God's all good creation, which holds the seed of righteousness " (See also Yasna 19 : 9)

(b) The Ahunvairya is the beginning of Religion and from it is the foundation of Nasks (D. K. 9 : 2 : 2) This Word of Mine chanted ceaselessly and without a break is equal to a hundred other chants."
(19 : 5 : 21 : 4 ; 71 : 14-15)

چین کے تاؤ مت میں تاؤ کی عظمت کی تعریف کی گئی ہے[۱]۔ تاؤ ازلی ہے، اس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا ہے[۲]۔ تاؤ کو خدا، راستہ، کلمہ، قوتِ امتیاز، آئین، حکم، سمہ دان۔ کائنات کا نامعلوم جوہر، نفس اور مادہ کو حرکت دینے والا قانون وغیرہ کہا گیا ہے[۳]۔ یہ عالم کی پیدائش، قیام اور کارکردگی کی بنیاد ہے[۴]۔

تاؤ کسی شئے کا نام نہیں ہے، بلکہ تمام اشیاء اس میں سمائی ہوئی ہیں۔ اس کی کوئی شکل و صورت نہیں۔ لیکن یہ سب شکلوں و صورتوں کا موجد ہے[۵]۔ انسان عالمِ ناسوت کے اصولوں پر چلتا ہے۔ عالمِ ناسوت عالمِ ملکوت کے اصولوں پر۔ عالمِ ملکوت تاؤ کے اصولوں پر، اور تاؤ اپنا اصول آپ ہے[۶]۔ تاؤ خود رو، حقیقی اور ازلی ہے۔ اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جب اس نے قدرت، اسباب اور ان کے اصول پیدا کئے تو یہ بے نام سے نام والا ہو گیا[۷]۔ یہ فقط کائنات کا بنیادی سبب ہی نہیں، بلکہ سب اسباب کیلئے اصول اور نصب العین بھی ہے[۸]۔ یہ نیکی و بدی سے پرے والہانہ سرور کی اس کیفیت کا منظر ہے، جس کا حصول تاؤ کے پیروکاروں کی آخری منزل ہے[۱۰]۔ تاؤ ہی نیک اخلاق، سچے مذہب، سچی روحانیت اور سچے اعمال کا واحد اصول ہے۔ ولی یا درویش اپنے لئے تاؤ کا خزانہ اکٹھا کرتا ہے۔ جتنا زیادہ وہ تاؤ کو بانٹتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کا خزانہ بھرپور ہوتا جاتا ہے[۱۱]۔

جب عظیم الشان تاؤ کی عبادت بند ہو گئی، تو نیکی اور اخلاق پر زور دیا جانے لگا۔ پھر عقل اور عیاری کا راج ہو گیا[۱۲]۔ لیکن کوئی شے تاؤ کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اپنے سرچشمہ کی طرف لوٹنا ہی تسکین کا باعث اور حصولِ مقصد ہے۔ حصولِ مقصد کا یہ اٹل اصول تاؤ ہے جو راضی بہ رضا رہنے کی لا انتہا قوت عطا کرتا ہے[۱۳]۔

۱-۲-۳ Soothhill W. F. Three Religions of China, London : Oxford University Press, 1929 (3rd Ed.).

۴-۵-۶-۷-۸-۹ Ibid. p. 16. ۱۰-۱۱ Ibid. p. 48.

۱۲ James Legge, The Texts of Toaism, Tao Teh King, Part 81 : 2

۱۲ Ibid. 81 : 1 ۱۳ Ibid. 16 : 1.

قرآن مجید میں آتا ہے کہ اللہ کا کلمہ قادرِ مُطلق ہے۔ (۹ : ۳۹، جو وُہ کہتا ہے ہو جا، وُہ ہو جاتا ہے (۳۶ : ۸۲) اللہ کا قول سچ ہے۔ (۶ : ۷۳) اور اپنے جس بندے پر وُہ خوش ہوتا ہے، اپنے حُکم (امر) کے ذریعہ اس کے پاس اپنا کلمہ یا قول بھیجتا ہے (۴۰ : ۱۵) اللہ کا نام مبارک ہے، پاک ہے، عزت و عظمت کا مالک ہے (۵۵ : ۷۸) اِس لئے اُس اللہ تعالےٰ کے نام کی حمد کرو۔ (۵۶ : ۷۴)

صوفی فقیروں نے کلمہ، کلام یا صوت کو ہی تمام عالم کی تخلیق کا ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ قرآن مجید میں کُن یا اَمر[۱] سے دُنیا کا وجود میں آنا مانا گیا ہے۔ جو کلمہ، کلام اور صوت ہی کے ہم معنی الفاظ

---

[۱] **Amr.** "According to the longer version of the **Theology**, the **amr** is one of the designations of the Word (Kalima) of God, also called His will which is an intermediary between the creator and the first intelligence and the immediate cause of the latter. In a certain sense it can also be called 'nothing' (laysa), as it transcends movement and rest. Intellect which is the first created thing, is so intimately united with the word that it is identical with it.

This theory recurs in an identical or almost identical form among the Isma-iliyya, for instance in the Khwan-i-khwan, attributed to Nasir-i-Khusraw...Another Ismaili author, Hamir-al-al Kirmani seems to have regarded the **amr** as an influx coming from God and united to the intellect...In common with other Ismaili theologians, he considers it identical with divine will. In the Rawdat al-Taslim, or Tasawwurat-(ed.) W. Invanop, 54 ; Cf, 29) an Ismaili work attributed to Nasir al-Din al Tusi, the doctrine of divine **amr** is connected with the notion that at the psychic level, the ascension marked by the stages of the sense-perception, estimation (**Wahm**), soul (nafs) and intellect, ends in **amr** There is a certain similarity between these Ismaili doctrines and the concept of **amr** found in the theological dialogue commonly called Kuzari, by the Jewish thinker Judah Halewi. On the one hand he seems to postulate or at least to consider as admissable the identity of the **amr** with the will (ed, Hireshfeld 76) ; on the other he calls divine **amr** the power which is given to the prophet as an inherent faculty and which is superior to the intellect (eg 42 ff)

On the basis of Kuran, vii : 53, **amr** is sometimes opposed to Khalq : the first term then designates the creation of the spiritual sub-

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں۔ صُوفی درویشوں نے اس کا مُفصّل ذکر کیا ہے حضرت شاہ نیاز کہتے ہیں کہ سارا عالم صَوت سے وجود میں آیا اَور تمام نُور اُسی سے ہی پھیلا ہے ؎

عالَم از صَوت ایں ظہُور گرفت
از حضُورِش بساطِ نوُر گرفت

حَضرت عبدالرزاق کاشی کہتے ہیں: اسمِ اعظم سبھی اسماء کا سرچشمہ یا خالق ہے۔ اَور وُہی سَب اسباب کی پوشیدہ اصلیّت ہے۔ وُہ سمندر ہے اَور کائنات اس کی مَوج یا لہر ہے۔ یہ بات اُسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے، جو ہم میں سے ہو (یعنی کلمے کا راز صِرف عابد یا فقیر ہی سمجھ سکتے ہیں)۔ ؎

اسمِ اعظم جامۂ اسماء بُوَد
صُورتِ اُو معنئِ اشیاء بُوَد
اِسم دریاؤ تعیّن مَوجِ اُو
ایں کسے داند کہ اُو از ما بُوَد

حَضرت شاہ نیاز فرماتے ہیں: سَارا عالم آواز سے بھرپُور ہے۔ لیکن اس آواز کو سُننے کے لئے تُم اندرُونی کان کھولو تو تمہیں کلمہ کی لگاتار آواز سُنائی دے گی، جس کو پاکر تُم پیدائش اَور مَوت کی حد پار کر جاؤگے ؎ ہمہ عالم پُر است از آواز
لیک درہائے گوشِ خُود کُن باز

بقیہ:۔ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۸ سے آگے۔

stances, or these substance, themselves, while the .second refers to the creation of the material substances or the material substanees themselves...Another theme often treated by the Surfis, is the contradiction assumed by some as possible, between the amr, God's command to perform an action, and the divine will which prevents it."

Extracted from : **Encyclopedia of Islam**, Vol. I. (New Edition), pp. 449—450.

لاثنوی یک کلامِ لا مقطوع
از حدوث و فنا بود مرفوع

یہ کلام بے حد ہے۔ جس وجہ سے اس کا نام احد پڑ گیا۔

؎ اول و آخرش چو بے حد شد، زاں سبب نامِ او باحد شد

مولانا رُوم نے اس کو "نام" اِسمِ اعظم اور اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام کہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نام اِس قدر شیریں ہے کہ اس کے ساتھ میری تمام ہستی شیریں ہوگئی ہے! یہ اِتنا پُرسرُور ہے کہ اس کا ذرّہ ذرّہ میری جان کو عالمِ بالا کی طرف "اُبھار رہا ہے: ؎

اللہ اللہ ایں چہ شیریں ست نام
شیر و شکر می شود جانم تمام
اللہ اللہ ایں چہ نامِ خوش مذاق
حرف حرفش میدہد جا نرا داق

یہ "نام" ہی سب سے بڑا نام ہے اور یہی عظیم اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ جانوں کی جان یعنی انسانی ہستی کا سرچشمہ ہے۔ یہ مُردہ ہڈیوں میں جان ڈالنے والا ہے۔ میں اس نام کی بدولت مسرُور ہوں اور میری رگ رگ سے اس کا نشہ ٹپک رہا ہے ؎

اِسمِ اعظم ہست اللہ العظیم
جانِ جاں و محیءِ عظمِ رمیم
اللہ اللہ مستم از نامِ خُدا
می چکد از ہر رگم راوق جُدا

یہ اللہ کا ذاتی نام ہے۔ یہ اُس ذاتِ پاک کی صورت ہے۔ اور یہ اسمِ اعظم ہی خُدا سے نزدیکی کا وسیلہ ہے۔ ؎

اللہ اللہ اِسمِ ذاتِ پاک دوست
اِسمِ اعظم از برائے قربِ اوست

حضرت سُلطان باھُو نے زبان سے ادا کیئے گئے کلمہ کو صِفاتی[1] یا "صفتِ[2] ثنائی کلمہ" کہا ہے۔ اور باطنی حقیقی کلمہ کو "ذاتی اِسم"، "دِل کا کلمہ" "اسم اعظم"، "اللہ کا اِسم" وغیرہ کئی ناموں سے پُکارا ہے۔ یہ زبان سے ادا ہونے والا نہیں، بلکہ اپنے آپ دِل میں پڑھا جارہا ہے جس کو حقیقی عاشق مُرشد کی ہدایت کے بمُوجب پڑھتے ہیں، اور جس سے اُن کا محبُوب سے ابدی وِصال ہو جاتا ہے۔ عاشق عشق کی نماز پڑھتے ہیں جس میں کوئی حرف استعمال نہیں ہوتا۔ اصل نماز وُہی ہے جو زبان اور ہونٹ ہلائے بغیر ادا ہو۔ ؎

۱۔ کانے کپ کے قلم بناون لکھ نہ سکن قُلماں ہُو

۲۔ ز۔ زبانی کلمہ ہر کوئی آکھے دِل دا پڑھدا کوئی ہُو
جتھے کلمہ دِل دا پڑھئے اوتھے جیبھ[3] مِلے نہ ڈھوئی ہُو
دِل دا کلمہ عاشق پڑھدے کی جانن یار گلوئی[4] ہُو
مَیں کلمہ پیر پڑھایا باہُو سدا سوہاگن ہوئی ہُو

۳۔ عاشق پڑھن نماز پریم[5] دی، جَیں[6] وِچ حرف نہ کوئی ہُو
جیبھ تے ہونٹھ نہ ہِلن باہُو، خاص نمازی سوئی ہُو

کلمے کا ذِکر دِل کی صفائی کرتا ہے اور اُس کے راز کے عاشق کبھی اُس کی قُربت سے محرُوم نہیں رہتے۔ وُہ ذاتی اِسم کمانے کی خاطِر اپنی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ جو دریائے وحدت میں نہاتے ہیں، وُہ اسم اعظم کا وضُو کرتے ہیں۔ ؎

---

[1] ج۔ جنہاں الف مطالعہ کیتا۔ ب دا باب نہ پڑھدا ہُو۔
چھوڑ صفاتی لدھوس ذاتی اوہ خامی دُور جا کردا ہُو۔

[2] ص۔ صِفت ثنائی مول نہ پڑھدے، جیہڑے پُہتے ذاتی ہُو۔
عِلموں عَمل اُنہاں وِچ ہوئے، جیہڑے اصلی نے اثباتی ہُو

[3] جیبھ مِلے نہ ڈھوئی: زبان کام نہیں آتی [4] زبانی باتیں بنانے والے

[5] پریم: عشق [6] جِس [7] ہونٹ [8] ہوتے [9] خالی۔ محرُوم

۱۔ کلمے دا توں ذکر کماویں، کلمے دے نال نھاویں ہُو
۲۔ عاشق راز ماہی دے کولوں، کدے نہ تھیندے واندے ہُو
۳۔ اوہ کردے وضو اسم اعظم دا، جیہڑے دریا وحدت وچ نھاتے ہُو

یہ کلمہ کُل لولاک کے پیدا کرنے والا ہے اور دُنیا کی تمام مذہبی کتابیں اِسی سے نکلی ہیں ؎

۱۔ کلمے دی کل تداں پیئسی، جداں کُل کلمے وچ کھولی ہُو
چوداں طبق کلمے دے باہُو، کی جانے خلقت بھولی ہُو
۲۔ چوداں طبق کلمے دے اندر، قرآن کتاباں عِلماں ہُو

ہر دو عالم کی دولت کلمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ؎

۱۔ کلمے جیہی کوئی نعمت نہ باہُو، اندر دوہیں جہانیں ہُو
۲۔ کلمہ میرا لعل جواہر، کلمہ ہٹ پنساری ہُو
ایتھے اوتھے دوہیں جہانیں، کلمہ دولت ساری ہُو

کلمہ رُوح کی جسموں جسموں کی کثافت دُور کر کے اس کو پاک و صاف کرتا ہے وُہ دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے والا ہے ؎

۱۔ کلمے نال بُجھائے دوزخ جتھے اگ بلے ازگاہیں ہُو
۲۔ کلمے نال بہشتیں جانا کلمہ کرے صفائی ہُو
۳۔ ہور دوا نہ دِل دی کائی، کلمہ دِل دی کاری ہُو
کلمہ دُور زنگال کریندا، کلمے مَیل اُتاری ہُو
۴۔ اللہ تینوں پاک کریسی باہُو، جے ذاتی اِسم کماویں ہُو

یہ کلمہ وُہ چنبے کی بُوٹی ہے، جو کِھل کر جسم و جان کو عشقِ الٰہی کی خوشبُو سے بھر دیتی ہے ؎

الف۔ اللہ چنبے دی بُوٹی مُرشد من وِچ لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی مِلیا ہر رگے ہر جائی ہُو
اندر بُوٹی مشک مچایا جاں پھلّن پر آئی ہُو

جیوے مُرشد کامِل باہُو جس ایہہ بُوٹی لائی ہُو

کلمہ مَرنے سے پیشتر مَرنے کی ترکیب سِکھاتا ہے۔ کلمہ دُوئی کے کُفر کو توڑ کر وحدت میں لاتا ہے کلمے نے کروڑوں گنہگار پارُ اُتار دیئے اور کلمے نے ہی عام راہگیروں کو وَلی، پیغمبر اور مہاتما بنا دیا۔

۱۔م۔ مُوتُو والی مَوت نہ مِلی، جیں وِچ عشق حیاتی ہُو
مَوت وِصال تھیئوسی اِکو، جد اِسم پڑھیئوسی ذاتی ہُو

۲۔ک۔ کلمے دی کل تداں پیئسی، جد کلمے دِل نُوں پھڑیا ہُو
کُفر اِسلام دا پتہ لگّا، جد بھن جِگر وِچ وڑیا ہُو

۳۔ک۔ کلمے لکھ کروڑاں تارے، وَلی کیتے سے راہی ہُو

اِس کلمے کی دولت مُرشدِ کامل کی بخشش سے نصیب ہوتی ہے، جو رُوح کو کلمہ سے جوڑ کر ہمیشہ کے لئے سُہاگن بنا دیتا ہے۔

۱۔ک۔ کلمے دی کل تداں پیئسی، جاں مُرشِد کلمہ دسیا ہُو
ساری عُمر وِچ کُفر دے جالی، بِن مُرشد دے دسیاں ہُو
ایہہ کلماں ساں نُوں پیر پڑھایا، ذرا نہ مُند المتاں ہُو
۲۔ مَیں کلمہ پیر پڑھایا باہُو، سدا سُہاگن ہوئی ہُو

جو انسان سینکڑوں سال من مانے طریق سے عبادت کرتا ہے، مگر رُوح کو کلمہ میں جذب نہیں کرتا، وُہ بُت پرست ہے۔ اگر وُہ سو سال بھی ایسی عبادت کرے تو پھر بھی ایسا انسان کافر اور اللہ سے بیگانہ رہے گا۔ وُہ کبھی بھی خُدا سے وصال نہیں کر سکتا۔

کلمے باجھوں فقر کماوے، سو کافر مرے دیوانہ ہُو
سَیاں[1] ورہیاں دی کرے عبادت، اللہ کنوں[2] بیگانہ ہُو

۱؎ مرنے سے پہلے مرو۔ ۲؎ ہو جائے گا۔

۱؎ سَیاں ورہیاں = سینکڑوں برس ۲؎ اللہ کنوں = اللہ کی طرف سے

غفلت کنوں نہ کھُلہن پردے، حابل ہے بُت خانہ ہُو
مَیں قربان تنہاں دے باہُو، جنہاں مِلیا یار یگانہ ہُو

رُوح، کلمہ اور اللہ کی ذات ایک ہے۔ کلمہ کی آواز میں مقناطیسی کشش ہے۔ اِس کی تجلی میں ہر طرح کی غلاظتیں دُور کرنیکی طاقت موجود ہے۔ جو بھی حقیقی طالب اِسمِ اللہ کا یکسُوئی سے شغل کرتا ہے، وُہ رُوح کو کلمہ میں جذب کر دیتا ہے، اُس کی رُوح دُنیا و جسم سے اُوپر اُٹھ کر خُدا وند کریم سے مِل جاتی ہے اور وُہ صحیح معنوں میں باہُو (ہُو۔ والا) یعنی کلمہ والا یا رَب والا بن جاتا ہے ؎

یار یگانہ مِلسی تینوں، جے سِر دی بازی لائیں ہُو
عشق اللہ وِچ ہو مستانہ، ہُو ہُو سدا الائیں ہُو
نال تصوّر اسمِ اللہ دے، دَم نوں قید لگائیں ہُو
ذاتی نال جا ذاتی رَلیا، تَد باہُو نام سدائیں ہُو

بزرگُن وادی سنتوں اُور بھگتوں کے کلام اور تعلیم کی بُنیاد ہی شبد کی کمائی ہے۔ گورُو نانک صاحب اور دیگر گوروصاحبان فرماتے ہیں، کہ کائنات کو پَیدا کرنے اور ختم کرنے والی طاقت شبد ہے، جو گھٹ گھٹ میں سمائی ہُوئی ہے: ؎

۱۔ سبدے دھرتی سبدے آکاس
سبدے سبد بھیا پرگاس
سگلی سرسٹ سبد کے پاچھے
نانک سبد گھٹے گھٹ آچھے

(پران سنگلی)

۲۔ اُتپت پرلو سبدے ہووے
سبدے ہی پھِر اوپت ہووے

(محلہ ۳، صفحہ ۱۱۷)

۱؎ پکارے۔

سنت دادو دیال جی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے شبد سے پیدا ہوا ہے، اور جو کچھ ہے شبد میں سماجاتا ہے۔ جو کچھ شبد نے پیدا کیا یکبارگی کیا۔ کسی شے کا آگے یا پیچھے پیدا ہونے کا سوال تو تب پیدا ہوتا اگر شبد قادرِ مطلق نہ ہوتا۔

دادو سبدے بندھیا سبھ رہے، سبدے سب ہی جائے
سبدے ہی سب اوپجے، سبدے سبے سمائے
ایک سبد سب کچھ کیا، ایسا سمرتھ سوئے
آگے پیچھے تو کرے، جو بل ہینا ہوئے

گورو ارجن دیو جی کہتے ہیں کہ گورو گھر کی تعلیم کا لبِ لباب شبد یا نام کی کمائی ہے۔

نانک کے گھر کیول نام (محلہ ۵، صفحہ ۱۱۳۶)

شبد ہی چاروں جگوں سے نجات کا ایک واحد ذریعہ چلا آ رہا ہے۔

ایک نام جگ چار اُدھارے
سبدے نام وساہا ہے

(محلہ ۳، صفحہ ۱۰۵۵)

گورو امرداس جی فرماتے ہیں کہ خدا نے کل عالم کے پار اتارنے کا ایک ہی ذریعہ شبد یا نام بنایا ہے، جو کاملِ مرشد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

ایک نام تارے سنسار، گور پرسادی نام پیار
بن نامے مکت کنے نہ پائی، پورے گور تے نام پلے پائی
سو بوجھے جس آپ بجھائے، ستگور سیوا نام درڑائے
جن اک جاتا سے جن پروان، نانک نام رتے در نیسان

(محلہ ۳، صفحہ ۱۱۷۵)

گورو ارجن دیو جی کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کا نصب العین نام ہے۔

سگل متانت کیول ہر نام (محلہ ۵ صفحہ ۲۹۶)

سب مذاہب سے اعلیٰ مذہب اور سب اعمال سے پاک عمل نام کا جپنا ہے۔ ؎

سرب دھرم مہہ سریسٹ دھرم
ہر کو نام جپ نرمل کرم

(محلہ ۵، صفحہ ۲۶۶)

یہ نام سبھی دکھوں کو دور کرنے والا اور سکھوں کا داتا ہے ؎

سکھمنی سکھ انمرت پربھ نام

(محلہ ۵۔ صفحہ ۲۶۲)

سرب روگ کا اوکھد نام
کلیان روپ منگل گن گام

(محلہ ۵، صفحہ ۲۷۴)

بغیر نام کی کمائی کے کوئی بھی دنیاوی یا روحانی عمل کسی کام کا نہیں ؎

اور کاج تیرے کتے نہ کام
مل سادھ سنگت بھج کیول نام

(محلہ ۵، صفحہ ۳۷۸)

دریا صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ تینوں طبقات اور تمام مذاہب کے لئے نجات کا واحد ذریعہ 'نام' ہے ؎

مسلمان ہندو کہاں ۔ کھٹ درسن رنک راو
جن دریا نج نام بن ۔ سبھ پر جم کا داو
سرگ مرت پاتال کہہ۔ کہہ تین لوک بستار
جن دریا نج نام بن۔ سبھی لوک کو مار

(دریا صاحب دمارواڑ) کی بانی۔٦)

مُرشد

مُرشد کی ضرورت

بُلھے شاہ دی سُنو حکایت ۔ ہادی پھڑیاں ہوگ ہدایت
میرا مُرشد شاہ عنایت ۔ اوہ لنگھائے پار

خُدا بھی اَندر ہے، رُوح بھی اندر ہے اَور رُوح کو رَبّ کے ساتھ جوڑنے والی ڈور یعنی کلمہ بھی اَندر ہے۔ مگر خُدا یا کلمہ کے 'گنجِ مخفی' کا راز عیاں کرنے والا اَور اُس تک پہنچانے والا مُرشِد کامِل باہر ڈھونڈنا پڑے گا۔

جے کوئی اُس نُوں لکھنا[1] چاہے، با جھ وسیلے لکھیا نہ جائے
شاہ عنایت بھید بتائے ۔ تاں کُھلّے اسرار

مُرشِد بحرِ حیات کی لہروں میں پھنسی بےبس رُوح کو پار کرنے والا ملاح ہے۔ وُہ ہِجر کے دَرد میں مُبتلا مریض کا علاج کرنے والا ماہر طبیب ہے ؎

۱۔ ندیوں پار مُلک سجن دا ۔ حرص لہر نے گھیری
ستگورو بیڑی پھڑی کھاوتے ۔ تُوں کیوں لائی دیری

۲۔ جھبدے[2] بَوہڑیں وے طبیبا ۔ نہیں تاں مَیں مَر گئیاں

مُرشِد کا اصلی کام باطِنی کلمہ کا بھید دینا اَور رُوح کو اِس کے شَغَل کا طریقہ کار بتانا ہے کیونکہ اِس کلمہ کے بغیر پار اُترنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ سائیں بُلھے شاہ مُرشد سے یُوں مخاطب ہوتے ہیں:

نام اللہ پیغام سنائیں ۔ مُکھ ویکھن نُوں نہ ترسائیں

آپ ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی ، کتیا مُول نہ جاوے" کافی میں اشارہ کرتے ہیں کہ رُوحانی شغل

---

[1] جاننا، بُجھنا [2] جلدی

میں بہت سی مُشکلات پیش آتی ہیں۔ سائیں جی نے مَرنے کا استعارہ استعمال کر کے اِن مُشکلات کا ذکر کیا ہے۔ اِن مُشکلات کو حل کرنے میں مُرشد کا وُہی ہاتھ ہے، جو ایک لوہار کا ایک ناقص چرخے کے ٹھیک کرنے میں ہوتا ہے۔ دراصل مُرشد کا فضل سینکڑوں مَن رُسے مَناں کات لینے سے زیادہ ہے۔ یعنی مُرشدِ کامل کا فضل وکرم ہر قسم کے نیک اعمال سے اُونچا درجہ رکھتا ہے:

ڈِھلک گئی چرخے دی ہتھی، کتیا مُول نہ جاوے
نکلے نُوں وَل پے پے جاندے، کَون لوہا رسداوے
نکلے نُوں وَل لاہیں لوہارا، تندی ٹُٹ ٹُٹ جاوے
گھڑی گھڑی ایہہ جھوٹے کھاندا، چھلّی اِک نہ لاہوے
سے مَناں دا کتّ لیا اُلجھیا، شَوہ میتوں گل لاوے
دِن چڑھیا کد گُزرے، مَینوں پیارا مُکھ دکھلاوے

نامور صُوفی درویش شیخ شہابُ الدّین سہروردی (سنِ ولادت ۱۱۴۵ءؔ) "عوارفُ المعارف" میں قرآن شریف کی آیات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ صُوفی مَت کتابی یا درسی علم پر مبنی نہیں۔ اِس کی بُنیاد اندرُونی رُوحانی مشاہدہ ہے۔ یہ مشاہدہ وَلیوں، پیغمبروں کی دولت ہے جو فقط اُن سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔[1]

رضوی نے صُوفی مَت میں مُرشد اور طالِب کے رُوحانی تعلقات کے بارے میں ذکر کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ طالب کا مُرشد کے ہاتھوں بیعت ہونا نہایت پیچیدہ مُعاملہ تھا۔ پیرو مُرشد ہر طالب کو اُس کی قلبی رُوحانی قابلیت اَور کیفیت کے مطابق ہی عملی ریاضت کی راہ پر ڈالتا تھا۔ ذکر اَور تصوّر کا کام مُرشد کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ طالب کو عبادت کے وقت سماؤ، یکسُوئیت میں باطنی تجلّی وغیرہ کے جو تجربات ہوتے تھے، پیر اُن سے واقف ہوتا تھا۔ پیر کو اس بات کا علم ہوتا تھا کہ طالب کا کون سا مشاہدہ سچّا ہے اَور کونسا محض فریب ہے۔ طالب کے اِن رُوحانی مُشاہدات کا رازداں صرف اُس کا مُرشد ہوتا تھا۔[2] مُرشد کے ہاتھوں بیعت ہوتے وقت پیر سے مُرید کا اُوٹ رُوحانی

---

[1] History of Sufism in India, V. I, p. 89.
[2] Ibid p. 99.

تعلق قائم ہو جاتا تھا، اور پیر مرید کو اپنی پناہ میں قبول کرنے کی علامت کے طور پر اُس کے سر پر اپنا ہاتھ (دستِ شفقت) رکھ دیتا تھا۔[1]

صوفیوں کا مستحکم عقیدہ ہے کہ مُرشد کا دامن تھامنا خُدائی رحمت کے دائرے میں داخل ہونا ہے۔ سائیں بلھے شاہ نے اپنے کلام میں بار بار اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ الٰہی رحمت مُرشد کے ذریعے سے نازل ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مُرشد کے بتائے ہُوئے راستے پر چلنے سے خواہشات سے چھٹکارہ ملتا ہے، دِل پاک وصاف ہوتا ہے، اور اِنسان بے خوف ہو کر حقیقی مسرت کا حقدار بن جاتا ہے۔

پھڑ مُرشد عابد خُدائی ہو، وِچ مستی بے پروائی ہو
بے خواہش بے نوائی ہو، وِچ دِل دے خُوب صفائی ہو
بُلھا بات سچی کدوں رُکدی اے، گل اِک نُقطے وِچ مُکدی اے

مُرشد جیتے جی بھی مدد کرتا ہے اور وقتِ آخر بھی طالب کو ہر طرح کے خطروں سے بچا کر منزلِ مقصود پر پہنچانے کا ضامن ہوتا ہے[2]

اِک اَوکھا ویلا آوے گا، سبھ ساک[3] سَین[4] بھج جاوے گا
کر مِنت پار لنگھاوے گا، اوہ بُلھے دا سُلطان کُڑے
کر کتن وَل دھیان کُڑے

مُرشد دُکھوں اور خطروں کی گھاٹی کو عبور کرا کر رُوح کا مالکِ کُل کے ساتھ وِصال کروا دیتا ہے، اور اُس کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں

ا۔ بُلھا شوہ میرے گھر آوسی، میری بلدی بھا[5] بجھاوسی
عنایت دم دم نال چتاریا، سانوں آرل یار پیاریا

[1] History of Sufism in India, V. I, p. 102.

[2] دیکھو اِس کتاب کا صفحہ ۱۰۰۔۱۰۱ شمس تبریز و مولانا روم کے خیالات کیلئے۔ [3] رشتہ دار۔ [4] ساتھی۔ [5] آگ

۲۔ ہادی مینوں سبق پڑھایا، او بِن غیر نہ آیا جایا
مُطلق ذات جمال وکھایا، وحدت پایا شور نی
مَن میں ہو گیا ہور دا ہور نی

مَولانا رُومؒ نے فرمایا ہے ؎

۱۔ سخت باریک ست راہِ آں حبیب — کے رَوَد بر استقامت جز لبیب
ہست عقبات اندریں راہِ گراں — طے نگردد بے قلاؤز اے فلاں
زیں سبب فرمود آں شاہِ شفیق — گالرّفیق اوّل بُوَد ثمّ الطّریق
رہبرے جو تا رَوی تو راہِ راست — وَرنہ در رَہ بس مُغاک وچاہ ہاست
ہمچو پرکارے ہمیشہ در ذہاب — لیک یک جا ماندۂ بے انقلاب
سالہا کردی نماز و روزہ را — نُورِ آں صوم وصلوٰۃ تو کجا
جُملہ عُمرت در عبادتہا گذشت — زانچہ اوّل بُو دحالِ دل نگشت
۲۔ اتباعِ آں قلاؤز را بکن — تا بمنزل گہ رسی تو بے سخن
ایں چُنیں شد ترکِ امرِ پیر ہا — بے کماں پرّد چگونہ تیر ہا
۳۔ ہیچ تیرے دیدہ باشی بے کماں — کے رسد او بر ہدف یا گِردِ آں

مطلب :۔ اُس دوست (ربّ) کی راہ بہت باریک یعنی تنگ ہے۔ بغیر عارف کے کون اس پر سیدھا چل سکتا ہے۔

اِس سخت راستہ میں دُشوار گزار گھاٹیاں ہیں۔ جو بغیر راہبر کے طے نہیں ہو سکتیں۔

اِس لئے اُس مہربان شاہ (حضرت محمدؐ صاحب) نے فرمایا ہے کہ سفر کا ساتھی پہلے ہے اور سفر کاٹے ہونا بعد میں ہے۔

کوئی رہبر تلاش کرے تاکہ تُو سیدھے راستہ پر چل سکے۔ ورنہ راستے میں بہت گڑھے اور کنوئیں ہیں۔

تُو پرکار کی طرح ایک ہی جگہ چکر کاٹ رہا ہے، اس لئے بغیر کسی تبدیلی کے جہاں تھا وہیں پر ہے۔

تُو نے کئی سال نماز اور روزہ ادا کیا، لیکن تیری یہ عبادت تجھے اس کے نُور تک نہ پہنچا سکی۔
تیری ساری عمر عبادت میں بسر ہو گئی لیکن دِل کا حال جو پہلے تھا وُہی رہا۔

۲۔ مطلب :- تو اُس رہنما پر ایمان لا تا کہ تُو لا کلام منزل گاہ تک پہنچ جائے۔

۳۔ پیر کا حکم ترک کرنا بغیر کمان کے تیر چلانے کی مانند ہے۔ کیا تُو نے کبھی بغیر کمان کے کوئی تیر نشانہ پر یا نشانہ کے نزدیک پہنچتے دیکھا ہے۔

خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں ؎

مقام امن و مئے بیغش و رفیقِ شفیق گرت مدام میسّر شود زہے توفیق
دریغ و درد کہ تا ایں زماں ندانستم کہ کیمیائے سعادت رفیق بود رفیق

مطلب :- امن کی جگہ (تنہائی)، بغیر ملاوٹ کی شراب (رب کا نام)، اور مہربان دوست (پیر و مُرشد) اگر ہمیشہ کیلئے مِل جائیں تو تیری خُوش قسمتی ہے۔ افسوس اور دُکھ کی بات ہے کہ مجھے ابھی تک یہ علم نہیں کہ خوش قسمتی کا پارس مہربان دوست (مُرشد) کا ساتھ ہے۔

شمس تبریز فرماتے ہیں:۔ ؎

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر
دامنِ آں نفس کُش را سخت گیر
ظلِّ پیر اندر زمیں چوں کوہ قاف
رُوح او سیمرغ دبس عالی طواف
پس برو خاموش باش از انقیاد
زیرِ ظلِّ امرِ شیخ اُستاد

سوائے مُرشد کے سایہ کے کوئی نفس کو مار نہیں سکتا۔ اُس نفس کُش کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ مُرشد کا سایہ ایسا ہے جیسے زمین پر کوہ قاف ہے۔ اِس کی رُوح سیمرغ کی طرح بلندیوں میں اُڑتی ہے۔ پس تُو خاموشی سے اس کے زیر سایہ کھڑا ہو جا اور قید سے نجات پا۔

مُرشدِ کامل

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ رُوحانی ترقی کے لیئے مُرشدِ کامل کا مطلب خدا سے وِصال کر چکے سچے ہادی یا کامِل فقیر سے ہے، کیونکہ خدا یا خُدا کی ذات میں سما کر خُدا بن چکا انسان ہی خدا سے وِصال کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ مُرشد کی ہستی میں رَب اور انسان دونوں کا میل ہے:۔

١۔ ڈھولا[1] آدمی بَن آیا

٢۔ مولا[2] آدمی بَن آیا

پانی میں مصری گھولتے جاؤ تو نتیجہ ہو گا کہ پانی میں مصری کی تمام صِفات سما جائیں گی۔ عین اِسی طرح جس کے اندر خُدا کے نُور نے گھر کر لیا ہے جِس پر رَبّی رحمت کے دروازے کُھل چکے ہیں، اس میں اور اللہ تعالیٰ میں عملی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسے مردِ کامِل کے ذریعے سے ہی خُدا کی رحمت دُوسروں کا ذریعۂ نجات بنتی ہے ؎

واہ جس پر کرم آویہا[3] ہے۔ تصدیق اوہ وی تیں جیہا ہے

سچ صحیح روایت ایہا ہے۔ تیری نظرِ مہر نزحبائی دا

خُدا کا سچا عابد خُدائی سمندر میں سے اُٹھی ایسی لہر ہے جو سمندر میں سے اُٹھتی ہے: ہمیشہ سمندر کا حِصہ رہتی ہے، اور آخر کار سمندر میں ہی سما جاتی ہے۔ لہر کبھی بھی سمندر سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ لہر کی جڑیں ہمیشہ سمندر میں رہتی ہیں ؎

ہر کا سیوک سو ہر جیہا، بھید نہ جانہو مانس دیہا

جیوں جل ترنگ اُٹھہ بہو بھاتی، پھر سللے سلل سمائدا

(محلہ ۵، صفحہ ۱۰۷۶)

---

[1] محبوب [2] خدا۔

[3] ایسا کہ یہی

سائیں جی کہتے ہیں کہ مرشد باہر سے 'چاک'، 'ارائیں' یا 'جوگی' نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں جمالِ پاک یا نورِ الہٰی کی ہوبہو تصویر ہے۔ وہ جیتا جاگتا چلتا پھرتا خداوندِ کریم ہے اور اس کا دیدار رب کا دیدار ہے جو سب دکھوں کی مؤثر دوا ہے۔ ؎

۱۔ ماہی نہیں کوئی نور الہٰی۔ الخدی اُس مرلی والے[1]

مُٹھیوس ہیر سیال ڈا ہڈے کا[2] من پاکے

۲۔ بلھیا دوروں چل کے آیا جی

اوہدی صورت نے بھرمایا جی

اوسے پاک جمال[3] دکھایا جی۔ اوہ اک دم نہ بھلیندا

۳۔ جے توں لوڑیں باغ بہاراں، چاکر رہ ارائیں دا

بلھیا اِس نوں ویکھ ہمیشہ، ایہہ ہے درشن سائیں دا

۴۔ ماہی وے تیں ملیاں سبھ دکھ ہوون دور

لوکاں دے بھانے چاک چکیٹا[5] ساڈا رب غفور[6]

عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی

صوفی درویشوں نے مرشدِ کامل کو خدا کے آسمان سے لگا زینہ کہا ہے۔ یہ وہ شفاف شیشہ ہے جس میں دوسری طرف کا نور صاف دکھائی دیتا ہے۔ سائیں بلھے شاہ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی تک لے جانے کا ذریعہ کہتے ہیں۔ یہاں عشقِ مجازی کا مطلب مرشد کی صورت یعنی انسانی قالب میں نمودار حقیقت کا عشق ہے۔ آپ نہایت خوبصورت انداز میں اس پیچیدہ راز کو آشکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک کسی شکل و صورت سے پیار نہ ہو، نادیدہ حقیقت کا پیار کیسے بیدار ہو سکتا ہے؟ جب دیدہ صورت کے عشق کا دھاگا نہ ہو تو سوئی نادیدہ کی محبت کا جامہ کیسے سیئے؟

---

[1] بجائی [2] لوٹ لی۔ بھرمالی [3] جادو کرکے۔ [4] نورِ پاک دکھایا مراد رب کا دیدار کروایا۔
[5] چاکر [6] دیانو۔

تک مُرشدِ مجازی صُورت میں سحی بن کر نہ آئے، رحمانی شفقت کی خیرات کیسے نصیب ہو ؟ مُرشدِ کاملِ کی ذات کا عشق ہی عشقِ الہٰی کا جنم داتا ہے۔ کیونکہ اِس کے ذریعے ہی متلاشی باطنی حقیقت کے ساتھ وِصال کرنے کے قابل بن سکتا ہے۔

بِچھر نہ عِشق مجازی لاگے، سُوئی سیوے نہ بِن دھاگے

عِشق مجازی داتا ہے، جِس پِچھے مَست ہو جاتا ہے

عِشق جنہاں دی ہڈی پیندا، سو ئی نر جیوت مرجاندا

عِشق پِتا تے ماتا ہے، جِس پِچھے مَست ہو جاتا ہے

جسم میں قید رُوح نادِیدہ اَور حواس سے بالا خُدا سے عِشق نہیں کر سکتی۔ لیکن جب مولانا رُوم فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا کی حضوری میں بیٹھنا چاہتا ہے، اُسے کہو کہ جا اَور کسی وَلی اللہ کی صحبت میں بیٹھ۔ اولیا کی ایک گھڑی کی صحبت بھی سَو سَال کی پُر خلوص بندگی سے بہتر ہے۔ اولیا کے باطن میں وُہ محو ہے، جو سب کے لئے جائے پرستش ہے:۔

ہر کہ خواہد ہمنشینی با خُدا

گو نشیند دَر حضورِ اولیا

ہمنشینی ساعتے با اولیا

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مسجد ے ہست اندرونِ اولیا

سجدہ گاہے جُملہ ہست آنجا خُدا

ایک اَور جگہ اِسی موضوع پر کہتے ہیں کہ اولیا اللہ کے پاؤں کی خاک سے اَپنی آنکھیں روشن کرلے، تاکہ تجھے ابتدا سے انتہا تک سب کچھ نظر آ جائے۔ اِن چیدہ ہستیوں کی خاک کو تُو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنالے اَور اُن کی بینائی تیز کرلے :۔ ؎

چشمِ روشن کُن ز خاکِ اولیا

تا بہ بینی زابتداء تا انتہا

سُرمہ را تو خاکِ ایں برگزیدہ را
ہم بسوزو ہم بسازد دیدہ را

حضرتِ شمس تبریز اسی انداز میں فرماتے ہیں کہ اگر تو بینائی چاہتا ہے تو اُن فقرا کے پاؤں کی خاک کو سُرمہ بنالے۔ کیونکہ وُہ جنم سے اندھے لوگوں کو بھی بینائی دینے کی توفیق رکھتے ہیں۔ ؎

گر عیاں خواہی ز خاکِ پائے ایشاں سُرمہ ساز
زانکہ ایشاں کور مادر زاد را بینا کُنند

خواجہ حافظ نے تو یہاں تک کہا ہے، کہ اگر تیرا مُرشدِ کامل تجھے حکم دیتا ہے، کہ تو مُصلّے شراب سے رنگ دے تو بلا حُجّت اُس کے حُکم کو بجالا، کیونکہ راستہ پر چلنے والا اُس راہ کے رسم و رواج سے بے خبر نہیں ہے:۔ ؎

بمے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مُغاں گوید
کہ سالک بیخبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

مُرشد کی ذات کے ذریعے الٰہی نُور برستا ہے تو انسان کو قُدرتاً اس سے محبت ہو جاتی ہے۔[1]
اِس لئے کامل فقیروں نے مُرشد کے قالب میں آئے رَبّ کی از خد تعریف کی ہے۔[2]
مولانا جامی فرماتے ہیں۔ کہ اگر مُرشدِ کامل کے وجُود کا عشق پیدا ہو جائے تو زہے نصیب، کیونکہ عشق کی منزل تک پہنچنے کا وسیلہ عشق مجازی ہی ہے:۔ ؎

غنیمت دان اگر عشق مجازی ست
کہ از بہرِ حقیقی کارسازی ست

---

[1] ندری آوے تِس سِئو موہ کوئی ملئے پربھ ابناسی تو ہہ۔
کرکر پا موہے مارگ پاوہُ سادھ سنگت کے انچلِ لاوہُ۔
(محلہ ۵، صفحہ ۸۰۱)

[2] (۱) گورو گوبند دوؤ کھڑے کاکے لاگوں پائے
بلہاری گورو آپنے جن گوبند دیا دکھائے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اِس سلسلے میں سائیں جی کی چند کافیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: "رانجھا جوگیڑا بن آیا" میں آپ رُوح اور مُرشد کے اصل رشتے کو بیان کرتے ہیں۔ مُرشد کی آنکھیں" لعل سے واقف کرواتی ہیں" اس کی صُورت میں یُوسف (ربّ) کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دراصل رُوح شکل و صُورت سے مُبرا ہے۔ یہ مجسّم نُور ہے۔ لیکن اِس مادّی دُنیا میں جوگن بن کر آئی ہے، یعنی اِس عالمِ کثیف میں رُوح نے جسم کا لبادہ پہنا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رانجھے کو بھی دُنیا میں 'جوگی' بن کر آنا پڑتا ہے۔ لیکن جب ہیر (رُوح) کو جوگی (مُرشد) کی صفات میں رانجھے (خُدا) کی صفات کی جھلک ملتی ہے تو وُہ بے اختیار جوگی کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ اُس کے اندر ازل سے سویا ہوا عشقِ الٰہی بیدار ہو جاتا ہے۔ وُہ پچھتاتی ہے کہ جوگی کے پیار سے پہلے کی عُمر فضول ضائع گئی۔ جب اس کا جوگی پر اعتقاد پختہ ہو جاتا ہے تو جوگی اس کو اپنے ہمراہ تختِ ہزارے (مقامِ حق) لے جاتا ہے ؎

رانجھا جوگیڑا[1] بن آیا، واہ سانگی سانگ رچایا
ایس جوگی دے نین کٹورے، بازاں وانگوں لیندے ڈورے
مُکھ ڈٹھیاں دُکھ جاون جھورے[2]، ایہناں اکھیاں لعل لکھایا
ایس جوگی دی کیہہ نشانی، کن وِچ مُندراں گل وِچ گانی[3]

(بقیہ۔ فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحے سے آگے)

(ب) کبیرا ہری کے رُوٹھتے گُورُو کی سرنی جائے
کہو کبیر گُورُو رُوٹھتے ہری نہیں ہوت سہائے
(کبیر)

(پ) رام تجُوں پے گُورُو نہ لسباروں، گُورُو کے سم ہری کوں نہ نہاروں
ہری نے جنم دیئو جگ ماہیں، گُورُو نے آواگون چُھٹراہیں
ہری نے پانچ چور دیئے ساتھا، گُورُو نے لئی چھٹرائے اناتھا
ہری نے کُٹمب جال میں گیری، گُورُو نے کاٹی ممتا بیری
ہری نے روگ بھوگ اُرجھائیو، گُورُو جوگی کر سبے چھُٹرائیو

[1] جوگی [2] دُور ہو جاتیں [3] ڈوری، مالا

(باقی اگلے صفحہ پر)

صُورت ایس دی یُوسف ثانی ۔ ایس الفوں احد بنایا
رانجھا جوگی تے مَیں جوگیانی، اِس دی خاطر بھرساں پانی
ایویں پچھلی عُمر وِہانی۔ ایس ہُن مینُوں بھرمایا
مُلھا شوہ دی ہُن گت پائی، پریت پُرانی شور مچائی
ایہہ گل کیکُوں[۲] چھُپے چھپائی۔ ے تخت ہزارے نوں دھایا[۳]
رانجھا جوگیڑا بن آیا ؎
واہ سانگی سانگ رچایا ۱۵

دُوسری کافی "میرے کیوں چِر لائیا ماہی" میں بھی ہیر اور رانجھے کی ہی داستان قلمبند ہے
آپ اِس میں اِشارہ کرتے ہیں کہ دُنیا کی تخلیق کا حُکم (کُن فیکُون) ہوتے ہی رانجھا ہیر کو لانے
کیلئے تخت ہزارے (مقامِ حق) سے چل پڑا۔ رانجھا دراصل اللہ تعالے تھا، لیکن چُوچک
اور ملکی (من اور مایا) کے دیس میں آکر اس کو اُن کی چاکری کا سوانگ بھرنا پڑا۔ ہیر کو جب
جبراً کھیڑے (نفس، شیطان) کے ساتھ بھیجا گیا تو رانجھے کو جوگی کا بھیس بدل کر اُس کے پیچھے
جانا پڑا۔ کھیڑوں کے گاؤں میں جوگی صرف اپنے مطلب کے گھر جاتا ہے۔ یعنی جو رُوح خُوشی
خُوشی کھیڑوں کے گھر بسنا چاہتی ہے۔ جوگی اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو رُوح کھیڑوں

(بقیہ: فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

۱ ہری نے کرم بھرم بھرمائیو، گورُو نے آتم رُوپ لکھائیو
ہری نے مو سُو آپ چھپائیو، گورُو دیپک دے تاپے دکھائیو
۲ پھر ہری بندھ مکتی گتی لائے، گورُو نے سب ہی بھرم مٹائے
چرن داس پر تن من وارُوں، گورُو نہ تجوں ہری کو تج ڈارُوں (سہجو بائی)

۳ قانُونِ عشق میں حضرت انور علی رُہتکی نے عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا مفصّل تذکرہ کیا ہے
حوالہ کے لئے دیکھیں "قانُونِ عشق" صفحہ ۵۴۔

۱ گزر گئی ۲ کیسے ۳ چلا گیا

کے ہر طرح کے ساز و سامان (حواس کی لذتوں) کو ٹھوکر مار کر رانجھے کیلئے بے تاب ہو جاتی ہے تو جوگی اس کے دروازے پر جا پہنچتا ہے۔ جوگی کے پاس منتر کیا ہے؟ وُہ ہیر کے دروازے پر 'ناد' بجاتا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وُہ رُوح کو باطن میں کلمہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ جوگی ہیر کے دروازے پر چِپیا[1] بچھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن چِپیا چُگنے یعنی دُنیاوی کاروبار کرتے ہُوئے جوگی کی نظر ہمیشہ ہیر (رُوح) پر رہتی ہے۔ جب ہیر جوگی کی آنکھوں میں رانجھے کی آنکھیں پہچان لیتی ہے تو بارگاہِ الہیٰ سے ہُوئی بخشش کے طفیل جوگی اُس کو ساتھ لے کر تخت ہزارے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

میرے کیوں چِر لایا ماہی ، نی میں اُس توں گھول گھمائی[1]
کُن فیکون آوازہ آیا ، تخت ہزاریوں رانجھا دھایا
چُوچک دا اُس چاک سدایا ، اوہ آہا[2] صاحب صفائی
جوگی شہر کھیڑیاں دے آوے ، جس گھر مطلب سو گھر پاوے
بُوہے جا کے ناد بجاوے ، آپے ہویا فضل الٰہی
بُوہے پے کھڑ[3] بیا دھنگانے[4] ، ٹٹ پیا کھپّر[5] ڈلھ پئے دانے
اس دے وَل چھل کون پچھانے ، چِپیا رُل گیا وِچ پاہی[6]
چِپیا چُن چُن جھولی پاوے ، بیٹھا ہیر دے وَل تکاوے
جو کُجھ لکھیا لیکھ سو پاوے ، رو رو لڑ دے نین سپاہی
میرے کیوں چِر لایا ماہی

آپ کی ایک اَور کافی "میں ولیاں جوگی دے نال متھے تِلک لگا کے" بھی اسی رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اِس کافی میں عشقِ مجازی کے ذریعے سے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا جو خوبصورت بیان ملتا ہے وُہ اپنی مثال آپ ہے۔ اِس میں آپ جوگی (مُرشد) کو الہٰی نُور اَور اَنحد کی بانسری بجانے والا ایسا جادوگر کہتے ہیں جو اپنے سحر سے ہیر (رُوح) کا دِل موہ لیتا ہے۔ وُہ ہیر کے تصوّر پر اس

---

[1] قربان۔ [2] تھا۔ [3] جھگڑا۔ [4] بلاوجہ [5] کاسہ۔ [6] راستہ۔

طرح چھا جاتا ہے کہ ہیر کو اپنی اور دُنیا کی کوئی ہوش نہیں رہتی۔ وُہ جوگی کے پیار میں دیوانی ہو کر جوگی کے پیچھے اُس کے دیس روانہ ہو جاتی ہے۔ "کون آیا پہن لباس کُرتے" کافی میں بھی مُرشد کے قالبِ خاکی میں پوشیدہ اُس کی الٰہی اصلیت کی پہچان کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک جگہ سائیں جی نے مُرشد کو انحد کے دوار کا "گوریا" یا گوالا" کہا ہے جو ہیر کے پیار کی خاطر" موہے پریتی کو"۔ جوگی کا بھیس بنا کر دُنیا میں آتا ہے ؎

انحد دَوار کا آیا گوَرِیا ، کنگن دست چڑھائی
مُونڈ مُنڈا موہے پریتی کو ، رَٹِّن[۱] کتاں میں آئی

شبد کی مُنبی والے جوگی، رانجھے یا کاہن کی سُر ہیر کی سُر کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اِس لئے وُہ بآسانی اُس کی رُوح کو اپنے ساتھ مِلا سکتا ہے ؎

مُنبی والیا چاکا رانجھا ، تیرا سُر سبھ نال ہے سانجھا
تیریاں موجاں ساڈا مانجھا ، ساڈی سُرتی آپ ملاویں

مُرشد کی ضرورت: ایک الٰہی قانون

اُوپر کیا گیا ذکر اس اصُول کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی مالکِ کُل نے اپنے حُکم (کُن) سے دُنیا میں بھیجی گئی رُوح کو واپس اپنے ساتھ مِلانے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لی ہُوئی ہے۔ یہ ذمہ داری اور کون لے سکتا ہے؟

خُدا سے وِصال کا طریق خُدا ساختہ ہے۔ یہ قانُون اَزلی و اَبدی ہے۔ یہ ہر قسم کی ترمیم اور کمی و بیشی سے بالاتر ہے۔ اِس قانون کے مطابق مُرشد، جو مُجسّم خُدا ہوتا ہے۔ رُوح کو باطن میں کلمہ کے ساتھ جوڑ کر اِس عالمِ فانی سے نجات دِلا کر واپس مقامِ حق[۲] لے جاتا ہے۔

---

[۱] ایک چھوٹی گھنٹی۔ یہاں اشارہ انحد شبد کی گھنٹی کی آواز کی طرف ہے۔

[۲] (ا) دُھر خصمے کا حُکمُ پائیا وِن ستگور چیتیا نہ جائے۔ (محلہ ۳، صفحہ ۵۵۶)

(باقی اگلے صفحہ پر)

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قُدرت کے قانون تبدیلی سے مبرّا ہیں۔ ہر ایک بیج کو ایک خاص پھل لگتا ہے۔ کائنات کے قانونِ پیدائش اور قانونِ گردِش کائنات کی تخلیق کے وقت ہی قائم کر دیئے گئے۔ اُن میں آج تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہُوئی۔

کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اشرف المخلوقات کہلانے والا انسان کائنات کے باقی سب قوانین کو اچھی طرح سمجھتا، پہچانتا اور قبول کرتا ہے، لیکن اس اَزلی قانون کو سمجھنا اور ماننا تو درکنار اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

اَولاد مَرد و عَورت کے جِنسی ملاپ سے پَیدا ہوتی ہے۔ بیماری کی شفا طبیب کی دوا کھانے سے ہوتی ہے۔ ہر فن کا مکمّل علم اُس فن کے ماہر سے حاصل ہوتا ہے۔ عَین اِسی طرح اللّٰہ تعالیٰ سے وصال کی ترکیب اُس کے کسی محرم (مردِ کامل) سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

اپنے وقت کا مُرشدِ کامِل

ہم ماضی میں ہُوئے پیروں، پیغمبروں، مُرشدوں اور وَلیوں پر جن کو اُس وقت طرح طرح کی اذیتیں دی گئی تھیں، اعتقاد لانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن زمانۂ حال کے کامل فقیروں پر ایمان لانے میں راضی نہیں ہوتے۔

یہ عَین اُسی طرح ہے جس طرح کوئی عَورت صَدیوں پہلے ہو چکے کسی مَرد کے تصوّر سے اَولاد پَیدا کرنے کی خواہش کرے، کوئی مریض آج لُقمان کے خیال سے بیماری سے چُھٹکارہ

بقیہ:۔ فُٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آگے

(ب) مولانا رُومؒ اِسی موضوع پر فرماتے ہیں:۔ تُو راستہ طے کرنے کے لئے ایک راہبر کو ڈھونڈ کیونکہ تیرا راستہ آفتوں اور خطروں سے بھرپُور ہے۔ جس کسی کے بغیر راہبر کے اِس راہ پر چلنے کی غلطی کی، اُس کو راہزنوں نے گمراہ کیا، اور اُسے مُصیبتوں کے کنوئیں میں دھکیل دیا:۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر، ہست بس پُر آفت و پُر خوف و خطر
ہر کہ اُو بے مُرشدے در راہ شُد، اُو ز غولاں گمرہ و در چاہ شُد

حاصل کرنا چاہیے یا کوئی طالب علم ارسطو اور افلاطون پر ایمان لاکر عالم فاضل بننا چاہیے۔ ہر ایک حالت میں وقت کے خاوند، وقت کے طبیب، وقت کے رُوحانی راہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دُنیا میں ہر وقت، ہر جگہ ماہر طبیب، موسیقار، جرنیل، مصوّر فلسفی اور سائنسدان پیدا ہو سکتے ہیں، تو کامل فقیروں کی آمد کو کسی خاص وقت، جگہ، قوم یا مذہب تک ہی محدُود کیونکر کیا جا سکتا ہے؟

سردار اقبال علی کے مُطابق صُوفی درویشوں کا عقیدہ ہے کہ جس قادر نے دُنیا کے لوگوں کو ہر زمانے میں ہر جگہ، بلا امتیاز ہوا، پانی، زمین اور روشنی کی نعمتیں عطا کی ہیں، وُہ ان کی رُوحانی ترقی کے لئے بھی اپنا رحم وکرم یکساں طور پر تقسیم کرتا ہے۔ جس طرح دُنیا کے مادی مسائل کے حل کے لئے مختلف شخصیتیں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح لوگوں کی روحانی ضروریات پُوری کرنے کیلئے بھی پیر، پیغمبر دُنیا میں آتے رہتے ہیں۔[1]

سردار اقبال علی کے مطابق صُوفی درویشوں نے اپنے خیالات کی تائید میں قُرآنِ پاک کی آیات کے حوالے دیئے ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ خدا نے تمام قوموں کی رُوحانی ترقی کے لئے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ اُس خالق کے ذریعے سے الگ الگ قوموں اور وقتوں کے لئے بھیجے گئے پیغمبروں میں کسی قسم کی تفریق نہ کرو، اور من مانی چھوڑ کر رَب کے بنائے آئین کے مطابق اس کی تلاش کرو۔[2]

علی بن الحسین الحکیم الترمیش کہتے ہیں: کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفہ ابُوبکر[3] اور علی[4] کے بعد آنے والے وَلی اُن کی طرح یا اُن سے اعلیٰ نہ ہو سکیں۔ رَبی رحمت کو زمانۂ حال کے لوگوں پر وار دہونے

---

[1] Sirdar Ikbal Ali Shah, Islamic Sufism, Samuel Weiser Inc. New York, 1971 p. 35.

[2] Thus the Quran says in this respect : "Say, we believe in God and in what has been revealed to us, as well as to Abraham, Ishmael, Issac, Jacob and their descendants ; we also believe in what was given to Mosese, Jesus, and to all the prophets raised by the Creater of the Universe, we accept all of them, without making any distinction among them." (2 : 136)

سے کون روک سکتا ہے؟ لوگ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ آج کوئی صِدّیق، مُقرّب، مُعتدبہ یا مُصطفےٰ دُنیا میں نہیں ہے۔[1]

ابنِ عربی کہتا ہے کہ وَلیُ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے، جس کی وجہ سے اللہ کی طرح وَلی بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ایک لگاتار اور قائم و دائم سِلسلہ ہے۔ وَلی اللہ نفسِ امّارہ کو فنا کر کے انسانِ کامل بن چُکا ہوتا ہے۔ وُہ خدا ہی کی صُورت ہوتا ہے[2] اور دُنیا سے وَلی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے وقتوں کے کامل فقیر

پہلے وقتوں میں ہُوئے مُرشدِ کامل، پیر، پیغمبر، سنت سنگوُرو آج کہاں ہیں؟ یقیناً وُہ اللہ تعالےٰ میں سَما چکے ہیں۔ آج اُن پر اعتقاد رکھنے کی بجائے براہِ راست اللہ تعالیٰ پر ہی کیوں نہ بھروسہ کر لیا جائے، کیونکہ وُہ بھی تو اُس میں ہی سمائے ہُوئے ہیں اور ہمارا اصل مقصد بھی اُسی میں سما جانا ہے۔ اگر ہم آج اللہ تعالیٰ سے براہِ راست امداد حاصل کر سکتے ہیں، تو پچھلے وقتوں میں ہُوئے لوگ کیوں نہیں کر سکتے تھے؟ اُس وقت کسی پیر و مُرشد کے آنے کی کیا ضرُورت تھی؟ کسی ایک وقت میں بادلوں سے بارش ہونے کا مطلب ہے کہ بارش صرف بادلوں کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اور کسی ایک وقت میں کسی رُوحانی رہبر کی ضرُورت کا مطلب ہے کہ انسان فقط اپنے وقت کے رُوحانی راہبر سے ہی مُستفید ہو سکتا ہے۔ نبی، رسُولؐ یا مُرشدِ کامل کی ہستی خُدا کی ہستی میں جذب ہو چکی ہے۔ اُس کی اصلیّت اس کے باطن میں جلوہ فرما الہٰی نُور ہے، جو کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، کسی بھی انسانی قالب میں بیٹھ کر اپنا کام کر سکتا ہے۔

---

[1] "Who can prevent the mercy of God from prevailing in these modern times ? No body can check it, for it is continuous. Do they think that there is no **siddiq**, no **muqarrab**, no **muitaba**, no **mustafa** now a days ?" **History of Sufism in India, V. I, p. 41.**

[2] **History of Sufism in India, V. 1, p. 108.**

رِضوی صُوفی سِلسلوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ پیر اپنا قالب چھوڑنے سے پہلے اپنا رُوحانی جانشین مقرر کرتا تھا، اور اس کو اپنا سجادہ، عصائے پیری (چھڑی)، اور خرقہ نشانی کے طور پر دیتا تھا۔ اس کی جگہ بیٹھنے والا پیر سجادہ نشین کہلاتا تھا۔[1]

مولانا رُوم وقت کے مُرشد کی بابت ہدایت کرتے ہیں :۔ " تو اپنے وقت کے مُرشد سے ناتا نہ توڑ۔ اپنی تدبیر اور اپنے قدم پر بھروسہ نہ کر : ؎

مگسل از پیغمبرِ ایامِ خویش
تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

بھائی گورداس جی نے اپنی واروں میں گورو نانک دیو جی سے گورو ہر گوبند صاحب تک اور بھائی نند لال گویا نے اپنی تصنیف 'جوت بکاس' میں گورو نانک صاحب سے گورو گوبند سنگھ جی تک گورگدی کے پہنچنے کے بارے میں یوں بیان کیا ہے :۔ ؎

۱۔ نرنکار نانک دیو نرنکار آکار بنایا
گور انگد گور انگ تے گنگھو جان ترنگ اُٹھایا
امرداس گور انگدہو جوت سروپ چلت ورتایا
گور امرہو گورو رامداس انحد نادہو سبد سُنایا
رامداسہو ارجن گورو درسن درپن وچ دِکھایا
ہرگوبند گورو ارجنہو گور گوبند ناؤں سدوایا
گورو مورت گور سبد ہے سادھ سنگت وچ پرگٹی آیا
پیری پائے سبھ جگت نِوایا

(وار ۲۴ ، پوڑی ۲۵)

---

[1] History of Sufism in India. Vol. I, p. 4.

۲۔ واہ واہ گُورُو سمرتھ پُورننگ، واہ واہ گُور سچا شُودننگ
واہ واہ گور کبہہ نہ جھُوننگ ، واہ واہ گُور کلا سمپُورننگ
نانک سوانگد گور دیوننگ ، سو امرداس ہرسیوننگ
سورامداس سوارجننگ ، سو ہرگوبند ہرپرسننگ
سوکرتا ہرراۓ داناۓننگ ، سو ہرکشن اگم اپارننگ
سو تیغ بہادرست سروپننگ ، سو گورگوبند سنگھ ہرکارونینگ
سب ایکو ایکننگ ، نہیں بھید نہ کچھ بھی پکھیننگ
(بھائی نندلال گویا)

بھائی گورداس جی اور بھائی نندلال گویا کے یہ بیانات قابلِ غور ہیں۔ بھائی گورداس نے گُورُو صاحبان کے گُورُوپن کو کسی ایک خاص جسم تک محدود نہیں کیا، بلکہ اُسے اُس جسم کے ذریعے کام کر رہے خدا کے نُور کے ساتھ جوڑا ہے۔ آپ گُورُو کو نراکار کا آکار کہتے ہیں، اور پاربرہم پرمیشور رُوپی گنگا کی ترنگ کہتے ہیں۔ آپ گُورُوپن کے ایک گُورُو ہستی سے دُوسری گُورُو ہستی میں پہنچنے کے سِلسلہ کو انحد شبد کے ایک گُورُو سے دوسرے گُورُو میں منور ہونے کا نام دیتے ہیں، کیونکہ گُورُو کی اصل صُورت اس کے اندر کارفرما پرماتما کا شبد ہے: 'گور مُورت گور شبد ہے۔' اسی طرح بھائی نندلال جی گُورُو کو پرماتما کی پُورن کلا (کلا سمپورننگ) ہری کی جھو (ہری پرسننگ)، اور ہری کا رُوپ (ہرکارونینگ) کہتے ہیں۔ گُورُو اپنے قالب کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس قالب کے ذریعے کام کر رہی طاقت کے سبب خُدا 'کرتا ہے، دانا ہے، اگم، اپار ہے۔ اور خُدا کا رُوپ ہے۔

گورو امرداس جی سمجھاتے ہیں کہ مُرشد کی گدّی یا سلسلہ ہر زمانے میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ہر زمانے میں قائم رہنے والی اصلیت خُدا کا نُور ہے۔ کوئی جسم ہمیشہ نہیں رہ سکتا، لیکن نُور ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ اِس سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ پیری کی بُنیاد جسم نہ ہو کر اس میں کام کرنے والی خُدا کی لافانی طاقت ہے۔

ہر جگہہ جگو جگ جگہہ جگو، سد پیڑی گورو چلندی
جگ جگ پیڑی چلے سنگورکی، جنی گور مکھ نام دھیا یا

(محلہ ۴، صفحہ ۷۹)

ایک مُرشد سے دوسرے مُرشد کا ظہور میں آنا چراغ سے چراغ جلانے کی مانند ہے، کیونکہ مُرشد میں کام کرنے والی طاقت اللہ تعالےٰ کا کلمہ ہے۔ جو مُرید مُرشد کے ذریعے اِس جوہرِ حقیقی کی کھوج کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالےٰ کی ہستیٔ پاک سے نسبت قائم کر لیتے ہیں۔

آپ نرائن کلا دھار جگ مہہ پرورِیو
نرنکار آکار جوت جگ منڈل کرِیو
جہہ جہہ تہہ بھرپور سبد دیپک دیپائیو
جہہ سکھہ سنگرہیو تت ہر چرن مِلائیو
نانک کُل نِمل اَو ترِیو انگد لہنے سنگ ہو
گورو امر داس تارن ترن جنم جنم پاسرن تو

(آدی گرنتھ، صفحہ ۱۳۹۵)

اِس سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ گورو یا مُرشد ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ مُرشد کا ربّ رُوپ ہونا بھی لازم و ملزوم ہے۔ قاعدہ یہ نہیں کہ نجات کسی بھی مُرشد کے ذریعے سے ہوگی، بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ نجات مُرشدِ کامل کے ذریعہ ہی ہوگی۔ بلاشک ایسے مُرشدِ کامل بہت کم ہیں۔

کبیر صاحب، دادُو صاحب وغیرہ کئی فقرأ کی بہت سی گدیاں چلی ہیں۔ کیونکہ نفیر کامل فنا ہونے والے خاکی جسم کو چھوڑنے وقت اُس میں پنہاں رحمانی تجلّی کو دوسرے قالب میں منتقل کر دیتا ہے۔ قالب نئے سے نیا ہو سکتا ہے، لیکن نُورِ ازل سے ایک ہے، کیونکہ نُور خود اللہ پاک ہے۔[۵۱]

سائیں بلھے شاہ نے اپنے کلام میں مُرشد اور خدا کے لئے رانجھا، پنوں، مہیں وال، ڈھولا، شنی، رام، کرشن، کاہن، عیسیٰ کے جو استعارے استعمال کئے ہیں اور جس طرح منصور، زکریا، سرمد، بوعلی

۵۱ History of Sufism in India, Vol. I, p. 102.

وغیرہ بے شمار فقیروں کی رُوحانی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اُس سے اِس حقیقت کے بارے میں کسی شک کا امکان نہیں رہتا کہ آپ پیرو مُرشد کی ذات کو کسی خاص قوم، مذہب، ملک، وقت یا مقام تک محدود نہیں کرتے۔ بلکہ اُس کو ایک ازلی اصُول، ایک لافانی ہستی اور قادرِ مُطلق کی صُورت مانتے ہیں جو کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، کسی بھی قالب میں جلوہ نُما ہو سکتی ہے۔

حضرت عیسٰیؑ نے کہا ہے :- کوئی شخص کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ وُہ خُدا کی طرف سے نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک میں دُنیا میں ہُوں، دُنیا کا نُور ہُوں[1]۔ جس نے مجھے بھیجا ہے اُس کا کام مُجھے تکمیل تک پہنچانا ہے جب تک کہ دِن ہے[2]۔ وُہ رات آنے والی ہے، جس میں کوئی شخص کام نہیں کر سکتا[3]۔ اِس کا مطلب ہے کہ اپنے وقت کے مُرشدِ کامِل سے خُدا کی سچی عِبادت کا راز حاصل کر کے جیتے جی رُوحانی سفر طے کر لینا چاہیئے۔

سائیں بُلھے شاہ مُرشد کو سوداگر اور لعل و گوہر کا بیوپاری بتاتے ہُوئے رُوح کو آگاہ کرتے ہیں کہ جب تک تُو جسم میں ہے اور مُرشد کا قالبِ خاکی قائم ہے، تُو کلمہ کا بیوپار کرے۔ مُرشد کے چلے جانے کے بعد نہ تو کلمہ کا راز مِل سکتا ہے اور نہ ہی وقتِ آخر کلمہ کی کمائی ہو سکتی ہے۔ ؎

کر سودا، پاس سوداگر ہے، ایہہ ویلا ہتھ نہ آوے گا
وَنج ونولا نال شتابی، وَنجارا اُٹھ جاوے گا
اُس دِن کُجھ نہ ہو سکسی، جد کُوچ نگارا لاوے گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کب تک حُکم چلاویں گا

اِسی لئے آپ نے اپنے مُرشد حضرت شاہ عنایت میں پہلے وقتوں کے کامِل درویشوں کے تمام وصف دکھائے ہیں۔ اور پھر اُس کو رانجھا یعنی خُدا کی صُورت مانا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرا مُرشد ہی کعبہ ہے اور مُرشد ہی قبلہ (خداوند کریم) ہے۔ مُرشد ہی شوہ (شوہر) ہے۔ اور اُسی نے مجھے سُرخ و سبز (سُوہے ساوے) لباس پہنا کر اپنے عشق میں ناچنے کیلئے مجبور کیا ہے۔

ل۱ As long as I am in the world, I am the light of the world. (John 9 : 5)

ل۲ I must work the works of Him that sent me : while it is day. (John 9 : 4)

ل۳ The night cometh, when no man can work. (John 9 : 4)

مُرشِد ہی سچی ہدایت دینے والا ہادی ہے، اور وُہی رازِ الٰہی کے بھیدوں کو کھولنے والا عارف ہے۔ وُہی اللہ کے کلمہ کا پیغام دینے والا پیامبر ہے۔ وُہی لوہے کو سونا بنانے والا پارس ہے، اور وُہی اِس پار بھٹکتی رُوح کو اُس پار لے جانے والا ناخُدا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مُرشد نبی اور ولی ہی نہیں، خود خُداوند کریم بھی ہے ۔

۱۔ (ا) ایس عشق دی جھنگی وِچ مور بلیندا
سانوں کعبہ تے قبلہ پیارا یار دسیندا
سانوں گھائل کر کے پھیر خبر نہ لیئیا
تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا

(ب) بُلھا شوہ نے آندا مینوں عنایت دے بوہے
جس پہنائے چوے مینوں ساوے تے سوہے
جاں میں ماری ہے اَڈّی مِل پیا وہیا
تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا

(پ) جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا۔
مُرشد والی لالی او یار

(ت) ویکھو نی شاہ عنایت سائیں
میں نال کردا کویں ادائیں
کدی آوے کدی آوے ناہیں
تنوں تنوں مینوں بھڑکن بھاہیں
نام اللہ پیغام سنائیں
مُکھ ویکھن نوں نہ ترسائیں

(ٹ) بُلھا شوہ عنایت عارف ہے
اوہ دِل میرے دا وارث ہے

تیں لوہا تے اوہ پارس ہے
تسیں اوسے دے سنگ گھسدے ہو
کیہتوں لامکانی دسدے ہو
تسیں ہر رنگ دے وِچ وسدے ہو

اِسی لئے سائیں بُلھے شاہ مُرشِد بن کر آئے ہُوئے رَبّ کو بار بار یاد دلاتے ہیں کہ تُو کائنات کی تخلیق کے وقت رُوحوں کے ساتھ کیا ہُوا اپنا وعدہ یاد کر جب تُو نے کہا تھا کہ تمہیں دُنیا سے واپس لانے کیلئے میں خود یہاں آؤں گا۔ آپ رَبّ کی رضا سے رُوحوں کو دُنیا میں بھیجنے کے واقعہ کو رَبّ کا "کارا" کہتے ہیں۔ اِسی لئے مُرشِد کی صُورت میں آئے خُدا کو طنز کرتے ہُوئے یاد دلاتے ہیں کہ تُو نے وعدہ کیا تھا کہ "تم چلو میں جلدی آؤں گا" اب تُو وہ وعدہ بھُول گیا ہے۔ اور ہمیں کائنات کی بھُول بھُلیوں میں ڈال دیا ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ تو ہمارے گُناہوں کی طرف نہ دیکھ بلکہ اپنا کیا وعدہ یاد کر۔ ہم اِس مادی دُنیا سے اُکتا چکے ہیں۔ اور مقامِ حق واپس جانا چاہتے ہیں۔ تُو اپنی رحمت سے ہمیں ساتھ لے چل ۔

۱۔ نال رُوحاں دے لارا لایا، تسیں چلو میں نالے آیا
اپنے پردا چا بنایا، میں بھرم بھُلایا پھردا ہاں
میں گل اَوتھے دی کردا ہاں

۲۔ اَوگن ویکھ نہ بھُل میاں رانجھا، یاد کریں اُس کارے نُوں
دِل لوچے تخت ہزارے نُوں

۳۔ الست کیہا جد اکھیاں لائیاں، ہُن کیوں یار وساری
نیں کُنبھڑا چُن چُن ماری

مُرشِد بارے دِیگر فقراء کا نظریہ

صُوفی درویش ابُو لفیض ثوبان ابن ابراہیم المصری (۷۷۰ تا ۸۶۰ - ۶۱) کہتے ہیں کہ درویشوں۔

اَولیاؑ اور فُقراؑ کی بزرگی کا راز اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ ان کا وجُود اللہ تعالیٰ میں واقع ہوتا ہے[1]
درویشوں میں ربّانی اُلفت کا نُور برستا ہے۔ وُہ الٰہی رحمت کا لباس پہنے ہوتے ہیں۔ اور اُن کا سر رحمانی مسرت کے تاج سے آراستہ ہوتا ہے۔ خدُا اپنی مخلُوق کے دِل میں درویشوں کے لئے پیار پیدا کرتا ہے۔ درویش رضائے خدُا کی تعمیل کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ درویشوں سے یُوں مخاطب ہوتا ہے: تم میرے سِوا کسی سے نہ ڈرو۔ اور نہ ہی میرے سوا کسی کو حاکم مانو۔ جو تمہارے ساتھ دُشمنی کا سلوک کرتا ہے وُہ میرا دُشمن ہے۔ جو تمہارے ساتھ دوست بن کر پیش آتا ہے، میں اُس کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آتا ہُوں۔ تُم میرے درویش ہو۔ تُم میرے اور میں تمہارا ہُوں[2]،
گورُو ارجن دیو جی فرماتے ہیں ؎

میرے رام رائے تُوں سنتاں کا سنت تیرے

(محلہ ۵، صفحہ ۷۴۹)

مولانا رُوم نے فرمایا ہے کہ ؎

خواجہ را چُوں غیر گفتی از قصُور
شرم دار اے اَحول از شاہِ غیُور

خواجہ را کُو در گذشت ست از اثیر
جنسِ ایں موشانِ تاریکی مگیر

خواجہ را جاں بیں مبیں جسمِ گراں
مغز بیں اُو را مبیں اُستخواں

خواجہ را از چشمِ ابلیسِ لعیں
منگر و نسبت مکُن او را بطیں

---

[1] History of Sufism in India, Vol. I, p. 47
[2] Ibid, p. 48

ہمرِ خورشید را شپّر مخواں
آنکہ اُو مسجود شُد ساجد مداں

خدمتِ اُو خدمتِ حق کردن ست
روزِ دیدن دیدنِ آں روزن ست

خاصہ ایں روزن درخشاں از خُود ست
بے وَدیعت آفتاب و فرقد ست

ہم ازاں خورشید زد بر روزنے
لیک از راہ و سُوئے معہودنے

دو مگوے دو مخوان و دو مداں
بندہ را دَر خواجۂ خود محوداں

خواجہ ہم در نُورِ خواجہ آفریں
فانی ست و مُردہ و مات و دفیں

چُوں جُدا بینی ز حق ایں خواجہ را
گم کُنی ہم مَتن و ہم دیباجہ را

چشمِ دِل را ہیں گذارا کُن زطیں
ایں یکے قبلہ است دو قبلہ مبیں

چُوں دو دیدی ماندی از ہر دو طرف
آتشے درخف فتاد و رَفت خف

مطلب:۔ اے بھینگی نظر والے! اگر تُو ناسمجھی سے مُرشِد کو (رَب کے عِلاوہ) کچھ اور کہتا ہے۔ تو اُس غیرت والوں کے بادشاہ (رَب) سے شرم کھا۔

وُہ مُرشِد جو بندش سے بالاتر ہے، اُس کو اندھیرے میں رہنے والے چُوہوں کی جنس میں شُمار نہ کر۔

خواجہ (مرشد) کو جان سمجھ، بھاری جسم نہ سمجھ، گودا سمجھ، ہڈی نہ سمجھ۔ (یعنی وہ جوہرِ حقیقت ہے مادی شے نہیں ہے)

خواجہ کو کمینہ شیطان کی نظر سے نہ دیکھ - اس کا مقابلہ مٹی (اشیاء آب و گل) سے نہ کر۔

سورج کے ہمراہی کو چمگادڑ نہ کہہ۔ مسجود (جسے سجدہ کیا جاتا ہے) کو سجدہ کرنے والا نہ سمجھ۔

اُس کی خدمت کرنا رب کی خدمت کرنا ہے اس کو دیکھنا سورج اور روزِ روشن کو دیکھنا ہے۔

اُس کی یہ خوبی ہے کہ وہ سورج اور ستاروں کے بغیر از خود روشن ہے۔

اسی سورج سے دریچہ پر روشنی پڑی ہے، راستہ دکھانے والے ستاروں سے نہیں۔

تو (مرشد اور خدا کو) دو نہ کہہ، دو نہ پڑھ اور دو نہ سمجھ۔ غلام کو اپنے آقا میں فنا ہوا دیکھ۔

خواجہ، خواجہ کو پیدا کرنے والے نور میں ہے۔ وہ اُس میں فنا ہو چکا ہے، مر چکا ہے، دفن ہو چکا ہے

اگر تو مرشد اور خدا کو دو سمجھے گا تو سمجھ لے کہ تیری اصل کتاب بھی گئی اور اس کا دیباچہ بھی گیا۔

خبردار! دل کی آنکھ کو جسمِ خاکی سے آگے لے جا (یعنی باطن کی آنکھ کو کھول)۔ وہ نوری قبلہ (خدا) اور خواجہ (مرشد) دو نہیں ہیں۔

جب تو نے (خدا اور مرشد کو) دو کر کے دیکھا تو ہر دو جہان (دین و دنیا) سے جاتا رہا، جس طرح سلگتی چیز کو آگ جلا کر ختم کر دیتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کہتے ہیں: تم نہ تو مجھے جانتے ہو، نہ ہی میرے باپ کو جانتے ہو۔ اگر تم مجھے جان لیتے تو میرے باپ کو بھی جان جاتے[1]۔ میں ہی راستہ ہوں، میں ہی حقیقت

[1] Ye neither know me, nor my Father. If ye had known me, ye should have known my father also. (John 8 : 19)

اَور زندگی ہُوں۔ کوئی بھی بغیر میرے (وسیلے کے) باپ کے پاس نہیں پہنچ سکتا۔[ا]

سنت نامدیو جی کہتے ہَیں:۔ خُدا نے کہا ہے کہ مَیں ساری دُنیا کی جان ہُوں۔ لیکن میری جان میرے درویش ہیں:۔

"مَیں گُن بندھ سگل کی جیون میرا جیون میرے داس"

(آدگرنتھ ۱۲۵۳)

دادُو صاحب کہتے ہَیں:۔

۱۔ دادُو سیوک سائیں کا بھیا، تب سیوک کا سب ہوئے
سیوک سائیں کوئی مِلیا، تب سائیں سرِکھیا[۲] ہوئے

۲۔ جئوں یہ کایا جِیو کی، تیوں سائیں کے سادھ
دادُو سب سنتو کِھئے، مانے[۳] آپ اگادھ

پلٹُو صاحب خُدا کی طرف سے کہتے ہیں:۔

۱۔ سنت ہماری دیہہ اور نہ کوئی ہے۔
ڈھرے لپینہ سنت ڈھرے مور لوہُو ہے۔

(بھاگ ۲، اِرل ۱۸)

۲۔ سنت ہمارے پران رہتوں میں ساتھ میں
تین لوک سب رہے سنت کے ہاتھ میں

(بھاگ ۲، اِرل ۱۷)

۳۔ سادھ ہماری آتما ہم سادھن کے داس
پلٹُو جو دوئیت[۴] کرے ہوئے نرک میں باس

(بھاگ ۲، ساکھی ۶۲)

[ا] I am the way, the truth and the life: no man cometh unto Father but by me. (John 14 : 6)

[۲] جیسا۔ [۳] اُن کے اندر خود خُدا ہے۔ [۴] دوئی دیکھے۔ یعنی سنت اور پرماتما کو جُدا سمجھے۔

عِلم اَور رُوحانیت

عالِم اَور عارِف

۱۔ اَلِف[1] اللہ دِل رَتّا میرا، مَینُوں 'ب' دی خبر نہ کائی
بے[2] پڑھیاں کُجھ سمجھ نہ آوے، لذّت الف دی آئی
عَین[3] تے غَین دا فرق نہ جاناں، ایہہ گل الف سمجھائی
بُلّھیا[4] قول الف دے پُورے، جیہڑے دِل دی کرن صفائی

۲۔ اَساں پڑھیا عِلم تحقیقی اے، اَوتھے اِکو حرف حقیقی اے
ہور جھگڑا سب وَدھیکی اے، اَیویں رَولا پا پا بہندی اے
مُنہ آئی بات نہ رہندی اے

دُوسرے کامِل فقیروں کی طرح سائیں بُلّھے شاہ نے بھی وید کتیب اَور گرنتھوں، پوتھیوں کے علم پر ذاتی رُوحانی تجربے کو ترجیح دی ہے۔ آپ خود صاحبِ عِلم و فضل تھے، مگر آپ کو رُوحانی دَولت اُس ارائیں فقیر سے مِلی جو بظاہر پیاز کی پنیری لگا رہا تھا، اَور جو دراصل مُتلاشیانِ حق کے دِل میں اُس حق کے کلمہ کا پَودا لگانے کا ماہِر اُستاد تھا۔ سائیں جی کے سامنے اپنے مُرشِد کی رُوحانی عظمت اَور پاکیزہ و اعلیٰ قِسم کی زندگی کی ٹھوس مثال تھی۔ عالِم، فاضِل اپنے عِلم کو زر و دَولت، عِزّت و آبرُو کمانے کا وسیلہ بنا رہے تھے لیکن

---

[1] "الف" عَربی، فارسی اَور حرُوفِ تہجّی (Alphabet) کا پہلا حرف ہے جِس کا اشارہ ایک رَبّ یا وَحدانیت کی طرف ہے۔

[2] 'ب' حروفِ تہجّی کا دُوسرا حَرف ہے۔ اللہ کے علاوہ باقی جو کچھ ہے، سب کو 'ب' یا دُوسرا کہا جاتا ہے۔

[3] عَربی اَور فارسی حرُوفِ تہجّی میں 'ع' اَور 'غ' میں صِرف اِتنا فرق ہے کہ 'ع' کے اُوپر نُقطہ لگانے سے 'غ' بن جاتا ہے۔ آپ کا مطلب ہے کہ خدا اَور مُرشد میں فرق صِرف اِتنا ہے کہ خُدا جو سب حدُود سے بالاتر ہے، اُس نے مُرشد میں انسانی قالب اختیار کر رکھا ہے۔ [4] وُہ لوگ ہی 'الف' کے مکمّل حکم کو سمجھتے ہیں جو دل کی صفائی کرتے ہیں۔

حضرت عنایت شاہ محنت اور مشقت کی کمائی کرتے ہُوئے اپنی روحانیت کی اعلیٰ دولت مفت تقسیم کررہے تھے۔ دُنیا کے عظیم صُوفی عارف مولانا رُوم نے فرمایا تھا کہ شمس تبریز کا غلام بنے بغیر مولوی رُوم کبھی مولانا رُوم نہیں بن سکتا تھا ؎

مولوی ہرگز نہ شُد مولائے رُوم تا غلامِ شمس تبریزی نہ شُد

سائیں جی نے بھی ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا ہے ؎

جے توں باغ بہاراں لوڑیں
چاکر ہو ارائیں دا

عِلم سینہ اور عِلم سفینہ

مندرجہ بالا بیان علمِ سینہ[1] کی علمِ سفینہ[2] پر عظمت کی زندہ مثال ہے۔ سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ مذہبی کتابوں کا عمل سے خالی علم عذابوں کی گٹھڑی ہے۔ عالم لوگ مذہبی کتابوں کی تشریح کرتے وقت بال کی کھال اُتارتے ہیں، مگر وُہ اندرُونی راز کے تئیں بالکل کورے اور ناواقف ہیں۔ اُنہیں نہ تو حقیقت کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اور نہ ہی وُہ کتابوں میں درج شدہ تعلیم کے مطابق اپنی طرزِ زندگی بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علم کا مقصد سچ کا راستہ دِکھانا اور اس کے حصُول میں مدد کرنا ہے۔ جس عِلم سے نیت صاف نہ ہو، نفس پر قابُو نہ پایا جا سکے، اور عملی زِندگی پاک و صاف نہ ہو سکے، ایسے علم کا کیا فائدہ؟ آپ کہتے ہیں ؎

کیوں پڑھنا ایں گڈ کتاباں دی، سر چانا ایں پنڈ عذاباں دی
اگے پینڈا مُشکل بھارا اے، اِک الف پڑھو چھٹکارا اے
بن حافظ حفظ قرآن کریں، پھر نعمت وچ دھیان کریں

حکیم سنائی کا قول ہے کہ جو علم حقیقت کی منزل تک نہیں پہنچاتا اُس سے جہالت کہیں بہتر ہے۔

---

[1] علم عارفانہ جو روحانی شغل سے براہِ راست باطن میں حاصل ہوتا ہے۔
[2] دُنیاوی یا کتابی علم۔

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار

گورونانک صاحب فرماتے ہیں ؎

پڑھیا مُورکھ آکھیئے جس لب لوبھ اہنکارا
(محلہ ۱، صفحہ ۱۴۰)

کیونکہ "پڑھیئے ناہی بھید بُجھیئے پاونا" (محلہ ۱، صفحہ ۱۴۸)

یعنی خُدا کی درگاہ میں قبول کی جانے والی شے اس کی سچی عبادت ہے، علم کا ذخیرہ نہیں ؎

پڑھ پڑھ گڈی لدیئے، پڑھ پڑھ بھریئہہ ساتھ
پڑھ پڑھ بیڑی پایئے، پڑھ پڑھ گڈیئہہ کھات
پڑھیئے جیتے برس برس۔ پڑھیئے جیتے ماس
پڑھیئے جیتی آرجا، پڑھیئے جیتے ساس
نانک لیکھے اِک گل، ہور ہومے جھکھنا جھاکھ

(محلہ ۱، صفحہ ۴۶۷)

اِس طرح کے محض کتابی علم کے بل بُوتے پر بنے عالم کی "چراغ تلے اندھیرا" والی حالت ہوتی ہے۔ وُہ دُوسروں کو نصیحت دیتا ہے اور فتوے جاری کرتا ہے۔ لیکن اُس کے اپنے اندر وہم اور شک بھرے رہتے ہیں۔ اس کے قول و فعل میں کوئی تال میل نہیں ہوتا۔ وُہ علمِ سینہ کے محرم مُرشدِ کامل کی مدد کے بغیر باہر ہی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے ؎

پڑھ پڑھ مسئلے روز سناویں، کھانا شک شبہ دا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کماویں، اندر کھوٹ باہر سچیار
علموں بس کریں او یار

سائیں جی نے فرمایا ہے کہ مُلّاں اور مشعلچی لوگوں کو روشنی دکھاتے ہیں، لیکن خود اندھیرے میں رہتے ہیں ؎

مُلّاں نے مشا ئچی دوہاں اِکو جِیت
لوکاں کردے چانناں آپ ہنیرے نِت

عُلما جو دُوسروں کو نصیحتیں کرتے ہیں مگر خُود دُنیاوی ہوس کا شکار ہیں اور نام کے راز سے بے بہرہ ہیں۔ خُدا کی درگاہ میں سزا پاتے ہیں ؎

پڑھ پڑھ پنڈت بید وکھانہہ ، مایا موہ سُواسئے
دُوجے بھائے ہرنام وِساریا، مَن مُورکھ مِلے سجائے

(محلہ ۳، صفحہ ۸۵)

پلٹو صاحب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ جس پنڈت نے تمام علم تو حاصل کیا، مگر خود کو نہ پہچانا، اُس کے علم کا کوڑی مول نہیں۔ سچا پنڈت وُہ ہے جو لوگوں کو تعلیم دینے کی بجائے نفس اور حواس کو قابُو میں رکھ کر رُوح کی پہچان کرتا ہے ؎

پَڑھ پَڑھ کیا تم کِینا پنڈت ، اَپنا رُوپ نہ چینا
اَورن کو تُم گیان بتاؤ ، تُم کو پَرے نہ بُوجھی
جِس مسائچی سَبہیں دِکھاوے ، واکو پَرے نہ سُوجھی
اپنی خبر نہیں ہے تُم کو ، اَورن کو پرلوڈھو
پڑھنا گُننا چھوڑ کے پانڈے ، اَپنی کائیا سودھو
اِندریئن[1] سے عاجز تُم رہتے ، اِندری مار گراؤ
مایا خاطر تک تک مرتے ، مَن اپنا سمجھاؤ
بُدھی نہیں پر بین[2] چیتر ہو ، کھانڈ دُھوربِن سانو
پلٹو داس کہے سُن پانڈے ، بچن ہمارا مانو

(بھاگ ۲، شبد ۹۹)

---

[1] تُو حواس کا مارا ہوا ہے: تُو حواس کو اپنے قابُو میں کرے۔
[2] ماہر، سمجھدار۔

سائیں بُلھے شاہ فرماتے ہیں کہ زندگی کا اصل مقصد تو حصولِ خُدا ہے، مگر عالموں فاضلوں اور مذہبی کتابوں نے حقیر باتوں سے لوگوں کو پاگل بنایا ہُوا ہے ؎

ہور نے سبھے گلڑیاں اِک اللّٰہ اللّٰہ دی گل
کجھ رَولا پایا عالماں کجھ کاغذاں پایا جھل

کبیر صاحب فرماتے ہیں کہ مذہبی کتابوں کی کوٹھڑی کو شرلعیت کی جہالت کے قُفل لگے ہُوئے ہیں۔ پتھر کے بُتوں نے دُنیا کو ڈبو دِیا ہے، اور پنڈتوں نے لوگوں کو لُوٹ کر کھالیا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ انسان مذہبی کتابوں کے بھرم جال کو توڑ کر اپنا خیال خداوند کریم سے جوڑے۔

کبیر کاگد کی اوبری مَس کے کرم کپاٹ
پاہن بوری پرتھمی پنڈت پاڑی باٹ

(آدگرنتھ۔ صفحہ ۱۳۷۱)

پلٹو صاحب کہتے ہیں کہ پنڈت کتابوں کی لمبی چوڑی تشریح کرکے اپنی دُکانداری چلا رہے ہیں، لیکن اُن کا اپنا من مایا کے ہاتھوں بِکا ہوا ہے۔ اُنھوں نے خُود تو کبھی الہٰی نُور کی کرن تک نہیں دیکھی، لیکن دُوسروں کو خُدا سے ملانے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ وُہ خُدا کو کاغذوں میں ڈھونڈتے ہیں کہ شاید وُہ اِن میں چُھپا ہُوا ہو گا ؎

بید پُران پنڈت باچنے، کرنا اپنی دُکان ہے جی
ارتھ کو بُوجھ کے ٹیکا کرے، مایا میں من بِکان ہے جی
اَورن کو پربودھ کرے، خالی اپنا مکان ہے جی
پلٹو کاگد میں کھوجت ہے، صاحب کہیں لکان ہے جی

(بھاگ ۲، جھولنا ۵۹)

دُنیاوی حکمت خُدا کو پانے کا ذریعہ نہیں ہے ؎

سہس سیانپا لکھ ہوہِ تہ اِک نہ چلے نال

(گورونانک: جپ جی)

عقل و نفس کی کوششیں اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ خُدا سے مِلانے کی بجائے انسان کو خُودی اور تکبّر کی زنجیروں میں اَور زیادہ مضبُوطی سے جکڑ دیتا ہے۔ ؎

مَن سچّے بدّھی کیتیا کیتے بید بچار
کیتے بندھن جِیہ کے گُورمکھ موکھ دوار

(محلہ ۱ ، صفحہ ۶۲)

نفس اَور عقل محدُود ہیں۔ یہ اُس لا محدُود خداوند کریم کے وصال کا وسیلہ ہرگز نہیں بن سکتے مذہبی کتابیں ولیوں پیغمبروں کے ذاتی رُوحانی تجربے بیان کرتی ہیں۔ ہماری نجات دُوسروں کے رُوحانی مشاہدات کے پڑھنے میں نہیں، بلکہ از خُود وہی تجربات حاصل کرنے میں ہے۔ پیاس پانی پینے سے بُجھتی ہے، پانی کی تعریف کے خُوبصُورت بیان پڑھنے سے نہیں۔

عِلم تمیز اَور عمل

سائیں جی کہتے ہیں کہ عِلم کا مقصد ہماری قوّتِ تمیز کو تیز کرنا ہے۔ عِلم سچ اَور جھُوٹ غلط اَور صحیح، اچھے اَور بُرے کی تمیز سکھاتا ہے، لیکن خود عالم کہلانے والے اَور دیدہ ور ہونے کا دعوے کرنیوالے دراصل حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ وُہ نیک و بد، مومن و کافر کی پہچان نہیں کر سکتے۔ جس کے سبب وُہ دِین اَور دُنیا دونوں بگاڑ لیتے ہیں۔ جس عِلم کے باعث حرص و ہوس کی آگ ٹھنڈی ہونے کی بجائے اَور بھڑک اُٹھے یا جو عِلم دیانتداری کی بجائے بدنیتی سکھائے، اللہ تعالیٰ ایسے عِلم سے خوش نہیں ہوتا۔ وُہ تو قناعت اَور ایمانداری سے خوش ہوتا ہے، حرص و ہوس اَور بے ایمانی کے شُعلے بھڑکانے والے عِلم سے نہیں۔ بدنیت عالِم سے صاف دِل انپڑھ بدرجہ بہتر ہے ؎

۱۔ عِلموں پئے قضیئے ہور، اکھاں والے اَنّھے کور
پھڑے سعد تے چھڈے چور، دوہیں جہانی ہویا خوار

علموں بس کریں او یار

۲۔ پڑھ پڑھ مُلاں ہوئے قاضی، اللہ علماں باجھوں راضی
ہوئے حرص دنوں دن تازی۔ تینوں کیتا حرص خوار

علموں بس کریں او یار

گورونانک صاحب نے بھی سمجھایا ہے کہ عالِم کو اپنے بُرے اعمال کی سزا خود بھگتنی پڑتی ہے، اُس کے بدلے اَن پڑھ فقیر یا سادھو کو نہیں، خدا کی درگاہ میں عمل پر کھے جاتے ہیں، علم نہیں ؎

پڑھیا ہووے گنہگار تاں اومی سادھ نہ ماریئے
جیہا گھالے گھالنا تیہو ناؤ بیچاریئے
ایسی کلا نہ کھیڈیئے جت درگہ گیا ہاریئے
پڑھیا اَتے اومیا وِیچار اگّے وِیچاریئے

(محلہ ۱، صفحہ ۴۶۹)

نامور صوفی درویش خواجہ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری (۱۰۰۵ تا ۱۰۹۰) لکھتے ہیں: ایک انسان ستر سال علم حاصل کرتا رہتا ہے، لیکن اندر نور پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا شخص ساری عمر کچھ نہیں سیکھتا۔ وہ فقط الہٰی کلمہ سنتا ہے اور اس میں محو ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں منطق کام نہیں آتا۔ تم تلاش کرو۔ تو شاید تمہیں حقیقت کا دیدار ہو جائے۔[۱]

خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ بے عملوں کا وعظ نہ سننا بہتر ہے۔ ایسے واعظوں کی مجلس سے کنارہ کش ہو کر میخانے (یعنی مرشد کامل کی صحبت) میں جانا چاہیئے ؎

عناں بمیکدہ خواہیم تافت زیں مجلس
کہ وعظِ بے عملاں واجبست نشنیدن

اُس سچی درگاہ میں علم کی نہیں عمل کی قدر ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ اَن پڑھ عاملوں، عابدوں اور عاشقوں کو اپنے نزدیک بٹھاتا ہے جن علماء کے عمل ان کے علم کے مطابق نہیں، ان کو دور ہی رکھتا ہے۔

[۱] The Persian Mystics : Ansari ; p. 36. (Tr. by Sardar Sir Jogindra Singh)

بُلھیا ہر مندر میں آئے کے کہے لیکھ دیؤ بتا
پڑھے پنڈت پاندے دُور کئے ، احمق لئے بُلا

(دوہڑے)

جس پنڈت کے دِل میں خود نفسانی خواہشات کی آگ لگی ہوئی ہے اور وہ دوسروں کو نصیحت کرتا پھرتا ہے. وہ کبھی بھی آواگون کے چکر سے آزاد نہیں ہو سکتا ہے

۱- پڑھ پنڈت اوراں سمجھائے - گھر جلنے کی خبر نہ پائے

(محلہ ۳، صفحہ ۱۰۴۶)

۲- اور اپدیسے آپ نہ کرے - آوت جاوت جنمے مرے

(محلہ ۵، صفحہ ۲۶۹)

رُوحانیت میں کامیابی کا راز نرم دِلی ، فراخدلی ، پیار ، بھروسہ اور عاجزی ہے - اِس میں اپنی مرضی کو چھوڑ کر مُرشد کی ہدایت کے مطابق چلنا پڑتا ہے . اور "من مت" کی بجائے مالکِ کُل کی رضا میں رہنا پڑتا ہے - اِس کے برعکس کتابی علم، تکبر، دُوئی، نفرت اور جھگڑے پیدا کر کے دِل کو پراگندہ کر دیتا ہے . سائیں جی اشارہ کرتے ہیں کہ حکم سے عُذر کرنے والا اور خُودی کو ہوا دینے والا علم بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتا ہے ہ

بہتا عِلم عزازیل نے پڑھیا ، جُھگا جھا اوسے دا سَڑیا
گل وِچ طوق لعنتُ دا پڑیا ، آخر گیا اوہ بازی ہار
عِلموں بس کریں او یار

مذہبی کُتب اور رُوحانیت

مذہبی کتابوں کا اصل مقصد ہمیں عالِم فاضل بنانا نہیں ، عامِل بنانا ہے . سائیں بُلّھے شاہ نے ایک نہیں بلکہ کئی کافیوں میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ درگاہِ الٰہی میں رسائی کے لئے مُرشد اور کلمہ کے عِشق کے ایک 'الف' کے علاوہ کسی دُوسری 'ب' 'پ' 'ت' کی ضرورت نہیں

۱۔ اِک نُقطہ یار پڑھایا ہے

۲۔ اِک الف پڑھو چھٹکارا ہے

۳۔ عِلموں بس کریں او یار

اِکو الف تیرے درکار

دُنیا کے تمام فُقرا اِس ایک الف کے عمل کو ہر قسم کے علم سے افضل مانتے ہیں۔ اِس عمل سے علم لدُنی (سہج گیان) کے بے پناہ خزانے کُھل جاتے ہیں۔ اِس علم میں ایک 'الف' (احد یا رب) اور 'م' (مُرشد) کے علاوہ دُوسری کِسی شے کی ضرورت نہیں۔ ؎

بُلھا نہ رافضی نہ ہے سُنّی، عالِم فاضل نہ عالِم جُبتی

اِکو پڑھیا عِلم لدُنی، واحد الف میم درکار

سوامی شِو دیال سنگھ نے علم (وِدیا) اور شغلِ سُلطان الاذکار (سُرت شبد یوگ) کا ایک دوسرے سے جو مقابلہ کیا ہے جو قابلِ غور ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رُوحانیت میں دُنیاوی علم

؎ سیّد بشیر مُحمّد کی تصنیف "مکتوباتِ عشق" میں مراقبہ (سمادھی) کی حالت میں حاصل ہونے والے سہج گیان کو علمِ لدُنی کہا گیا ہے، جو لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سیکھنے کا علم نہیں۔ اس کا ایک نُقطہ دُنیا بھر کی تمام جہالت دُور کرنے کے لئے کافی ہے۔ علمِ لدُنی خُدائی رحمت کا خزانہ ہے، جو مُرشدِ کامل سے حاصل ہوتا ہے۔

علمِ لدُنی جوہر ذاتی تے نُقطہ تحقیقی

علمِ لدُنی خاص حیاتی تے ورثہ تصدیقی

عِلم لدُنی پاک حرفوں تے الفاظ بیانوں

عِلم لدُنی صاف حرفوں تے آواز بیانوں

عِلم لدُنی دا اِک نُقطہ کشف رت جہل تمامی

عِلم لدُنی دا ڈھنگ پُختہ ہور سراسر خامی

عِلم لدُنی درس لطائف مُرشدِ پاک پڑھاوے

عِلم لدُنی سبق محبت کامل پیر سکھاوے

جہالت کے برابر ہے۔ روحانی علم میں کامیابی کے لئے خدا اور اُس کے کلمہ کے عشق کے بغیر علم ذلیل و خوار کرتا ہے۔

ہے وِدیا تو بڑی اَوِدیا ۔ سنتن کی مَیں قار نہ جانی
اُن کی پریم انھوی بانی ۔ تو دُھی سنگ رہت کھپانی
بانی بن میں رہے بھلانے ۔ پڑھ پڑھ پوتھی جنم بتانی
باہر مُکھی گرنتھ نت پڑھتے ۔ گھٹ کی پوتھی پڑھیں نہ پڑھانی
سنت گگن میں سُرت چڑھاویں ۔ وے سُنتے نت وہاں کی بانی
سنت نہ وِدیا پڑھتے کوئی ۔ اُن کے انبھو سُمند سمانی
سب پر کار پریم کی مہما ۔ وِدیا اَوِدیا دونوں ہانی
جن کا پریم شبد میں ناہیں ۔ اُن کو وِدیا خوار کرانی (سار بچن، صفحہ ۲۰۹-۲۱۰)[1]

اس بارے میں مولانا رُوم فرماتے ہیں کہ جو علم دُنیاوی ہے، وُہ ایک سانپ کی مانند ہے، اور جو علم باطنی ہے، وُہ ایک دوست کی طرح ہے:

علم چوں بر تن زند مارے شود ۔ علم چوں بر دِل زند یارے شود

ایک صُوفی درویش کہتا ہے: اپنے دِل کا قرآن پڑھ، اِس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں:
"در مصحفِ دِل بیں کہ کتاب بہ ازیں نیست"۔ دادُو صاحب لکھتے ہیں کہ لوگ سُنی سنائی باتیں کرتے ہیں، لیکن میں دیکھی ہُوئی بات کہتا ہُوں: "دادُو دیکھا دیدہ، سب کوئی کہت شُنیدہ"۔

دُنیا کی پاک مذہبی کتابیں دُنیاوی عالموں کی نہیں بلکہ اپنے باطن میں رسائی حاصل کر کے حق کا رُوبرو دیدار کرنے والے کامل فقیروں کی تصنیفات ہیں۔ یہ مذہبی کتابیں باطن میں ہُوئے اُن کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔

---

[1] اس شبد کی اہم سطروں میں سے صرف آٹھ سطریں یہاں دی گئی ہیں۔

حضرت سُلطان باہُو کہتے ہیں کہ چودہ طبق، قرآن شریف اور دیگر تمام مذہبی کتابیں کلمہ سے نکلی ہیں، جو لکھنے پڑھنے یا بولنے کا مضمون نہیں ہے ۔

الِف اَندر کلمہ کل کل کردا، عشق سِکھ یا کلمہ ہُو
چودا ں طبق کلمے دے اَندر، قرآن کتاباں عِلماں ہُو

آپ عُلمأ اور ربّ کے سچے عاشقوں کا مقابلہ کرتے ہُوئے کہتے ہیں ۔

پڑھ پڑھ عِلم ہزار کتاباں عالم ہوئے سارے ہُو
اِک حرف عشق دا نہ پڑھ جانن بُھلے پھرن بچارے ہُو
اِک نگاہ جے عاشق ویکھے لکھ ہزاراں تارے ہُو
لکھ نگاہ جے عالِم ویکھے کِسے نہ کندھی چاہڑے ہُو
عِشق عقل[1] وِچ منزل بھاری سیاں کوہاں دے پاڑے ہُو
عِشق نہ جنہاں خریدیا باہو، دو ہیں جہانی مارے ہُو

ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہمارا اصل فرض شروع ہوتا ہے ختم نہیں۔ حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں :۔ عقل کہتی ہے کہ چھ سمتیں ہیں اور اُن کے باہر کوئی راہ نہیں۔ عشق کہتا ہے کہ راہ ہے۔ اور میں اُس پر کئی بار گیا ہُوں - یہاں آپ کا اشارہ اندرونی رُوحانی راستہ سے ہے :۔ ۔

عقل گوید شش حدست وہیچ بیروں راہ نیست
عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا۔

سائیں بُلھے شاہ نے کامِل مُرشد سے یہی ایک سبق سیکھا جس سے رُوح دریائے وحدت کی تیراک ہوگئی ۔

جد میں سبق عِشق دا پڑھیا، دریا ویکھ وحدت دا وڑیا
گھمن گھیراں دے وِچ اڑیا، شاہ عنایت لایا پار

---

[1] ایک جگہ اِس مِصرعے کو یُوں بھی لکھا ہے ۔
عِشق شرع وِچ منزل بھاری سیاں کوہاں دے پاڑے ہو

ظاہری علم کے بارے میں مندرجہ بالا تشریح سے یہ رائے قائم نہیں کر لینی چاہیئے کہ مُرشدِ کامل مذہبی کتابوں کے مُطالعہ کے خلاف ہیں۔ فقرائے کامل نے خُود زندگی کے کئی کئی سال صَرف کر کے ہمارے فائدے کیلئے روحانی کتابیں لکھی ہیں۔ اَور ان کتابوں میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ ہمارا چھٹکارہ کتابوں کے مُطالعہ سے نہیں، خُدا کی عِبادت، عِشق اَور کلمہ کی کمائی سے ہی ہو سکتا ہے۔ ایک لمبی تاریک سُرنگ میں بیٹھا انسان بے شک تمام عُمر سُورج کی رَوشنی کی صفات کی تعریف کرتا ہے اُسے اس (روشنی) کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اصلی فائدہ سُرنگ سے باہر نکل کر سُورج کی رَوشنی میں آنے سے حاصل ہو گا۔ رَب کی ہستی پر یقین کر کے تمام عُمر مذہبی کتابوں میں اس کی صِفات پڑھتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رَب میں ایمان لانے اَور کتابوں میں اُسکی صفات پڑھنے کا اصل فائدہ رَب کے ساتھ وصال کر کے ہی ہو سکتا ہے۔

تحقیقی نظریئے سے شک وشُبہات دُور کرنے اَور رُوحانیت کے بارے میں فلسفانہ واقفیت حاصل کرنے کے مقصد سے مذہبی کتابوں کی بہت اہمیت ہے، لیکن اِس طرح حاصل کئے گئے عِلم کا فائدہ تبھی ہے، جب اِس عِلم کے بموُجب اپنی زندگی کو ڈھال لیں۔ اَور جس حقیقت کا اِن میں ذکر ہے، اُس کا عملی طور پر تجربہ کر لیں۔

مذہبی کتابوں کا مُطالعہ اَور رُوحانی اصُولوں کا عِلم ہماری کھوج کا آغاز ہے، انجام نہیں۔ سائنس کے اصُول تجربات میں ڈھل کر ثبوُت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اِسی طرح کامل فقیروں نے اِس بات پر زور دیا ہے، کہ مذہبی کتابوں میں دیا ہوا عِلم مُتلاشیانِ حق کا مشاہدہ ہے۔ لیکن ہمارے لئے محض فلسفہ ہے۔ اِس فلسفہ کو رُوحانی عمل کے ذریعے اپنے لئے صحیح ثابت کرنا ہی ہمارا اصل مقصد ہے۔

شریعت اور روحانیت

عشق حقیقی نے مُٹھی کُڑے ، مینُوں دَسو پیا دا دیس
ماپیاں دے گھر بال ایانی ، پریت لگا کے لُٹی کُڑے
منطق معنے کنز قدُوری ، مَیں پڑھ پڑھ علم وِگُتی کُڑے
نماز روزہ اوہناں کیہہ کرنا ، جنہاں پریم صُراحی لُٹی کُڑے
بُلھا شوہ دی مجلس بہہ کے ، سب کرنی میری چُھٹی کُڑے

سچی رُوحانیت کے لاتعصب کھوجی کیلئے ضروری ہے کہ وُہ اپنے مذہبی یا سماجی عقیدوں کی زنجیروں سے آزاد ہوکر کامل فقیروں کے روحانی مشاہدات پر کُھلے دِل سے غور کرے، تاکہ اُسے حقیقت کی تہہ تک پہنچنے میں مُشکل پیش نہ آئے۔

دُنیا میں بہت سی شریعتیں رائج ہیں۔ ہر ایک مذہب اپنی شریعت کو اعلیٰ مانتا ہے لیکن کامل فقیروں کی نظر میں یہ سب یکساں ہیں۔ حضرت جُنید کہتے ہیں کہ خُدا کی رحمت سے توحید کی منزل پر پہنچ چُکا عارف زمین کی طرح ہوتا ہے، جس پر نیک و بد سبھی چل سکتے ہیں۔ وُہ اُن بادلوں کی طرح ہے جو سب کو ایک جیسا سایہ دیتے ہیں۔ وُہ اس ابر کی مانند ہے، جو بلا امتیاز سب پر ایک جیسا برستا ہے۔[1] خُدا ربّ العالمین ہے۔ وہ کُل عالم کے لئے یکساں ہے۔ ربّ کی صُورت اختیار کر چُکے کامل فقیر بھی ساری مخلوق کے یکساں ہمدرد ہوتے ہیں۔ اِسی لئے وُہ کسی خاص مذہب و ملت سے بندھے نہیں ہوتے۔

فقیرِ کامل رَبّ کے ساتھ وِصال کے صحیح راستہ کی تائید اور غلط راستہ کی تردید کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، تاکہ لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوکر کہیں انسانی جسم کے بیش قیمت موقع بفضول

---

[1] دلیل بازی [2] اسلامی فقہ کی کتاب۔

History of Sufism in India. Vol. I, pp. 56-57.

نہ گنوا دیں۔ وہ لوگ عوام کی بھلائی کی خاطر طرح طرح کی اذیتیں برداشت کر کے بھی سچ کی مشعل روشن رکھتے ہیں۔ سائیں جی دنیا کی تنگ دلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ سچ کو ظاہر کرنے والے فقیروں کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ لیکن فقیر لوگ اشارتاً یا اصطلاحاً حقیقت کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تاکہ حقیقت کے کھوجیوں کو اس کا اشارہ مل جائے۔

۱۔ جھوٹ آکھاں تاں کجھ بچدا اے، سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے
جی دوہاں گلاں توں جچدا اے، جچ جچ کے جیبھا کہندی اے
مُنہ آئی بات نہ رہندی اے

۲۔ جے ظاہر کراں اسرار[۱] تائیں، سب بھل جاون تکرار[۲] تائیں
پھر مارن بلھے یار تائیں، ایتھے مخفی[۳] بات سہیندی اے

ان خیالات کے باوجود سائیں جی نے شریعت کی سخت مذمت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

بھٹھ نمازاں چکڑ روزے کلمے تے پھر گئی سیاہی
بلھے نوں شوہ اندروں ملیا بھلی پھرے لوکائی

شریعت اور حقیقت دونوں کو مکمل طور پر جاننے والے عارف کے ذریعے کی گئی نکتہ چینی کو لمحہ بھر کے لئے ایک طرف رکھ کر یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم سب خدا کو پانے کے لئے ہی ساری عمر مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں وغیرہ میں پوجا، پاٹھ، دعا، ارداس، آرتی کرتے اور نماز گزارتے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لئے ہی ہم تیرتھ یاترا یا حج کرتے ہیں۔ روزے، فاقے رکھتے ہیں، اور دیگر کئی قسم کے جپ تپ۔ پن دان، گرنتھوں شاستروں کے پاٹھ اور ہٹھ کرم کرتے ہیں کیا ہمیں یہ سب کچھ کرنے کے باوجود کبھی نورِ الٰہی کی ایک شعاع بھی نظر آئی ہے یا ہماری روح اندر کی طرف سمٹی ہے؟ برعکس اس کے سائیں جی کہتے ہیں: "بلھے شاہ! شوہ اندروں ملیا۔" آپ حقیقت کے سچے عاشقوں کو سمجھاتے ہیں کہ خدا بھی اندر ہے اور اس سے ملنے کا راستہ بھی

۱۔ راز ۲۔ جھگڑے ۳۔ خفیہ۔ در پردہ یا اشارے سے کہی گئی بات۔

اندر ہی ہے۔ لیکن یہ راستہ یا ذریعہ مذہب کی ہر طرح کی شریعت سے بالاتر ہے۔ آپ پُوچھتے ہیں کہ جب تک دِل صاف نہیں ہوتا اور رُوح کا اللہ سے وصال نہیں ہوتا، ہماری دکھاوے کی مذہبی زندگی کا کیا فائدہ؟ ؎

عُمر گوائی وِچ مسیتی، اندر بھریا نال پلیتی
کدے نماز توحید نہ کیتی، ہُن کرنا ایں شور پُکار
عشق دی نویوں نویں بہار

جب کوئی حقیقت شناس ہماری دیرینہ کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو اس کا ہمارے اندر ایک زبردست ردِ عمل (Reaction) ہوتا ہے۔ ہم خودی کے تابع ہوتے ہُوئے یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ ہم دراصل سالہا سال تک غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ خودی اَور لاعلمی کے سبب ہی ہم ایک عارف کی صحیح بات کو بھی غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برعکس اِس کے جو لوگ عارف کی حقیقت بیانی کا وار برداشت کرکے عقل و دانش سے کام لیتے ہیں، اُن کے اندر غلطی کا احساس پچھتاوے میں اَور پچھتاوا حقیقت کو اپنانے کی دلبری میں بدل جاتا ہے۔ اِس طرح وہ لوگ اندھیرے سے روشنی میں پہنچ جاتے ہیں۔

کامل فقیر اَور سچے عارف اُس ڈاکٹر کی مانند ہیں، جو اِنسان کے دِل پر اُبھرے لاعلمی کے ناسُور پر نشتر لگانے کے لئے مجبُور ہوتا ہے۔ جو لوگ اِس نشتر کی تکلیف برداشت کر لیتے ہیں، اُن کے اندر سے گندہ مواد نکل جاتا ہے۔ اِس کے بعد مُرشد زخم پر عشقِ الٰہی کا مرہم لگا کر مریض کو ہمیشہ کے لئے شفا بخش دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف صُوفی فقیروں نے ہی نہیں، بلکہ سنت نام دیو، کبیر صاحب، گورُو نانک صاحب، داؤد صاحب، ملیٹو صاحب، تلسی صاحب، اَور دیگر کئی سنتوں نے دُنیا کی مُختلف شریعتوں پر یکساں نکتہ چینی کی ہے۔

اِن تمام سنتوں کی طرح سائیں جی کی شریعت پر کی گئی نکتہ چینی کا اصل مقصد بھی محض مخالفت نہیں۔ اِس نکتہ چینی کا اصل مقصد مخلوق کا روحانی فیض ہے۔ سائیں جی فرماتے ہیں کہ رب کے سچے عاشق جو تھے پد یعنی مقامِ حق کا راز عیاں کرتے ہیں: "گل چوتھے پد دی کھولے ہیں"۔ اُن

کے باطن سے حقیقت کی خوشبُو بے اختیار باہر نکلتی ہے۔ ناسمجھ لوگ اُن کی اُونچی رُوحانی کیفیت کو تو سمجھ نہیں سکتے، البتہ اُن کی جان کے دشمن ضرور بن جاتے ہیں۔" سچ کہیئے تاں گل پیندے نی۔ جاہل کی بڑی نشانی یہ ہے کہ وُہ عارف کو جاہل سمجھتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ عارفوں کی بات سُن کر سچے عاشقوں کے دِل پھُول کی مانند کھِل اُٹھتے ہیں، لیکن روحانی اسرار سے بے بہرہ اور شریعت کے قیدی لوگ عارفوں کی مخالفت کرنے کے لئے میدان میں کُود پڑتے ہیں ۔

چُپ کر کے کریں گُزارے نُوں
سچ سُن کے لوک نہ سہندے نی، سچ کہیئے تاں گل پیندے نی
پھر سچے پاس نہ بہندے نی۔ سچ مِٹھا عاشق پیارے نُوں
سچ شرع کرے بربادی اے، سچ عاشق دے گھر شادی اے
سچ کردا نوِیں آبادی اے، جہا شرع طریقت ہارے نُوں
چُپ عاشق توں نہ ہُندی اے، جس آئی سچ سُگندھی اے
جس مال سُہاگ دی گُندی اے، چھڈ دُنیا کُوڑ پسارے نُوں
بُلھا شاہ سچ ہُن بولے ہیں، سچ شرع طریقت پھولے ہیں
گل چوتھے پَد دی کھولے ہیں، جہا شرع طریقت ہارے نُوں
چُپ کر کے کریں گُزارے نُوں

لے چوتھا پد یعنی مقامِ حق، فقرائے کامل کی سب سے اُونچی روحانی منزل کا نام ہے۔ جہاں رُوح خدا میں سما جاتی ہے۔ سنتوں نے تین گُنوں کی رچنا کو بھرموں کی وادی کہا ہے اور چوتھے پد کو خالص حق کا مقام کہا ہے۔ سائیں جی تین گنوں کی رچنا کو جھوٹ کا پسارا کہتے ہیں: "چھڈ دُنیا کوڑ پسارے نُوں" اور چوتھے پد کو حقیقت کی وادی کہتے ہیں۔ گورو امرداس جی کہتے ہیں کہ تینوں گُن بھرموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سہج اوستھا سنگورُو کی رحمت سے چوتھے پد میں جا کر ملتی ہے ۔

ترَیہ گُناں وِچ سہج نہ پائیے ترَے گُن بھرم بھُلائے
پڑھیئے گُنیئے کیا کتھیئے جا مُنڈھو گھُتھا جائے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بُلھے شاہ کہتے ہیں ؎

شریعت ساڈی دائی ہے، طریقت ساڈی مائی ہے
اگوں حق حقیقت آئی ہے، تے معرفتوں کُجھ پایا ہے

آپ کا مطلب ہے کہ ہر انسان کا جنم کسی نہ کسی خاص مذہب و ملت میں ہوتا ہے۔ اسے اُس مذہب کی شریعت ورثہ میں ملتی ہے۔ اِس طرح شریعت جنم دینے والی دائی ہے۔ لیکن رُوحانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان دائی سے مائی (ماں) کی گود میں جائے اور اِس سے آگے بڑھے یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ وُہ سچائی، قناعت اور بُردباری وغیرہ نیک اوصاف اختیار کرے۔ یہ دونوں مرحلے عبور کرنے کے بعد اب طالب دماغی طور پر حقیقت کو سمجھے۔ اِس کے بعد معرفت میں داخل ہونے کے قابل ہوتا ہے آخر میں وُہ ترقی کرتا ہُوا خودی یعنی نفس کو ترک کر کے معرفت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ گورو نانک صاحب نے بھی 'جپ جی' میں پانچ کھنڈوں (رُوحانی طبقات) کا ذکر کیا ہے۔ اِسی طرح صوفی درویشوں نے رُوح کے عرُوج کی پانچ منزلوں یعنی ملکُوت، جبرُوت، لاہُوت، ہُوت الہُوت اور ہُوت کا بیان کرتے ہُوئے رُوح کی طریقت اور حقیقت کے ذریعے معرفت تک رسائی کا اشارہ کیا ہے۔ شریعت راہِ حقیقت میں پہلا قدم ہے۔ اِس کا اصل مقصد مذہب اور عقبیٰ کی طرف رُجحان پیدا کرنا ہے، لیکن معرفت کو پانے کا ذریعہ قلب کی صفائی اور کلمہ کی ریاضت ہی ہے۔

گورو ارجن دیو نے اپنے شبد 'اللہ اگم خدائی بندے' میں سمجھایا ہے کہ مالک کے سچے عاشقوں کی شریعت، مذہب و ملت کے پیروکاروں کی شریعت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مالک کے عاشق سچ کی نماز گزارتے ہیں، اور نفس کے مولانا کو جسم کی مسجد میں کھڑا[1] کر کے باطن میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے جوڑتے ہیں۔ ایسے عاشقوں کی طریقت باطن میں کُل مالک کی تلاش

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)
چوتھے پد ہیں سہج ہے گُورمکھ سے پائے
(محلہ ۳۔ صفحہ ۶۸)

[1] مُرادمن کی یکسُوئیت سے ہے۔

کرنا ہے، اُن کی معرفت نفس اور حواس پر قابو پانا ہے اور حقیقت رَب کے ساتھ وصال کرکے آواگون (تناسخ) کے چکر سے آزاد ہو جانا ہے۔ رحم و کرم ایسے عاشقانِ حقیقی کا مکہ ہے۔ حلیمی اور انکساری روزہ ہے۔ اور مُرشد کا حکم بجالانا اُن کی بہشت ہے۔ رحمانی اوصاف یعنی صبر، شکر، حلیمی، رحم اور نیکی اختیار کرنا اور شیطانی خصلتوں کو ترک کرنا اُن کی پانچ نمازیں ہیں۔

اُن کا اسلام نرم دِلی اور دُنیاوی عشق کی بجائے خُدائی عشق میں جذب ہونا ہے :- ؎

پنج نواز، یقین مُصلّے، منسا مارِ نوارِ سہ آسا
دبہیہ مسیت، مَن مَولانا، کلمہ خُدائی پاک کھرا
شرع شریعت لے کماوہُ، طریقت ترک کھوج ٹولاوہُ
معرفت من مارہُ ابدالا، مِلہہ حقیقت جت پھر نہ مرا
قرآن کتیب دِل ماہیں کماہی، دس عَورات رکھہو بدراہی
پنج مرد صِدق لے باندھہ، خیر صبُوری قبُول پرا
مکہ مہر، روزہ پیچھا کا، بھشت پیر لفظ کمائے اندازہ
حُور نُور مشک خدائیا، بندگی الله اعلیٰ حُجرہ
سچ کماوے سوئی قاضی، جو دِل سودھے سوئی حاجی
سو مُلّا ملغون نوارے، سو درویش جس صفت دھرا

۱؎ شہوت (کام)، غصّہ (کرودھ)، حرص و ہوس (لوبھ)، تعلقاتِ دُنیوی (موہ) اور غرور و تکبر (اہنکار)۔

۲؎ دسوں حواس پر قابو پانا دراصل قرآن شریف کی تعلیم پر عمل کرنا ہے۔

۳؎ پانچ علتوں کو دُور کرکے اپنے اندر نیک اوصاف پیدا کرو۔

۴؎ باطن میں الٰہی نُور کا حاصل ہونا حُوروں کے ملنے سے بہتر ہے۔ اور باطن میں بندگی کرنا ہی اعلیٰ مسجد میں جانا ہے۔

۵؎ اصل طور پر مولانا وہی ہے جو شیطان یا نفس کو فنا کرتا ہے اور درویش وہ ہے جو عاجزی اختیار کرتا ہے۔

تیجے وکھت سبھے کرویلا، خالق یاد دِنے مہہ موئے
تسبیح یاد کرو دس مَردن، سُنت سِیل بندھان برا

اوّل صفت دوجی صابوری، تیجے حلیمی چوتھے خیری
پنجویں پنجے اِکت مقامے، ایہہ پنج وکھت تیرے اپرپرا

حق حلال بخورہ کھاتا، دِل دریاؤ دھووہ میلانا
پیر پچھانے بھشتی سوئی، عزرائیل نہ دوزخ ٹھڑا

مسلمان موم دِل ہووے، انتر کی مَل دل تے دھووے
دُنیا رنگ نہ آوے نیڑے، جیوں کُسم پاٹ گھیئو پاک ہرا

قُدرت قادر کرن کریما، صفت محبت اتھاہ رحیما
حق حکم سچ خدایا، بجھ نانک بند خلاص تُرا

(محلہ ۵، صفحہ ۱۰۸۳)

نامور صوفی شیخ گزدوانی سچے صوفی عابد کے لئے جو ہدایتیں درج کرتے ہیں ان میں تمام زندگی کو ایسی سخت ریاضت کے تابع کیا گیا ہے کہ دُنیا کی سخت سے سخت شریعت کا رنگ بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ یہ ہدایتیں اِس طرح ہیں :-

۱۔ ہوش در دم : ہر سانس رَب کی حضوری کے احساس سے لینا۔

۲۔ نظر بر قدم : ہر قدم رَب کی حضوری کے احساس سے اُٹھانا۔

۳۔ سفر در وطن : ہمیشہ اپنے اصل گھر لوٹنے کا خیال ذہن میں رکھنا۔

ؔ خدا کی یاد سچی تسبیح ہے۔ دسوں حواس مار کر جیتی ہو جانا ہی سچی سُنت ہے۔

ؔ جس طرح پھول، ریشم، گھی اور مرگ چھالا (ہرن کی کھال) کبھی ناپاک نہیں ہوتے، سچا مسلمان وہ ہے جو دِل کو دُنیا کی پلیدگی سے ہمیشہ بچا کر رکھے۔

۴ - خلوت درانجمن :- دُنیا میں رہتے ہُوئے بھی دِل سے تنہا رہنا اور ہمیشہ ذکرِ خدا میں مشغول رہنا۔

۵ - یاد کردن:- زبان یا رُوح کی زبان سے ہمیشہ (خدا کا) ذکر کرتے رہنا۔

۶- بازگشتن:- نفس کو بھلے بُرے خیالات سے پاک رکھتے ہُوئے ذکرِ خدا میں مشغول رہنا۔

۷- نگاہ داشتن:- بُرے خیالات کو دِل میں داخل ہونے سے روکنا۔

۸- یادداشتن:- ہمیشہ رَبّ کی حضوری میں ہونے کا زندہ احساس ہونا۔[1]

برعکس اس کے مذہبی پیشہ ور اور خُود غرض لوگ جن کی روزی مذہبی رسُومات کے عمل پر منحصر ہے۔ معصُوم وسادہ لوح لوگوں کو طرح طرح کے توہمات میں پھنسا کر سچّی رُوحانیت سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ سائیں جی کے کلام اور صُوفی ادب میں آپ کی کافی "گل رَولے لوکاں پائی اے" خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ ؎

گل رَولے لوکاں پائی اے

سچ آکھ مناں کیوں ڈرنا ایں، اِس سچ پچھے توں ترنا ایں
سچ سدا آبادی کرنا ایں، سچ وست اچنبھا آئی اے
باہمن آن جھمان ڈرائے، پتر پیڑ دس بھرم دوڑائے
آپے دَس کے جتن کرائے، پُوجا شروع کرائی اے
پتر نساں دے اُتر پیڑا، گڑ چاول منگاؤ لیڑا
جنجُو پاؤ لاہو بیڑا، چھلی تُرت کوائی اے
پیڑ نہیں آویں نکلن لگی۔ روک روپیہ بھانڈے ڈھگی
ہووے لاکھی دُرست نہ بگی، مُلّھا ایہہ بات بنائی اے
پرتھم جنڈی مات مبنائی۔ جس نوں پُوجے سرب لوکائی
پا چھپے وڈھ کے جنج چڑھائی، ڈولی ٹھم ٹھم آئی اے

[1] History of Sufism in India, Vol. I, pp. 95—96.

بھُل تُھدا نُوں جان کھوائی، بُتاں آگے سیس نوائی
جیہڑے گھڑ کے آپ بنائی. بُترم رنا نہ آئی اے

دیکھو تُلسی مات بنائی، سالگ رامی سنگ پرنائی
ہس ہس ڈولی چا چڑھائی. سالا سوہرا بنے جوائی اے

دھیاں بھیناں سب وِیاہون. پردے آپنے آپ کجاون
بُلھا شاہ کی آکھن آون، نہ مانا کِسے وِیاہی اے

شاہ رگ بِھیں رب وِسدا نیڑے، لوکاں پائے لمیں جھیڑے
وال کے جھگڑے کون نبیڑے. بُھج بُھج عمر گوائی اے

بِرچھ باغ وِچ نہیں جُدائی، بندہ رب تیوِیں بن آئی
پِچھلے سونے تے کھِڑ آئی. دُبدھا آن مِٹائی اے

بُلھا آپے بھُل بھُلایا، آپے چلیاں وِچ دبایا
آپے ہوکا دے سُنایا، مجھ میں بھیت نہ کائی اے

گرم سرد ہو جِس نُوں پالا، حرکت کیتا چہرہ کالا
تِس نُوں آکھن جی سکھالا. اِس دی کرو دوائی اے

اکھیاں پکیاں آکھن آئیاں. اَسی سُکھ کے آؤن مائیاں
آپے بھُل گیئاں ہن سائیاں، ہُن تیرتھ پاس سُدھائی اے

پستی آکھے ملے اَنیم، بندہ بھالے فادر کریم
نہ کوئی دِسے گیان حکیم. عقل تُساڈی جائی اے

جو کوئی دِسدا اوہو پیارا، بُلھا آپے ویکھن ہارا
آپے بیدق آن پکارا، جو سُفنے وست بھلائی اے

اِس کافی میں آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کو سچ کڑوا تو لگے گا، لیکن سچ ہی بارگاہِ الٰہی میں مقبول اور پیارا ہے۔ اِس لئے میں سچی بات کہہ دیتا ہوں۔

آپ کہتے ہیں، کہ برہمن لوگوں کے دِل میں ڈر پَیدا کرتے ہیں کہ تمہارے مرحوم بزرگوں (پتروں) کے سر پر مشکل بنی ہُوئی ہے۔ اِس طرح وُہ اُن کو طرح طرح کی پُوجا میں لگا کر گڑ۔ چاول، کپڑا، لتا، مال و اسباب، برتن، گائے، روپیہ پیسہ دان (زکوٰۃ) میں لے جاتے ہیں۔ اِسی طرح وُہ بھولے بھالے لوگوں کے دِل میں بھرم پَیدا کر دیتے ہیں کہ جب تک پُوجا پاٹھ نہ کرواؤ گے تمہاری گائیں بھینسیں، گھوڑے گھوڑیاں راضی نہ ہوں گی۔ یہ پنڈت یا پروہت بھولے بھالے لوگوں کو خُدا کی سچی عبادت سے ہٹا کر انسانی ہاتھوں سے تراشے گئے بُتوں کی پُوجا میں لگا دیتے ہیں۔ یہ تُلسی ماتا کی سالگرام کے ساتھ شادی رچاتے ہیں۔ کوئی بھی انسان یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ کبھی بیٹے بھی ماتا کی شادی کر سکتے ہیں؟

اگر کوئی گرم سرد ہو جائے یا کِسی کو بُخار آ جائے تو کہتے ہیں۔ اِس کا "جی سُکھالا" کرواؤ۔ آنکھوں کی بیماری ہو جائے تو کئی مَنتیں مانی جاتی ہیں، غلطیاں بخشوائی جاتی ہیں اور تیرتھوں کی یاترا کروائی جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ لوگ وہموں بھرموں کا شِکار ہو چکے ہیں کیونکہ دُنیا میں سچے گیان اور سچے گیانیوں کی کمی ہے۔

لوگ خُدا کی تلاش میں باہر بھٹک رہے ہیں، جبکہ وُہ محبُوبِ حقیقی ہر انسان کے اَندر شہ رَگ کے نزدیک موجُود ہے۔ اِنسان اور خُدا کے مابین پیڑا اور رابغ والا قدرتی رِشتہ ہے۔ اور اِنسان بھرموں کو ختم کر کے اپنے اندر ہی خُدا سے وِصال کر سکتا ہے۔

سائیں جی کے یہ خیالات ہر مذہب کے ٹھیکیداروں مثلاً پروہتوں، مُلّاؤں اور پادریوں کی نسبت صحیح معلوم ہوتے ہیں، جو اپنے پیٹ کی خاطر بھولے بھالے لوگوں کو طرح طرح کی رسُومات میں پھنسا کر سچی روحانیت سے محروم رکھتے ہیں۔ ہر مذہب میں ایسے لوگ پَیدا ہو جاتے ہیں، جو اپنے سماجی، مالی اور دیگر کئی دُنیاوی مفاد کے لئے وہموں بھرموں کے طرح طرح کے جال بُن دیتے ہیں۔ وُہ اپنے ذاتی فائدوں کے لئے لوگوں میں نفرت کی خلیج پَیدا کرنے والی اور آپسی ٹکراؤ کو بڑھاوا دینے والی شریعتیں رائج کرتے ہیں۔ یہی لوگ خود غرضی کے لئے لوگوں کو سچے پیروں، فقیروں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اگر گورُو نانک گمراہ کرنے والا (گُراہیا) تھا، تو صحیح راہ پر چلنے والا کون ہے؟ اگر

حضرت عیسیٰ ، گورو ارجن دیو جی ، نام دیو ، کبیر صاحب ، دادُو صاحب اور ملپٹو صاحب مذہب کے دشمن تھے تو دُنیا میں مذہب کا سچا دوست کون ہُوا ہے ؟ ان سب کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ نہ سنتوں، مہاتماؤں سے خطرہ کسی دھرم یا مذہب کو نہیں، بلکہ مذہب کے اِن ٹھیکیداروں کو ہوتا ہے۔ انسانیت کے ساتھ اِس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ مذہب کے صادق خیر خواہوں اور انسانیت کے سچے خیر اندیشوں کو ہی مذہب اور انسانیت کے دُشمن ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اگرچہ الگ الگ مذہبوں کے پجاری ایک دُوسرے مذہب کے دُشمن ہوتے ہیں لیکن پیروں پیغمبروں کی مخالفت کے لئے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں کیونکہ کامل فقیروں کی سچی تعلیم کی وجہ سے اُن کو اپنی روزی، روٹی اور عزت آبرو خطرے میں پڑتی نظر آتی ہے۔

گورو نانک صاحب اپنے شبد "رام نام مَن بیدھیا" میں فرماتے ہیں کہ ہَون یگیہ[1] میں سامگری کی بجائے جسم کو پارہ پارہ کر کے جلا دینے سے بھی قلب کی صفائی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی جسم کو آرے سے چِیروا لینے سے یا ہمالیہ کی برف میں گلا دینے سے دِل پاک ہوتا ہے۔ سونے کے قلعے ہاتھی گھوڑے اور زمین دان کرنے یا مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے بھی نہ تو نفس ہی قابُو میں آتا ہے اور نہ خُدا ہی ملتا ہے۔ خُدا سے ملنے کا ذریعہ اِس طرح کے بیرُونی اعمال نہیں، بلکہ ہر انسان کے اندر گُونجتا ہوا الٰہی کلمہ ہے۔[2]

گورُو صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "آسادی وار" میں ہندوؤں، جینیوں، بودھوں، مُسلمانوں اور جوگیوں کی ہر قسم کی شریعت پر نکتہ چینی کی ہے اور ہر طرح کی شریعت کو کلمہ کی کمائی کے مقابلہ میں ادنےٰ اور بے فائدہ بتایا ہے۔ آپ نے تنتر، منتر، دیو پُوجا، تیرتھ یاترا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، مالا پھیرنا، تِلک لگانا، جنگلوں میں گھُومنا، بھبھوت لگانا، دھونی رمانا، ننگے پھرنا، جگراتے کرنا، خاموشی اختیار کرنا، فاقے رکھنا وغیرہ کو لاحاصل عمل کہا ہے۔

سبھ بھوکٹ نِپھچو کرمنگ

(آسادی وار محلہ ا صفحہ ۴۷۰)

---

[1] ہَون کُنڈ میں جلانے کا سامان۔ [2] محلہ ا، صفحہ ۶۲

سوامی شو دیال سنگھ جی مہاراج نے بھی شرعی رسومات کی سخت مذمت کی ہے :۔ ے

بھیوکت دھرم پکڑ کر جو جھے بُوجھے نہ شبد جگت پارا
پانی متھے ہاتھ کچھ ناہیں کھیسر متھن آلس بھارا (سار بچن نظم صفحہ ۱۱۴)

مطلب :۔ انسان لاحاصل اعمال کی بنا پر کوشش کرتا ہے، اور کلمہ کے شغل سے پار ہونے کی ترکیب نہیں جانتا۔ وہ دُودھ بلونے میں کاہل ہے۔ لیکن پانی کے بلونے میں مشغول رہتا ہے، جس سے کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔

پلٹو صاحب کہتے ہیں کہ باہری فقیرانہ وضع قطع اختیار کرنے والے لوگ خدا کی عبادت سے نہیں بلکہ پیٹ بھرنے کی امید سے خوش ہو کر میزبانوں کی قصیدہ گوئی کرتے ہیں ے

بھر بھر پیٹ کھلائیے۔ تب رتیجیگا بھیکھ
تب رتیجے گا بھیکھ۔ جگت میں کرے بڑائی
لاکھ بھگت جو ہوئے۔ کھائے بن نندت جائی
رہن کہنے نہیں کوئے۔ ناہیں ٹکسار بچارے
بھاؤ بھگتی نہ لکھے۔ کھوجت سب پھرے اہارے
بھیکھ میں نا ہیں بیبیک۔ بجھئے دس بیس ہبیکی
کوٹن میں دس بیس۔ سنت رتن رہنی دیکھی
پلٹو رہے ایان میں۔ آن میں مارے میکھ
بھر بھر پیٹ کھلائیے، تب رتیجے گا بھیکھ

(بھاگ ۱، کُنڈلی ۲۴۳)

سائیں جی کہتے ہیں کہ عبادت گاہوں کو مذہبی پیشہ ور لوگوں نے اپنا پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ جب تک دِل سے سچی دُعا نہیں نکلتی۔ مندروں مسجدوں میں ماتھا رگڑنے سے کیا فائدہ ؟

۱۔ بلھے نوں لوکیں متی دیندے۔ بلھیا جا بہہ وچ مسیتی
وچ مسیتاں دے کی کجھ ہُندا۔ جے دِلوں نماز نہ کیتی
۲۔ دھرم سال دھڑوئی رہندے۔ ٹھاکر دوآرے ٹھگ
وچ مسیتاں کُستی رہندے۔ عاشق رہن الگ

حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا تھا کہ جو لوگ مندروں کو بیوپار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، ان کو مندروں سے باہر نکال دو۔ کیونکہ خدا کا گھر اس کی پرستش کیلئے ہے۔ دکانداری کے لئے نہیں۔[۱]

خواجہ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری اپنی تصنیف "مناجات" میں لکھتے ہیں کہ بیرونی کعبہ تو حضرت ابراہیمؑ نے بنوایا تھا۔ لیکن دل و جان کا کعبہ نورِ الٰہی سے متبرک ہو چکا ہے۔[۲] آپ فرماتے ہیں: روزہ رکھنا اناج کی بچت کرنا ہے۔ بیرونی پوجا اور نماز عورتوں اور بوڑھے لوگوں کا کام ہے۔ حج کرنا دنیا کی سیر و سیاحت میں شامل ہے۔ تو نفس پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کر، کیونکہ اصل فتح یہی ہے۔ صوفی درویش نوشاہ کہتے ہیں: ہماری مسجد وہ نہیں جہاں ملّا رہتا ہے۔ اصل مسجد وہ ہے جہاں رب ملتا ہے۔[۳]

ہم چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھ سکتے ہیں۔ کہ آج ہماری عبادت گاہوں کی کیا حالت ہے۔ یہ عبادت گاہیں مالکِ کُل کی عبادت کے اصل مقصد سے بہت دور جا چکی ہیں۔
حضرت سلطان باہو بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں ؎

نفل نمازاں کم زناں دے۔ روزے صدقہ روٹی ہو
مکے دے وَل سوئی جاون۔ گھر دِل جنہاں ترٹی ہو
اُچیاں بانگاں سوئی دیون۔ نیت جنہاں دی کھوٹی ہو
کی پرواہ تناں نوں باہو۔ جنہاں گھر وچ لدھی بوٹی ہو

---

۱ Cast out them all that sold and bought in the temple, and overthrow the tables of money-changers and the seats of them that sold doves. It is written, My house shall be called the house of prayer, but ye have made it a den of thieves. (Matthew 21 : 12-15)

۲ **History of Sufism in India**, Vol. I: p. 78.

۳ **History of Sufism in India**, Vol. II, p. 440.

نہ رَبّ عرش مُعلّےٰ اُتے ۔ نہ رَبّ خانے کعبے ہُو
نہ رَبّ علم کتاباں لبھا ۔ نہ رَبّ وِچ محرابے ہُو
گنگا تیرتھیں مُول نہ ملیا ۔ مارے پینڈے بے حسابے ہُو
جد دا مُرشد پھڑیا باہو ۔ چُھٹے سب نقاصے ہُو

خواجہ حافظ لکھتے ہیں:۔ تُو کب تک مکّہ کے اِردگرد چکّر لگاتا رہے گا؟ یہ خیالِ خام اپنے دل سے نکال دے۔ اگر تو اپنی ذات کی پہچان کرلے، تو حقیقت خود تیرا حرم بن جائے گی۔

تکاپوئے حرم تا کے خیال از طبع بیروں کُن
کہ محرم گر شوی ذاتت حقائق را حرم گردد

سائیں بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ مُلا اور قاضی وہموں کے جال پھیلا کر دُنیا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ وُہ بیرونی شریعت کو ہی سچی رُوحانیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سچی رُوحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں لیکن اس محبوبِ حقیقی کا سچا عاشق اِس طرح کی خود ساختہ بندشوں میں نہیں بندھ سکتا۔

مُلا قاضی سانوں راہ بتاون دین دھرم دی پھیری
ایہہ تاں ٹھگ جگت دے جھیور، لاون جال چوپھیری
کرم شرع دے دھرم بتاون، سنگل پاون پیریں
ذات مذہب ایہہ عشق نہ پچھدا، عشق شرع دا ویری

مولانا رُوم نے فرمایا ہے کہ رَبّ کے سچے عاشقوں کا ایک ہی مذہب ہے، وُہ ہے اپنے نفس کو فنا کرکے اللہ تعالےٰ میں سما جانا: عاشقاں را مذہب و ملّت خُداست۔

اپنی کافی "اِک نقطے وِچ گل مُکدی اے" میں سائیں بلھے شاہ کہتے ہیں کہ انسان کا اصل مقصد قلب کی صفائی اور خُدا کے نام کی کمائی ہے۔ جب تک قلب کی صفائی نہیں ہوتی، مندرو

لے خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ اپنے معشوق کے لب و جام کے علاوہ اور کسی شے کا بوسہ نہ لو۔ عبادت فروخت کرنے والوں کے ہاتھ کا بوسہ لینا بہت بڑا گناہ ہے ۔

مبوس جز لبِ معشوق و جام مے حافظ ۔ کہ دست زُہد فروشاں خطاست بوسیدن (دیوانِ حافظ صفحہ ۱۸۷ پر)

مسجدوں میں ماتھا رگڑنے اور نماز ادا کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ حیرانی کا اظہار کرتے ہیں کہ لوگ اپنے حج کے ثواب کی قیمت لگا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ لمبے روزے رکھتے ہیں اور جسم کو کئی طرح کی اذیتیں دیتے ہیں۔ وہ خدا کے بندے یہ نہیں سمجھتے کہ خدا کی عبادت کا تعلق نفس اور روح سے ہے، جسم کو عذاب دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ضرورت مرشد کی بتائی ہوئی ترکیب کے بموجب قلب کو ہر طرح کی کثافت سے پاک و صاف کرنے کی ہے۔ ہٹھ کرموں کے ذریعے جسم کو اذیت پہنچانے کی نہیں۔

بلھو صاحب کہتے ہیں کہ اس اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں نہ تو کسی مذہب کی رسائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی شریعت کی۔

وہ دربارا بھارا سادھو، ہندو مسلمان سے نیارا
مکے رہے نہ ٹھاکر دوارہ۔ ہے سچ میں سب کھوجن ہارا
نہیں دوار نہ تیرتھ سنگا۔ گنگا تیر نہ تلسی بھنگا
سالگ رام نہ مسجد کوئی۔ اوہاں جنیئو نہ سنت ہوئی
پڑھے نواج نہ لاوے پوجا۔ پنڈت قاضی بسے نہ دوجا
مانے نہ سور نہ گائی۔ کلمہ بھجن نہ رام خدائی
ایکادسی نہ روزہ کرئی۔ ڈنڈوت کرے نہ سر دا پرئی
بلھو دوئی کی کستی۔ دوزخ نرک بیکنٹھ نہ بھستی

(بھاگ ۳، شبد ۱۰۱)

بقیہ: فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۷ سے آگے — گورونانک صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ لعنت ہے ان کی زندگی پر جو اپنی عبادت فروخت کرتے ہیں جن کی کھیتی ہی اجڑ جائے ان کی فصل کس طرح اکٹھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ان کے لوک اور پرلوک دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

دھرگ تنا کا جیونا جے لکھ لکھ ویچہہ ناؤں
کھیتی جن کی اجڑے کھلواڑے کیا تھاؤں (محلہ ۱، صفحہ ۱۲۴۵)

(باقی اگلے صفحہ پر)

سائیں جی اشارہ کرتے ہیں کہ ہر مذہبی عمل کا بنیادی مقصد محبوبِ حقیقی سے وصال کرنا ہے۔ جب میرا محبوب کے ساتھ ملاپ ہو گیا ہے تو مجھے روزے یا نماز کی کیا ضرورت ہے

روزے حج نماز نی مائے۔ مینوں پیا نے آن بُھلائے

جد پیا دیاں خبراں پیاں۔ منتر[1] تنتر سب بُھل گئیاں

اُس اَنحد تار وجائے[2]

جاں پیا میرے گھر آیا۔ بُھل گیا مینوں شرع وِکایا

ہر[3] مظہر وِچ اُو ہا دِسدا۔ اندر باہر جلوہ جس دا

آپ ایک کافی " مائے نہ مُڑدا عشق دیوانہ۔ شوہ نال پریتاں لا کے " میں شریعت اور عشق کا باہمی تعلق بڑے خوبصورت انداز میں تفصیل سے سمجھاتے ہیں۔ اِس کافی کی اِن سطور " بار تتی گل لاگے "، " وحدت دے وِچ آ کے "، " وصل کراں نال سجن دے " اور " سر دیہی نال مِل گئی سر دیہی " میں آپ اشارہ کرتے ہیں کہ آپ محبوب میں مکمل طور پر سما چکے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ لوگ مجھے کافر کہہ کر آوازے کستے ہیں کہ تیرے اندر شیطان نے گھر کر لیا ہے[4] میری یہ حالت ہے کہ میں نفس کے خاوند اور دوئی کے دشمن دونوں کو مار کر وحدت میں پہنچ گیا ہوں۔ اِس کیفیت میں شریعت بچوں کا کھیل اور نادانوں کا بکھیڑا معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے چولی، چُنی اور بھگا پھونک دیا ہے ——— یعنی میں نے دُنیا کی ہر طرح کی شرم داری اور زاہدوں کی شریعت کو خیر باد کہہ دیا ہے۔

(بقیہ: فٹ نوٹ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

کبیر صاحب نے فرمایا ہے: کبیر کا خاندان ہی ڈوب گیا، کیونکہ اُس کے گھر کمال جیسا بیٹا پیدا ہو گیا ہے جو ہری کے سمرن جیسی لافانی شے کے بدلے سنسار کی فنا دولت گھر لے آیا:

بُوڈا بنس کبیر کا اُپجیو پوُت کمال

ہر کا سمرن چھاڈ کے گھر لے آیا مال (آدگرنتھ، صفحہ ۱۳۷۰)

[1] منتر ٹونے وغیرہ بھول گئے [2] شریعت کی ہوش وحواس نہیں رہی۔

[3] ہر قالب میں اُسی محبوب کا دیدار ہوتا ہے۔

[4] لوگ طعنے دیتے ہیں کہ تیرے اندر شیطان بستا ہے۔ وہ مجھے کافر کہتے ہیں۔

ماٹے نہ مُڑدا عشق دیوانہ، شوہ نال پریتاں لا کے
عشق شرع دی لگ گئی بازی، کھیڑاں میں داؤ لگا کے
مارن بولی تے بولی، نہ بولاں، سُنناں نہ کن لا کے
ویہڑے وِچ شیطان نچیندا، اُس نوں رکھ سمجھا کے
توڑ شرع نوں جت لئی بازی، پھر دی نک وڈھا کے
میں انجانی کھیڈ وِگُتیاں، کھیڈاں میں آ کے با کے
ایہہ کھیڈاں بن تگدیاں جھیڈاں، گھر پیا دے آ کے
سئیاں نال میں پاواں گدھا، دِلبر نک نک جھا کے
پُچھو ایہہ کیوں شرماندا، جاندا نہ بھیت بنا کے
کافر کافر آکھن مینوں، سارے لوک سُنا کے
مومن کافر مینوں دوویں نہ دِسّے، وحدت دے وِچ آ کے
بولی نبی تے بولی کیا بجھگا، ڈھاتی شرک جلا کے
واریا کُفر وڈا ایں دل تھیں، تِل تے سیس لکا کے
میں وڈ بھاگی ماریا خاوند، نہیں زہر پلا کے
وصل کراں میں نال سجن دے، شرم حیا گوا کے
وِچ چمن میں پلنگ وچھایا، یار ستی گل لا کے
سِر ویہی نال لِ گئی دیہی، بلھا شوہ نوں پا کے
ماٹے نہ مُڑدا عشق دیوانہ، شوہ نال پریتاں لا کے

شریعت تصویر کے فریم، گتّے اور شیشے کی طرح تصویر کی حفاظت کے لئے ہے۔ فریم اور شیشہ ہی تصویر نہیں ہے۔ زیورات کا ڈبہ زیورات کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے۔ ڈبہ زیورات کی جگہ نہیں لے سکتا۔ شریعت کی قیمت روحانیت سے ہے۔ معرفت اور حقیقت کے بغیر شریعت خالی

لے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کی عبادت کرنا شرک ہے۔ میں نے شرک کو جلا دیا ہے۔

ڈبے کی طرح ہے ۔ ایک معمولی ڈبے یا ٹوٹے ہوئے ٹین کے ڈبے میں رکھنے سے زیور کی قیمت کم نہیں ہو جاتی، لیکن گھونگوں اور سیپیوں سے بھرا مخمل کا ڈبہ بھی کسی کام کا نہیں ۔

چھلکا پھل کے گودے اور رس کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے۔ پھل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شریعت صرف اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک یہ حقیقت کو پانے میں مدد دیتی ہے۔ یہ حقیقت کا بدل نہیں ہو سکتی ۔ جہاں رب اور مرشد کا عشق یا کلمہ کا عشق نہیں، وہاں لطیفت سے لطیفت شریعت ناکارہ ہے۔ لیکن جہاں قلب کی صفائی ہے، خدا مرشد اور کلمہ کا پیار ہے۔ وہاں شریعت قابلِ قبول ہو سکتی ہے ۔ مگر کلمہ کے شغل کے بغیر اس کی کوئی وقعت نہیں۔ سائیں جی اسی خیال کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ حقیقت میں پہنچ چکا انسان شرع کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ اُسے عملی تجربہ ہو جاتا ہے کہ درگاہ میں لے جانے والی شئے رب ۔ مرشد اور کلمہ کا عشق ہے ۔ شرع نہیں۔ وہ حقیقت کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی کسی شے کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۱۔ بلھیا سب مجازی پوڑیاں ۔ توں حال حقیقت ویکھ
جو کوئی اوتھے پہنچیا چاہے ۔ بُھل جائے سلام علیک

۲۔ نی میں سُن سُنیا ۔ ۔ عشق شرع کی ناتا
محبت دا اک پیالہ پی ۔ بُھل جاون سب باتا
گھر گھر سائیں ہے اوہ سائیں ہر ہر نال پچھاتا
اندر ساڈے مرشد وسدا ۔ نیہوں لگا تاں جاتا
منطق[1] معنے کنز قدوری ۔ پڑھیا علم گواتا
نماز[2] روزہ اُس کی کرنا ۔ جس مدھ پیتا مدھماتا

---

[1] منطق = علم دلیل ۔ نطق = وہ علم جو عقلی دلائل سے حق کو حق اور ناحق کو ناحق ثابت کر دیتا ہے ۔ معنے = مذہبی کتابوں کے مشکل عقائد کے مطالب اور تشریح ۔ کنز = علم کا خزانہ ۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

پڑھ پڑھ پنڈت مُلّاں ہارے، کِسے نہ بھید پچھاتا
زری[1] بافری قدر نہ جانے، جھّٹ اونہاں جت کاتا
بُلھا[2] شوہ دی مجلس بہہ کے، ہو گیا گُنگا باتا[3]
نی میں ہُن سُنیا، عشق شرع کی ناتا

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ ۔ پچھلے صفحہ سے آگے)

قدوری = علمأ کا اکٹھے ہو کر اسلام کے مذہبی مسائل کو عقل، حدیث اور قیاس کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرنا۔

[۲] مدھ = شراب۔ مدھماتا = مست شرابی۔ جس نے حقیقت کی شراب پی لی، وُہ اُس کی مستی میں کھو کر شریعت سے بے نیاز ہو گیا۔

[۱] زری = سُنہری تاروں سے بُنا قیمتی کپڑا۔ بافری = ریشمی کپڑا۔
جت کاتا = جنہوں نے بُنا۔ جنہوں نے موٹے، کھُردرے کپڑے بُنے ہوں۔ اُن کو زری بافری کی قدر کیا ہو سکتی ہے۔
[۲] رب کے ساتھ ملاپ ہوا تو زبان بند ہو گئی۔ اِس کیفیت کو سنتوں، مہاتماؤں نے گونگے کا گڑ کہہ کر بیان کیا ہے۔ کیونکہ وُہ کیفیت لابیان ہے۔

لُبّ لُباب

ہم نے سائیں بُلھے شاہ کا کلام دیگر کامِل پیروں فقیروں کے کلام کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ تمام قوموں، مذہبوں، ملکوں، وقتوں میں ہوئے کامِل فقیروں کی ایک رائے ہے، گو سنتوں اور فقیروں کی بولی اور محاورہ جُدا جُدا ہے، لیکن جس لافانی حقیقت کا وہ بیان کرتے ہیں وہ ایک ہی ہے۔

یہ بات سمجھنی مشکل نہیں کہ جس طرح ایک چیز کو انگریزی، فرانسیسی، چینی، روسی اور جرمن وغیرہ زبانوں میں الگ الگ نام دیئے جاتے ہیں، اسی طرح ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی، یہودی، چینی اور یونانی کامِل فقیروں نے ایک ہی روحانی حقیقت کو اپنی اپنی زبان میں الگ الگ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ خُدا، خدا کی تخلیقی طاقت اور دُنیا سے نجات دلانے والی قوت کو پیروں فقیروں نے کلمہ یا کلام، نام، شبد، سروش، میرا، ناؤ وغیرہ کئی ناموں سے پکارا ہے۔ ضرورت زبان کا چھلکا اُتار کر حقیقت کے مغز تک پہنچنے کی ہے۔

مرکزی بجلی گھر، شاخائی بجلی گھروں اور چھوٹے سے بلب میں کام کر رہی بجلی کی طاقت ایک ہی ہے، اگرچہ اُس کے کام کرنے کی سطح اور صورتیں الگ الگ ہیں۔ اُسی طرح خدا، مُرشد اور رُوح میں کام کرنے والی طاقت ایک ہی ہے، مگر اس کے کارگر ہونے کی سطح اور صورت جُدا جُدا ہے۔ جس طرح سمندر، لہر اور قطرہ کا اصل ایک ہے، اسی طرح خدا، مُرشد اور رُوح کی حقیقت ایک ہے۔ اِس یکسانیت کے سبب ہی بوند (رُوح)، لہر (مُرشد) میں جذب ہو کر سمندر (خدا) میں سما سکتی ہے۔

شہر میں پھیلے ہوئے بجلی کے وسیع جال اور گھر میں لگی بجلی سے ہم تب ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اگر ہمارے ریڈیو، پنکھے یا بلب کی تار بجلی گھر سے آ رہی تار کے ساتھ جُڑی ہو۔ اِسی طرح

خدا کائنات کے ذرّے ذرّے میں اور جسم کے ریشے ریشے میں موجود ہے، مگر اس سے خاص فائدہ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اپنی رُوح کی تار کو خداوند کریم کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ مرشدِ کامل اپنے سرچشمہ سے علیحدہ ہوئی رُوح کو دوبارہ اس سے ملانے والا ماہر انجینئر ہے۔ رُوحانی ترقی رُوح کو اندر کلمہ کے ساتھ جوڑنے سے نصیب ہوتی ہے، لیکن کلمہ کے ساتھ رُوح مرشدِ کامل کی مدد سے ہی جُڑتی ہے۔ خدا نے ہر انسان کے اندر روحانی قوت، عرفان اور سرور کے بیش بہا خزانے رکھے ہیں، لیکن وہ پھر بھی یتیموں کی طرح باہر ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

فقرائے کامل اِس پوشیدہ خزانے کو حاصل کرنے کا راز سکھاتے ہیں۔ وہ نفس اور مادیت کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو اِن بندشوں سے آزاد ہونے کی ترکیب سکھاتے ہیں تاکہ وہ جیتے جی زندگی، عرفان اور سرور کے اپنے اصل مقام میں پہنچ جائیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ لوگ ان کی بات سمجھنے، ماننے اور ان کی تعلیم پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔

سائیں بلھے شاہ اپنی کافی "رین گئی لٹکے سب تارے" میں اشارہ کرتے ہیں کہ دُنیا میں دُنیا کی اصلیت کو سمجھ کر رہنا چاہیئے اور یہاں آکر زندگی کا اصل مقصد ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اِس جھوٹی دُنیا سے مُنہ موڑ کر جوہرِ حقیقی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، ورنہ وقت کا ہرن زِندگی کے کھیت کو اُجاڑ دے گا۔

آپ کہتے ہیں کہ فانی دُنیا میں دائمی راحت دینے والی شئے کبھی نہیں مِل سکتی۔ یہاں آکر لافانی خدا کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ لازوال موتی یا پارس کہیں باہر نہیں ہے، وہ انسان کے اپنے اندر ہی ہے۔ سمندر کے ساحل پر بیٹھا انسان اگر پیاسا مر جائے تو یہ اس کی اپنی نادانی ہے۔

رُوحانیت کے خزانے کو حاصل کرنے کا ذریعہ، کلمہ بھی ہر انسان کے اندر ہے۔ ضرورت کسی عارف یا ہادی کی مدد اور وساطت سے اندرونی آنکھ کھول کر رُوح کو اُس کلمہ کے ساتھ جوڑنے کی ہے۔

۱۔ رَین گئی لٹکے سبھ نارے، اب تو جاگ مُسافر پیارے
آواگوَن سرائیں ڈیرے، ساتھ تیار مُسافِر تیرے
تَیں نہ سُنیؤ کُوچ نگارے، اب تو جاگ مُسافِر پیارے
کرلے اَج کرنے دی بیرا، بہُڑ نہ ہوسی آوَن تیرا
موتی چُونی پارس پاسے، پاس سمندر مرو پیاسے
کھول اکھیں اُٹھ بہہ بھکارے، اَب تو جاگ مُسافِر پیارے
بُلھا شوہ دے پَیریں پڑیئے، غفلت چھوڑ حیلہ کُجھ کریئے
مِرگ جتن بن کھیت اجاڑے، اَب تو جاگ مُسافِر پیارے
رَین گئی لٹکے سبھ نارے، اَب تو جاگ مُسافِر پیارے
۲۔ تَیں کت وَل پاؤں پسارا اے، کوئی دَم کا اِنہاں گُزارا اے
اک پلک جھلک دا میلہ اے، کُجھ کرلے ایہو ویلا اے
ایہہ گھڑی غنیمت دِہاڑا اے، تَیں کِت وَل پاؤں پسارا اے
اِک رات سراں دا رہنا اے، اِیتھے آکر پھِل نہ بہنا اے
کل سب دا کُوچ نقارہ اے، تَیں کِت وَل پاؤں پسارا اے
تُوں اوس مقاموں آیا ایں، ایتھے آدم بن سمایا ایں
ہُن چھڈ مجلس کوئی کارا اے، تَیں کِت وَل پاؤں پسارا اے
بُلھا ایہہ بھرم تمہارا اے، سر چکیا پربت بھارا اے
اُس منزل راہ نہ کھاڑا اے، تَیں کت وَل پاؤں پسارا اے

باطن میں کلمہ کے ساتھ توجہ لگانے کے لئے کسی کو اپنی قوم، اپنا مذہب یا مُلک تبدیل کرنے کی ضرُورت نہیں۔ نہ ہی گھر بار چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں میں جانے کی ضرُورت ہے۔ کنوَل بے شک پانی میں رہتا ہے، مگر نہ اُس کے پھُول پر اور نہ ہی اُس کے پتوں پر پانی کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ مُرغابی پانی میں رہتی ہے، لیکن اس کے پَر پانی میں نہیں بھیگتے۔ وہ جب بھی چاہتی ہے خُشک

پَروں سے اُڑ جاتی ہے۔ اِسی طرح ہم دُنیا میں رہتے ہُوئے اپنی رُوح کو اندر کلمہ سے جوڑ کر با آسانی بحرِ ہستی سے پار ہو سکتے ہیں۔

سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ جسم فانی ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک لافانی جَوہر موجود ہے رُوحانی شغل کے ذریعے فانی سے لافانی تک پہنچ جانا ہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے ۔

ہَیں میری ہے کہ تیری ہے۔ ایہہ انت بھسم دی ڈھیری ہے
ایہہ ڈھیری پیا نے گھیری ہے۔ ڈھیری نُوں ناچ نچائیدا
ہُن کِس تھیں آپ چھُپائیدا

آپ آگے کہتے ہیں کہ میری اور خُدا کی ذات ایک تھی۔ اِس لئے جب میں اُس کی کھوج میں گیا تو میری خودی فنا ہوگئی اور میں اُس میں سما کر اُسی کی صُورت اختیار کر گیا۔

تیرا میرا نیاؤں نبیڑے رُوموں قاضی آوے
کھول کِتاباں کرے تسلّی دوہاں اِک بناوے
بُلھا شَوہ نُوں کیہا جیہا۔ ہُن نُوں کیہا مَیں کیہی
تَینُوں جو مَیں ڈھونڈن لگّی۔ مَیں بھی آپ نہ رہی
پایا ظاہر باطن تینوں ۔ باہر اندر اسنائی

سائیں بُلھے شاہ نے اپنے کلام میں اُس سیدھی سادی عملی ترکیب کا پُرزور اور دلکش بیان کیا ہے جس کے ذریعے وُہ اپنی رُوح رب کے ساتھ جوڑ کر ایک بھٹکتے کھوجی سے ایک رسیدہ درویش کے درجہ تک جا پہنچے۔ یہ ترکیب بالحاظ مذہب و ملّت دُنیا کے تمام انسانوں کی مشترکہ جائداد ہے۔ اس جائداد کو حاصل کرنے کیلئے کہیں باہر بھٹکنے کی ضرورت نہیں، فقط باطن میں کھوج کرنے یا اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔ یہ ترکیب کامل فقیروں اور مالک کے سچے عاشقوں سے ان لوگوں کو ملتی ہے جو کامل فقیروں پہ ایمان لاتے ہیں۔ سائیں بُلھے شاہ ان کو یقین دلاتے

ہیں کہ ہماری راہ پر چل کر تم خدا کی درگاہ میں پہنچ جاؤ گے ۔

جے تُوں ساڈے آکھے لگیں تینوں تخت بہاواں گے
جس نوں سارا عالم ڈھونڈے تینوں آن ملاواں گے
زہدی ہو کے زہد کماویں لے پیا گل لاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں کد تک حکم چلاویں گا

زُبان اَور طرزِ بیان

سائیں بُلھے شاہ کا کلام زیادہ تر کافیوں کی صُورت میں ہے۔ اُن کے زمانے میں کافی لکھنے کا رواج عام تھا۔ کافی بھگتوں کے شبد یا بشن پدوں سے ملتی جلتی نظم جیسی ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کسی رُوحانی مضمون کو۔ عام طور پر مُرشد یا رب کے عشق اور اس کی جدائی کی تڑپ ___ ہلکے پھلکے مگر سنجیدہ انداز میں بیان کرتا تھا۔ کافی گائے جانے کیلئے لکھی جاتی تھی۔ اور کئی صُوفیوں نے اپنی کافیاں کلاسیکل یا پکے راگوں میں لکھی ہیں۔ عام طور پر لوگ صُوفیوں کے تکیوں پر اکٹھے ہو کر نصف دائرے کی شکل میں بیٹھ جاتے تھے اور کافیاں گاتے تھے۔ لیکن بعض اوقات صرف قوّال ہی کافی گاتے تھے۔

صُوفیوں کی پنجابی زبان میں لکھی گئی کافیوں میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور اسلامی مذہبی کُتب کے کئی حوالے ملتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ان میں مقامی زبان، محاورات اور تمدّن کا رنگ حاوی ہے۔

بُلھے شاہ نے "باراں ماہ" اور "اٹھوارے" بھی لکھے ہیں سی حرفیاں اور دوہڑے بھی۔ "باراں ماہ" میں سال کے الگ الگ مہینوں کا بیان کرتے ہُوئے شاعر نے محبّت اور فُرقت کے مضمون کامیابی سے نبھائے ہیں۔ "سی حرفی"، "پٹی" یا "باون اکھری" جیسی نظم ہوتی ہے، جس میں شاعر حروفِ تہجّی کے الگ الگ حرفوں کے سہارے اپنے خیالات کا نظم کی صُورت میں اظہار کرتا ہے۔ بُلھے شاہ، سُلطان باہُو اور دوسرے کئی صُوفیوں نے "سی حرفیاں" لکھی ہیں۔ بُلھے شاہ کی سی حرفیاں اُس کی کافیوں کی طرح عشق اور ہجر کے رنگ میں رنگی ہُوئی ہیں۔ ان میں کئی لطیف رُوحانی مُشاہدات نہایت رمزیہ مگر سہل زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اٹھواروں میں بھی شاعر نے ہفتے کے ہر ایک دن کا ذکر کرتے ہُوئے عشق و فراق کا بیان کیا ہے۔ دوہڑے میں عام طور پر شاعر دو

مصرعوں میں کوئی مکمل خیال ظاہر کرتا ہے۔ سائیں جی کے دوہڑوں میں ان کا طرزِ بیان بڑا بےخوف اَور پُرزور ہے۔ ان میں شریعت، مُلّاؤں، قاضیوں۔ پنڈتوں اَور اپنے آپ کو عالم کہلانے والوں پر سخت چوٹیں کی گئی ہیں۔ کئی دوھڑوں میں لطیف رُوحانی رمُوز کا نہایت آسان مگر معنی خیز انداز میں انکشاف کیا گیا ہے۔

شاہ حُسین جیسے صُوفی شاعروں کی مانند بُلّھے شاہ نے بھی بہت سی تشبیہیں اَور استعارے عام پنجابی زندگی سے لئے ہیں۔ اِن تشبیہوں اَور استعاروں کا تعلق، چرخوں، پُونیوں، گوہڑوں، تکلوں۔ ترنجھنوں، پتن، پُور، بیج، گھڑا، گھڑولی وغیرہ سے ہے۔ اِس دُنیا (لوک) کو مائیکا اَور عاقبت (پرلوک) کو سُسرال کہا گیا ہے۔ اَور رُوح و خُدا کے رشتے کو بیوی اَور شوہر کے رشتے سے اَور پھر اسی رشتے کو ہیر رانجھا، سسّی پنّوں، سمّی ڈھولا۔ یُوسف زلیخا۔ لیلےٰ مجنُوں وغیرہ کے رشتے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ آپ نے ایرانی صُوفیوں کی مانند بُلبل، چمن، پیرِ مُغاں، میخانہ، شراب، پیالہ، صُراحی وغیرہ علامتوں کے ساتھ ساتھ کرشن، کاہن، گائے، بندرابن، بنسی، رام، دسرتھ (راون) لنکا وغیرہ کے الفاظ استعاروں کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ اسی طرح کلمہ یا کلام کے معنوں میں شبد، نام انحد شبد، انحد مُرلی، انحد ناد وغیرہ ہندوستانی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ مُرشد کے لئے گُورو اَور سنگورُو کے الفاظ ان کے کلام میں جابجا مِلتے ہیں۔ انسانی قالب کی ہری مندر، ٹھاکر دوارا سے مناسبت ظاہر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے سب مذاہب کے مشترکہ خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ بھی مِلے جُلے اَور عام فہم استعمال کئے ہیں۔

سائیں جی کی زبان عام طور پر پنجابی ہے، مگر آپ نے کچھ کافیاں اَور دوہڑے ہندی اَور سادھ بھاشا کے مِلے جُلے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ باراں ماہ میں پنجابی اَور ہندی دونوں زبانیں اکٹھی استعمال کی گئی ہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ زبان کے بارے میں آپ کا نظریہ بہت وسیع تھا۔ آپ کا اصل مقصد خیالات کی ترجمانی تھا۔ جس کسی زبان میں بھی کوئی خیال عام فہم اَور خوبصورت انداز میں بیان ہو سکا، آپ نے کر دیا، کیونکہ آپ کے قائلین اَور معتقدوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔

لے پنجاب، بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ۔ ۱۹۶۰: صفحہ ۴۲۴

حضرت انور علی رُہتکی لکھتے ہیں کہ پنجاب اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں انسانِ کامل حضرت بُلھے شاہ کا کلام پڑھنے اور گانے کا رواج عام ہے۔ کیونکہ یہ کلام توحید یا وحدت سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں حضرت شاہ صاحب نے معرفت اور حقیقت کے موتی پنجاب کی شیریں زبان میں پروئے ہیں۔ یہ عشقِ الہٰی کا پُرزور کلام ہے۔ جو رب کے سچے طالبوں اور عاشقوں پر ایسی حالت طاری کر دیتا ہے، جس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ یہ کلام عشق کا شعلہ بھڑکاتا ہے اور تن بدن میں ایسی آگ لگا دیتا ہے جو سچے عاشقوں کی رُوح کی غذا ہے[1]

آپ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ کامل صُوفی فقیروں نے لوگوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے اپنے کلام کو حقیقت کی رموز سے آراستہ کیا تاکہ اس کو سُن کر لوگوں کے دِل پر چوٹ لگے اور اُن کو اپنی اصلیت کا علم ہو جائے[2] حضرت بُلھے شاہ کا کلام بھی اِس کسوٹی پر پُورا اُترتا ہے۔ اِس میں بجلی جیسی تاثیر ہے جس کو سُن کر لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور اُن کے اندر اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو اُٹھتی ہے۔[3]

ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ سائیں بُلھے شاہ اپنی بات کو پیچیدہ بنا کر نہیں کہتے۔ اُنہوں نے جو بات کہی ہے صاف صاف اور سادہ الفاظ میں کہی ہے۔ جذبات کی شدت اور نظر کی گہرائی اُن کے کلام میں وُہ اثر پیدا کرتی ہے کہ فن مُنہ تاکتا رہ جاتا ہے۔ یہ سادگی کسی مشق کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ وُہ بنیادی سادگی ہے جو کھُردری بھی ہے اور زور آور بھی۔[4]

رُوحانیت کی رموز کو عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ زبانوں کے عالمانہ انداز میں بیان کرنے کی بجائے عام فہم زبان میں ظاہر کر دینا زمانۂ وسطیٰ کے تمام سنت بھگت اور فقیر شاعروں کے کلام کا جُزو ہے، جس کی خوبصورت جھلک سائیں بُلھے شاہ کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔

آپ کے کلام کی ایک بڑی خُوبی طنز یا چوٹ ہے۔ جو کہیں سُوئی کی ہلکی چُبھن کی طرح ہے اور کہیں ہتھوڑے کی کراری چوٹ بن جاتی ہے۔ اِس طنز کا زیادہ تر استعمال مُلاؤں، قاضیوں، پنڈتوں، پروہتوں اور نمائشی پرہیزگاروں کے خلاف کیا گیا ہے، جس کی کچھ مثالیں اُنکے مندرجہ ذیل کلام سے

---

[1] قانونِ عشق، صفحہ ۸۔ [2][3] قانونِ عشق صفحہ ۶۳-۶۴۔ [4] کلام بُلھے شاہ، تعارف۔

واضح ہیں۔ ؎ علموں میاں جی کہا دیں۔ تنبا ُچک مَنڈی جاویں
دھبلائے کے چُھری چلاویں۔ نال قصائیاں بہت پیار
علموں بس کریں او یار۔ علموں بس کریں او یار
۲۔ وارے جائیے اونہاں توں، جیہڑے مارن گپ شڑپ
کوڑی لبھی دے دیون تے بُغچہ گھاؤں گھپ
۳۔ وارے جائیے اونہاں توں، جیہڑے گلیں لین پرچا
سُوئی سلائی دان کرن تے، اہرن لین چُھپا

سائیں بُلّھے شاہ کے کلام میں ایک اپنی ہی قسم کی شوخی اور نازک خیالی ہے جس کی مثالیں اُن کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔ "ہُن کس تھیں آپ چھپائی دا"۔ کافی میں آپ کہتے ہیں کہ وہ خداوندکریم خود ہی بندرابن کا گوالا (بھگوان کرشن) بن کر آتا ہے۔ خود ہی لنکا پر حملے کا نقارہ بجانے والا (بھگوان رام) بن جاتا ہے۔ اور خود ہی مکّے کا حج کرنے والا (حضرت محمّدؐ صاحب) بن کر آجاتا ہے ؎

بندرابن میں گئوُاں چراویں، لنکا تے چڑھ ناد وجاویں
مکّے دا بن حاجی آویں، واہ واہ رنگ وٹائی دا

مکّہ کے حج کا رواج حضرت محمّدؐ صاحب کے بعد پڑا۔ مگر آپ خُداوندکریم کے حضرت محمّدؐ صاحب کی شکل میں مکّہ پہنچنے کو مکّہ کا حاجی بن کر آنے کا نام دیتے ہیں۔ جو ایک اچھوتا خیال ہے۔ اِسی کافی میں آگے چل کر خُدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تُو نے منصُور کو سُولی پر چڑھا دیا۔ میرے باپ کا بیٹا ہونے کے ناطے وُہ میرا بھائی تھا۔ مَیں اُس کا وارث ہُوں۔ اس لئے مجھے اُس کے خُون کا بدلہ دو۔ ایک طرف رَبّ کو باپ کہنا اور پھر اُس کے بیٹے کو اپنا بھائی کہہ کر خُون کا بدلہ مانگنا ایک انوکھا چونچلا ہے۔ جو سائیں بُلّھے شاہ کو ہی زیب دیتا ہے ؎

منصُور تُساں تے آیا ہے، تُسیں سُولی پکڑ چڑھایا اے
میرا بھائی بابل جایا اے، تُسیں خُون دیو میرے بھائی دا

اِسی کافی میں اُس محبُوبِ حقیقی سے محبُوبہ بن کر آپ ایک نخریلے انداز میں کہتے ہیں کہ اَب کُچھ

بھی ہو" مَیں تم سے دُور نہ رہوں گی بَیں تمہارے سارے راز فاش کروں گی، پھر میں دیکھوں گی کہ تم مجھے کیسے گلے نہیں لگاتے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والا اور اُسے طعنے ہی نہیں بلکہ دھمکیاں اور الٹی میٹم دینے والا ایسا شوخ انقلابی صُوفیوں میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے ؎

ہُن پاس تہاڈے وَساں گی . نہ بے دل ہو کے نساں گی
سَب بھید تساڈے دساں گی . کیوں مینوں انگ نہ لائی دا

اِسی طرح آپ نے رَبّ یا مُرشِد کو بغل کا چور کہہ کر پکارا ہے ۔ چور خطرناک ہوتا ہے لیکن گھر کا چور اَور بغل یا اندر کا چور تو اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔ محبُوبِ حقیقی کو چِت چور کہا گیا ہے کیونکہ وُہ چھُپ چھُپ کر من کو موہ لیتا ہے اور اگر اسے پکڑنے کی کوشش کریں۔ تو قابُو میں نہیں آتا۔ رُوح کُنڈی میں پھنسی ہُوئی مچھلی ہے، اور مُرشِد چھُپ چھُپ کر کنڈی پھینکنے والا اور ڈور کھینچنے والا ماہی گیر ہے۔

سادھو کِس نوں کُوک سُناواں، میری بغل دے وِچ چور
شاہ عنایت کُنڈیاں پائیاں، لُک چھُپ کھِچدا ڈور

جس بے تکلفی سے سائیں بلھے شاہ نے اپنے مُرشِد یا خُدا کو برابری کی سطح پر آ کر طعنے دیئے ہَیں اُس سے اُن کے کلام میں ایک عجیب سی بے ساختگی آ گئی ہے جس سے خُدا یا مُرشِد بیگانہ نہ رہ کر اپنے کسی نزدیکی رِشتہ دار یا محبُوب کی طرح لگنے لگتا ہے۔

سائیں بلھے شاہ کے سارے کلام میں جذبات کی پُرزور روانی نُمایاں ہے۔ یہ کلام خود رو جھرنے کی مانند از خُود دِل کی گہرائیوں سے نکلتا معلوم پڑتا ہے۔ اِس کلام میں بے خُودی اور بے پروائی ہے، مستی اور خُمار ہے؛ رمز ہے نزاکت اور لطیف شوخی ہے۔ اِس میں ایک مٹک، لچک، دلیری اور ترغیب ہے۔ اِس کلام میں جہاں خُوشگوار رنگینوں کی بہار ہے، وہاں ہجر کے دِلسوز جذبات کی فراوانی بھی ہے۔ یہ کلام کہیں موسیقی کی میٹھی دُھن بن جاتا ہے تو کہیں ناچ کی رقت آمیز دھمک۔ یہ پہیلیاں بھی بُجھاتا ہے اور رمزیں بھی کھولتا ہے۔ یہ کلام جسقدر عام فہم اور دلکش ہے، اُتنا ہی سنجیدہ اور پُر معنی بھی ہے، اور خُود بخُود دِل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے جو بھی کوئی ایک بار اس کو پڑھ لیتا ہے، بار بار اِسے پڑھنے پر مجبُور ہو جاتا ہے۔

کلام کی تصنیف

سائیں بلھے شاہ کا بیشتر کلام کافیوں کی شکل میں ملتا ہے۔ اِس کتاب میں آپ کی زیادہ سے زیادہ کافیاں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کے کلام کا اِنتخاب مُرتب کرنے میں جن حضرات کی تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اُن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ کلیات بلھے شاہ ——— مرتب ڈاکٹر فقیر محمد صاحب فقیرؔ۔

۲۔ "قانونِ عشق" مصنف اور مرتب انور علی رہتکی

۳۔ کلام بلھے شاہ "مرتب سید (ڈاکٹر) نذیر احمد

۴۔ کافیاں بلھے شاہ ۔ مُرتب عبدالمجید بھٹی۔

کافیوں کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ کئی جگہ اختلافاتِ درس پائے جاتے ہیں۔ اِس کتاب کا بنیادی مقصد سائیں بلھے شاہ کے کلام کے روحانی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں درس میں اختلافات ہیں۔ اُن کے بارے میں فُٹ نوٹوں میں جگہ جگہ اپنی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی نفسِ مضمون کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی ہے۔

کافی کیا ہے؟

کافی شاعری کی وُہ صنف ہے جس میں شاعر اپنے محبوب کی جُدائی کے غم و اندوہ، ہجر کی تڑپ، ملاپ کی حسرت اور اُس کے وصال سے ملی رُوحانی تسکین کے بیانات نظم کرتا ہے۔ کافی کا اخذ عربی کے لفظ کافہ سے ہوا ہے جس کے معنی "گروہ" کے ہیں۔ پس گروہ کی شمولیت کافی گانے کیلئے ایک ضروری جزو سی بن کر رہ گئی ہے۔

یہ غزل کی طرح زمانہ وسط کے صُوفی شعرأ میں مقبولِ عام ہُوئی۔ کافی کا پہلا یا دُوسرا مصرعہ یا دونوں مصرعے باہم استھائی کا کام کرتے ہیں۔ کافی عام طور پر نغمہ، نعت یا قوالی کے لہجہ میں گائی جاتی ہے۔ بند کے آخر میں مُضطرب استھائی کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ

ڈُہرا ڈُہرا کے گاتے ہیں۔ اِس سے ایک خاص فضا یا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جس کا سامعین پر پُرکیف اثر ہوتا ہے۔ کافی کو عموماً قوال گاتے ہیں۔ کافی گاتے وقت وُہ ہمہ تن اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ بظاہر وُہ اسی فضا ئی کا حصہ ہی بن جاتے ہیں۔

ا۔ اللہ دِل رتا میرا

یہ چھوٹی سی نظم خدا کی حمد میں کہی گئی ہے۔ اِس میں کچھ رمزیہ علامات پائی جاتی ہیں جو کہ بُلھے شاہ کے کلام میں اکثر دہرائی گئی ہیں۔ مختصراً اِس نظم میں کہا گیا ہے، کہ محض خدا ہی واحد حقیقت ہے، جو خالق کی حیثیت میں اپنی مخلوق میں منعکس ہے۔ وہ ہر شئے میں جلوہ گر ہے۔ اِس دانش سے وُہی آگاہ ہو سکتا ہے جس کا دِل پاک و صاف ہو۔

ا[1]۔ اللہ دِل رتا میرا
مینوں[2] ب دی خبر نہ کائی
ب پڑھیاں کُجھ سمجھ نہ آوے
ا دی لذّت آئی
ع[3] نے غ دا فرق نہ جاناں
ایہہ گل ا سمجھائی
بُلھیا![4] قول الف دے پُورے
جیہڑے دِل دی کرن صفائی

(نذیر احمد: کلامِ بُلھے شاہ صفحہ ۲)

---

[1] ا عربی و فارسی حروفِ تہجی کا پہلا حرف ہے، جس کا اشارہ ایک رب یا مکمل وحدت کی طرف ہے۔

[2] ب حروفِ تہجی کا دوسرا حرف ہے۔ اللہ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، سب کو 'ب' یا دوسرا یعنی غیر کہا جاتا ہے۔

[3] عربی و فارسی حروفِ تہجی میں 'ع' اور 'غ' میں صرف اتنا فرق ہے کہ 'ع' کے اُوپر نقطہ لگانے سے 'غ' بن جاتا ہے۔ آپ کا رمزیہ مطلب یہ ہے کہ خدا اور مُرشد میں صرف انسانی جسم کا فرق ہے۔

[4] وہی لوگ 'ا' کے مطلق قول کو سمجھ سکتے ہیں جو دِل کی صفائی کرتے ہیں۔

آ سجن گل لگ اساڈے

خدا سے عشق اور اس کا اپنے عاشقوں کو امتحان میں ڈالنا۔ اس کافی میں بلھے شاہ کا من پسند مضمون ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو خدا سے وصال کرنے کے لئے سخت ریاضت کی ضرورت ہے۔ محض لفظی بحث سے نہیں، بلکہ متواتر روحانی شغل سے ہی انسان خدا سے ملاپ کر سکتا ہے۔ (سُتیاں بیٹھیاں کجھ نہیں ڈِٹھا۔ جاگدیاں شَوہ پائیوا ای)

اس کے بعد وہ کئی مثالیں دیتا ہے۔ جن میں نامور عاشقوں کو خدا سے ملنے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ شمس تبریز کو جس نے اناالحق کا نعرہ لگایا تھا اور مُردے کو زندہ کر دیا تھا۔ پھانسی پر اُلٹا لٹکایا گیا۔ یوسف کو کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ زلیخا کی مصر کے بازاروں میں بے حُرمتی کی گئی۔ حضرت موسیٰ پر بجلی گرائی گئی جب کہ کوہِ طور کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ ہیر کو رانجھے کے ہجر کی آگ میں جلنے پر مجبور کیا گیا۔ بلھے شاہ خدا سے سوال کرتا ہے۔ "اگر تُو اور مَیں الگ نہیں ہَیں تو تُو خود کو مجھ سے کیوں چھپاتا ہے"؟

نظم کے آخر میں بلھے شاہ حسبِ معمول اُداسی کے رنگ کو خوشی کے رنگ میں بدل دیتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ جب سے اس نے اپنے مرشد عنایت شاہ کو پایا ہے، تب سے ہی خداوندِ کریم نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔

آ سجن! گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیوا ای
[1] سُتیاں بیٹھیاں کجھ نہ ڈِٹھا، جاگدیاں شَوہ پائیوا ای

آ سجن! گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیوا ای
[2] قُم باذنی شمس بولے، اُلٹا کر لٹکائیوا ای

---

[1] غفلت، سستی اور لاپرواہی سے کچھ نہیں ملتا۔ باہوش رہ کر مالک کی عبادت کرنے سے ہی اس سے وصال ہوتا ہے۔

[2] قُم باذنی = میرے حکم سے اٹھ بیٹھو۔ کہا جاتا ہے کہ جب شمس تبریز سے مُردہ زندہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے کہا کہ "تم رب کے حکم سے اٹھ بیٹھو"۔ لیکن مُردہ نہ اٹھا۔ پھر اس نے کہا (باقی صفحہ ۲۰۷ پر)

آ سجن گل لگ اساڈے ، کیہا جھیڑا لائیو ای
عشقن[1] عشقن جگ وچ ہوئیاں ، دے دلاس بٹھائیو ای
آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
مَیں تَیں کائی نہیں جُدائی، پھر کیوں آپ چھپائیو ای
آ سجن گل لگ اساڈے ، کیہا جھیڑا لائیو ای
مجھیاں آئیاں ، ماہی نہ آیا، پھوک برہوں ڈولائیو ای
آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
ایس عشق دے ویکھے کارے یوسفؑ کھوہ[2] پوائیو ای
آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
وانگ[3] زلیخا وِچ مصر دے، گھونگھٹ کھول لائیو ای
آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
ربّ[4] ارنی موسیٰ بولے، تد کوہِ طور جلائیو ای

(بقیہ:۔ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۶ سے آگے) کہ میرے حکم سے اُٹھ بیٹھو" تو مُردہ اُٹھ بیٹھا۔
اِس وجہ سے شمس تبریز پر کفر کا فتویٰ لگا کر اُس کی کھال اتار دی گئی۔

[1] لوگ مجھ پر تیرے عشق کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ ایک تُو ہی مجھے دلاسا دینے والا ہے۔

[2] یوسفؑ کے بھائیوں نے حسد سے اُسے کنوئیں میں پھینک دیا تھا کیونکہ اس کا باپ حضرت یعقوبؑ اس کے ساتھ زیادہ پیار کرتا تھا۔

[3] زلیخا یوسفؑ کے عشق میں مصر کے بازار میں خوار ہوئی۔

[4] موسیٰ نے رَبّ سے کہا:۔
"تُو مجھے اپنا نور دکھا"
خدا کے نور دکھانے پر کوہِ طور جل گیا۔

آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
[1] لَنْ تَرانِی جھِڑکاں والا، آپے حُکم سُنائیو ای

آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای
[2] عِشق دیوانے کیتا فانی، دِل بیتیم بنائیو ای

آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا پائیو ای
[3] بُلھا شوہ گھر وسیا آکے، شاہ عنایت پائیو ای

آ سجن گل لگ اساڈے، کیہا جھیڑا لائیو ای

فقیر محمدؔ :- کُلیاتِ بُلھے شاہ
کافی ۸

---

[1] خُدا نے یہ کہہ کر مُوسیٰ کو جھِڑک دیا " تو میرا جلوہ برداشت نہیں کرسکتا۔
[2] اِس دیوانے عشق نے مجھے برباد کر دیا ہے دِل کو ڈھارس دینے والا اب کوئی نہیں رہا۔
[3] جب مجھے شاہ عنایت مِلا تو میرا اپنے اندر ہی اُس محبوبِ حقیقی (خُدا) سے وِصال ہو گیا۔

آمل یارا سارئے

یہ کافی اُن چند کافیوں میں سے ہے جو ایک نظم کی صُورت میں لکھی گئی ہیں۔ اس میں ایک ہی مضمون کو بالترتیب نبھایا گیا ہے، یعنی متلاشی اپنے معبُود سے جُدا ہو کر ایک ہولناک جنگل میں کھو گیا ہے۔ وُہ خُدا سے پُکار کرتا ہے کہ وُہ اُسے اِس مُصیبت سے بچائے۔

چور اور رہزن جنہوں نے اُس کو گھیر رکھا ہے۔ دُنیاوی خواہشات اور حواس کی علامت ہیں، جو اُس کی رُوحانی ترقی میں مُخل ہوتے ہیں۔ واعظ لوگ اہلِ دُنیا کو تلقین کرتے ہیں کہ وُہ شریعت کے پیچیدہ اصُولوں کی پیروی کریں، جس سے وُہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بُلھے شاہ ایسے لوگوں کو ٹھگ کہتے ہیں جو بھولے بھالے اور سادہ لوح انسانوں کو اُن کے مال و زر سے محروم کر دیتے ہیں۔

نظم کے آخر میں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ خُدا کے عشق اور مُرشِد کی مدد سے ہی وُہ دُنیا کے طوفانی سمندر سے پار ہو سکے گا۔ مُرشِد اپنے مُرید کو خُدا کا جلوہ اُس کے اپنے اندر ہی دِکھا دیتا ہے، اسے باہر مندروں مسجدوں میں بھٹکنے نہیں دیتا۔

آمِل یارا سارلے[1]، میری جان دُکھاں نے گھیری!
اندر خواب وچھوڑا ہویا، خبر نہ پیندی تیری
سُنجی، بن وِچ لُٹی سائیاں، چور شنگ[2] نے گھیری
مُلّاں قاضی راہ بتاون[3]، دین دھرم دے پھیرے
ایہہ تاں ٹھگ نیں جگ دے جھیوَر[4]، لاون جال چوپھیرے

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد نے "خواب میں جُدائی" ہونے کا مطلب غفلت یا لاپروائی کی وجہ سے محبُوب سے جُدا ہو جانا بتایا ہے۔ [2] شنگ = ڈاکو کئی جگہ "سُنجی بن وِچ لُٹی سائیاں سُور پلنگھ نے گھیری" لکھا ملتا ہے۔ سُور = جنگلی سُور = پلنگھ = چیتا۔ [3] اِن دو مصرعوں کا عام درس میں لکھا ملتا ہے۔ "مُلّاں قاضی سانُوں راہ بتاون دین دھرم دی پھیری۔ ایہہ تاں ٹھگ جگت دے جیہا لاون جال چوپھیری" دھرم دے پھیرے دا مطلب بناوٹی دھرم کا چکر ہے جس میں قاضیوں مُلّاؤں وغیرہ پر بہت لطیف چوٹ ہے [4] جھیور = چڑی مار: آدمی کو معصوم، کمزور، عاجز اور چڑیا سمجھنا اور قاضیوں (باقی صفحہ ۲۱۰ پر دیکھیں)

کرم شرع دے دھرم بتاون، سنگل پاون پیری[1]
ذات مذہب ایہہ عشق نہ پُچھدا، عشق شرع دا ویری
ندیوں پار ایہ ملک سجن دا، لہر لوبھ نے گھیری[2]
ستگور بیڑی بھری کھلوتی، تیں کیوں لائی اے دیری[3]
بُلھے شاہ! شَوہ تینوں ملسی، دل نُوں دیہہ دلیری[4]
پیتم پاس! تے ٹولنا کس نوں، بُھلیوں شکر دوپہری[5]

(نذیر احمد:- کلام بُلھے شاہ
صفحہ ۱۵)

بقیہ:- فٹ نوٹ ۲۰۹ سے آگے - مُلاؤں وغیرہ کو بے درد، ظالم، پھندہ لگانے والے کہنا نہایت پُر معنی ہے۔ یہ لوگ خود غرضی کے لئے بھولے بھالے لوگوں کو کئی طرح کے بھرم جال میں پھنسا لیتے ہیں۔

[1] ڈاکٹر نذیر احمد نے کرم اور دھرم کی مخالفت کی عمدہ بیانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ بہت جماعت، شریعت یا کرم کانڈ کو ہی سچا دھرم ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ انسان کو شریعت کی مضبوط زنجیروں میں اس حد تک جکڑ دیتی ہے کہ اس کی رُوحانی ترقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

[2] سنسار سمندر کو پار کر کے ہی محبوبِ حقیقی سے وصال ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان لالچ کے بھنور میں پھنسا ہُوا ہے۔

[3] مُرشد اس دُنیا میں مُصیبت سے بچانے کے لئے آیا ہے۔ اب تاخیر کس بات کی ہے؟

[4] بُلھے شاہ! حوصلہ رکھ، محبوب تجھے ضرور ملے گا۔

[5] محبوب تیرے پاس (اندر) ہی ہے اور تو اس عیاں حقیقت کو جانتے ہُوئے بھی اُسے باہر مندروں، مسجدوں میں ڈھونڈ رہا ہے۔

آؤ فقیرو میلے چلئے

اِس نظم میں اُس رواج کی طرف اِشارہ ہے، جس میں فقیروں کی ایک خاص جماعت کسی پیر و فقیر کے تکیئے پر عُرس منایا کرتی ہے۔ اِس کافی کی رمز یہ اہمیت الٰہی کلمہ (انحد شبد) کی تعریف میں مخفی ہے۔ یہ خدائی نغمہ تب ہی سُنا جا سکتا ہے جب انسان اپنی رُوح کو اکٹھا کر کے آنکھ کے اُس مرکز (نقطۂ سویدا) پر لے آئے، جو دونوں آنکھوں کے پیچھے ہے۔ اِس نغمہ کی فوقیت یہ ہے کہ یہ سُننے والے کو خدا کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ جب بھی اِس کلامِ الٰہی کو سُننے میں کامیابی مِل جائے تو انسان کے دِل سے تمام نفرت اور کدورت کافُور ہو جاتی ہے، کیونکہ اُس کو سب میں ایک ہی خدا جلوہ گر نظر آنے لگتا ہے۔ بُلھے شاہ پُرزور الفاظ میں تلقین کرتے ہیں کہ بغیر الٰہی نغمہ سُنے اور بغیر خدا سے وصال کئے یہ فقیروں کا میلہ بے معنی ہے۔ تاہم یہ نصب العین حاصل کرنا آسان نہیں، کیونکہ اس میں نفس کو قطعی طور پر ساکن کرنا پڑتا ہے۔

آؤ فقیرو میلے چلئے، عارف دا سُن واجا رے
انحد سبد سُنو بہُو رنگی تجیے بھیکھ پیا جا رے
انحد واجا سرب[1] ملاپی نِرویری[2] سرناجا[3] رے
میلے با جھوں میلا اَوتر رُڑھ گیا مول بیاجا رے
کٹھن[4] فقیری رستہ عاشق: قائم کرو من باجا رے
بندہ رب بھیوُ اِک مُلھا، سُکھ نڑا جہان براجا رے

(فقیر محمد: کُلیات بُلھے شاہ، کافی ۱۸)

---

[1] سرب ملاپی = سب کو ملانے والا۔
[2] گورو نانک صاحب نے خدا کو نِرویر کہا ہے۔ سائیں جی بھی شبد یا نام کی مکمّل وحدت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ویر یا دُشمنی کی بُنیاد دُوئی یا کثرت ہے۔ [3] سر ناجا: سر کا چھید۔
[4] سچّی فقیری اور سچّے عشق کا اصل راستہ من کو اپنے اندر کلمہ میں کھڑا کرنا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔

آئی رُت شگوفیاں والی

یہ مختصر سی نظم انسان کی بے بسی اور لاچاری کی حالت کی عکاسی کرتی ہے جب کہ وُہ دُنیا کے حالات کو اپنے مطابق بنانے سے قاصر ہے۔ وُہ مکمل طور پر اپنی تقدیر کے بس میں ہے جسے وُہ بدل نہیں سکتا۔ تاہم وُہ اپنی قسمت بنانے والا خود ہی ہے، کیونکہ اُس کی قسمت کا انحصار اُس کے پچھلے جنموں کے اعمال پر ہے۔ جس طرح چڑیاں بہار کے موسم میں چُگنے آتی ہیں، کچھ تو بازوں کی خوراک بن جاتی ہیں، کچھ سیخ کا کباب بن جاتی ہیں اور کچھ شکاریوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اِسی طرح دُنیا کے اِنسان سمجھتے ہیں کہ وُہ یہاں عیش وعشرت کے لئے آئے ہیں۔ لیکن وُہ اپنی تقدیر کا شکار ہو جاتے ہیں، جو اُن کے اپنے پچھلے اعمال کا ہی نتیجہ ہے۔

1 آئی رُت شگوفیاں والی، چڑیاں چُگن آئیاں
2 اِکناں نُوں جُرّیاں پھڑ کھادا، اِکناں پھاہیاں لائیاں
3 اِکناں آس مُڑن دی آہے، اِک سیخ کباب چڑھائیاں
4 بُلھے شاہ اِکیہہ وس اُنھاں، جو مار تقدیر پھسائیاں

(نذیر احمد:- کلام بُلھے شاہ صفحہ ۵)

---

1 یہاں تقدیر کا اور دُنیا میں ہر سُو بچھے ہُوئے موت اور شیطان کے جال کا پُر زور بیان کیا گیا ہے دُنیا کے باغ میں انسانی جنم شگوفوں والا موسم ہے رُوحیں (چڑیاں) دُنیا میں اپنے اعمال کے بندھن میں پھنسنے کیلئے اُترتی ہیں۔ 2 جُرّے = باز۔ کچھ چڑیوں کو باز (موت کے فرشتے) کھا گئے۔ کچھ نفسانی خواہشات کے پھندے میں پھنس گئیں۔

3 کچھ رُوحوں (چڑیوں) کو اپنے اصلی گھر پہنچنے کی امید ہے، اور کچھ کئے گئے اعمال کی وجہ سے دُکھ اُٹھا رہی ہیں۔

4 جنکو (کئے ہُوئے اعمال سے بنی) تقدیر نے مار گرایا، اُنکے کچھ بھی اختیار میں نہیں ہے۔

اَب کیوں ساجن چِر لائیو رے

دُنیا کی تمام خوشیاں ترک کر کے بُلھے شاہ ایک فقیرانہ زندگی اختیار کرتا ہے لیکن جو چیز وُہ خیرات میں مانگتا ہے وُہ اپنے معبُود، اپنے مُرشِد کا دیدار ہے۔ دُنیا کی ہوس اَب اُسے اشتعال نہیں دے سکتی۔ وُہ ایک ہی مُلا کی اذان سُنتا ہے اور وُہ ہے عشق کا مُلا۔ اور وُہ محراب جس کے آگے وُہ سجدہ کرتا ہے، وہ ہے اُس کے ماتھے کی محراب، جس میں نقطۂ سویدا واقع ہے۔ موت جو عام انسان کیلئے انتہائی خوف کا باعث ہے، بُلھے شاہ کے لئے مسرت کا سرچشمہ ہے۔ اُس نے اپنے جسم کو رُوح سے خالی کرنے پر مُہارت حاصل کر لی ہے اور اپنی مرضی سے جب بھی وُہ چاہے اُسے خالی کر سکتا ہے اور اُس میں واپس آ سکتا ہے۔ اِسی عمل کو فقیروں نے جیتے جی مرنے کا نام دیا ہے۔ جسم کو خالی کر کے رُوح کو نُورانی دُنیا کا سُرور اور مُرشد کی نورانی صُورت کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ کافی کے آخری بند میں وہ اپنے مُرشد عنایت شاہ کا مشکُور ہے جس کے فضل سے وُہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔

اَب کیوں ساجن چِر لائیو رے

اَیسی مَن میں آئی کا،[1] دُکھ سُکھ سب ونجائیو رے
ہار سِنگار کو آگ لگاؤں، گھٹ پر ڈھانڈ مچائیو رے[2]
سُن کے گیان کی ایسی باتاں، نام نشان سبھی اَن گھاتاں[3]
کوئل وانگوں کُوکاں آتاں، تیں اجے نرس نہ آئیو رے[4]

---

[1] کا = کیا۔ مَن میں کیا آئی ہے کہ میں دُکھ سُکھ کا خیال بھُول گئی ہُوں۔

[2] میرے اندر شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آگ لپٹیں مار رہی ہے۔

[3] اولیا لوگوں سے عرفان کی عمیق ترین باتیں سُن کر نام کا تیر میرے سینے میں چُبھ گیا۔

[4] میں کوئل کی طرح کُوک رہی ہُوں لیکن تجھے نرس نہیں آیا۔

مُلّاں عشق نے بانگ دوائی، اُٹھ دوڑن گل واجب آئی
کر کر سجدے گھر ول دھائی، [1] متھے محراب لکا ئیو رے
پریم نگر دے اُلٹے چالے، [2] خونی نین ہوئے خوشحالے
[3] آپے آپ پھسے وچ جالے، پھس پھس آپ کہائیو رے
بلھا شَو دے سنگ پریت لگائی، سوہنی بن تن سب کو ئی آئی
دیکھ کے شاہ عنایت سائیں، [4] جی میرا بھرمائیو رے

(عبدالمجید بھٹی

کافیاں بُلھے شاہ۔ صفحہ ۱۶-۱۸)

---

[1] عبدالمجید بھٹی نے "منہ محراب لکائیوای" لکھا ہے۔ لیکن 'متھے محراب لکائیو رے' زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تشریح کے لئے دیکھیں کتاب کا صفحہ ۷۳-۷۴

[2] عشق کی ریت اُلٹی ہے۔ محبوب کی آنکھیں عاشق کا خون پیتی ہیں، اور وہی عاشق کے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔

[3] عاشق خود ہی عشق کے جال میں پھنستا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو ذبح کراتا ہے۔

[4] عبدالمجید بھٹی نے "جی میرا بھرمائیو رے" لکھا ہے کئی جگہ" جیا میرا بھرآئیو رے" لکھا ہوا ہے۔ "جی میرا بھرمائیو" کا مطلب ہے کہ اُس نے میرا من موہ لیا

اَب لگن لگی کیہہ کریئے

اِس چھوٹی سی کافی میں بُلھے شاہ کے دِل کی گہرائیوں سے اَپنے مُرشد کی جُدائی کے ناقابِلِ برداشت صدمہ کا گیت بہہ نِکلا ہے۔ وُہ بڑے دِلسوز اَور مُؤثر انداز میں اَپنے دِل کی حالت بیان کرتا ہے جِس میں وُہ نہ ختم ہونے والی بے چینی میں مُبتلا ہے۔ اُسے نہ دِن میں چَین ہے نہ رات کو قرار۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جِس میں اُس کا زندہ رہنا مُحال ہے۔ نہ تو محبُوب کا فراق برداشت کرسکتا ہے اَور نہ ہی اُس کی جُدائی میں مَر سکتا ہے، کیونکہ اُسے ابھی اُمید ہے کہ اُسکے محبُوب کا دِل پگھلے گا اَور وُہ واپس آجائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ بُلھے شاہ نے یہ کافی اُس وقت لِکھی جب کہ وُہ مُرشِد سے دُور تھا، اَور اُس کے وِصال کی آرزُو میں تڑپ رہا تھا۔

اَب لگن لگی کیہہ کریئے
نہ جی سکیئے تے نہ مَریئے

تُم سُنو ہمارے بَیناں، موہے رات دِنے نہیں چَیناں[1]
ہُن پی بِن پلک نہ سَریئے[2]، اَب لگن لگی کیہہ کریئے

ایہہ اگن برہوں دی جاری، کوئی ہمری پریت نواری
بِن درشن کیسے تریئے۔ اب لگن لگی کیہہ کریئے

بُلھے پئی مصیبت بھاری، کوئی کرو ہماری کاری
ایہہ اجیہے دُکھ کیسے جریئے[3]
اب لگن لگی کیہہ کریئے

(فقیر محمد:۔ کُلیاتِ بُلھے شاہ کافی ۲)

---

[1] قرار [2] گذارہ نہیں ہوتا [3] برداشت کریں۔

اَب ہم اَیسے گُم ہُوئے

یہ مختصر سی کافی ایک رمزیہ رنگ سے بھرپُور ہے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنی خودی کو گنوا کر اَپنی اصل ذات کی پہچان کر لی ہے۔ اِس سے اُنہیں یہ فضیلت مِلی کہ اُنہوں نے خُدا سے علیحدگی کے جُھوٹے احساس پر فتح پائی۔ اُن کو خُدا سے وصال کرنے میں کامیابی ہُوئی اَور ہر جگہ اُنہیں خُدا حاضر ناظر دکھائی دینے لگا۔

اَب ہم ایسے گُم ہُوئے
پریم نگر کے شہر
اپنے آپ کو سودھ[1] رہے ہیں
نہ سر، ہاتھ، نہ پَیر
کھوئی خُودی اَپنا پد جِیتیا[2]
تب ہُوئی گُل خَیر
بُلھا شَوہ ہے دو ہی جہانیں
کوئی نہ دِسدا غَیر

(نذیر احمد
کلام بُلھے شاہ۔ صفحہ ۱۶)

---

[1] سودھنا = پہچان کرنا، جاننا۔

[2] جِیتیا = حاصل کیا۔

اَپنا دس ٹِکانا

یہ کافی سرکاری اہلکاروں اَور دُوسرے بارسُوخ آدمیوں کی عام لوگوں پر زیادتیوں کے خلاف احتجاج کی آواز بُلند کرتی ہے۔ بُلھے شاہ اِن جابر لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ زندگی چار روزہ ہے۔ اُنہیں تکبّر کے ساتھ اکڑ کر نہیں چلنا چاہیئے، اَور لوگوں کے ساتھ بے رُخی یا نفرت کے ساتھ پیش نہیں آنا چاہیئے۔ وُہ دِن دُور نہیں جب کہ اُن کو موت کے فرِشتے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ موت کا حادثہ ٹَل نہیں سکتا۔ آخر میں بُلھے شاہ بہ کمالِ عاجزی اپنے آپ کو سب سے بڑا گنہگار بیان کرتا ہے۔

اَپنا دَس ٹِکانا

آپنا دَس ٹِکانا ؟ کِدھروں آیا، کِدھر جانا ؟
جس ٹھانے دا مان کریں تُوں، اوہنے تیرے نال نہ جانا
ظُلم کریں تے لوک ستاویں، کسب پھڑیو لُٹ کھانا
کرلَے[1] چاوڑ چار دیہاڑے، اوڑک تُوں اُٹھ جانا
شہر[2] خموشاں دے چل وسیئے، جِتھے مُلک سمانا
بھر بھر پُور لنگھاوے ڈاہڈا، مَلک[3] الموت مُہانا
ایہناں سبھناں تھیں ہے بُلھا، اوگنہار پُرانا
اپنا دَس ٹِکانا، کِدھروں آیا کِدھر جانا؟

(نذیر احمد:-
کلام بُلھے شاہ۔ صفحہ ۶)

---

[1] چار دِن من مانی کرلے۔

[2] آخر کار قبرستان (شہرِ خموشاں) میں جانا ہے۔

[3] موت کا فرشتہ (مَلک الموت) بھاری تعداد میں لوگوں کو اس طرف لئے جاتا ہے۔

اَپنے سَنگ رلائیں پیارے

اِس دُنیا کی تمثیل ایک بھیانک جنگل سے دِی گئی ہے، جو خونخوار درندوں اَور بدرُوحوں سے بھرا ہُوا ہے۔ اِس جنگل کو بغیر کسی رہنما کی حفاظت اَور دستگیری کے عبُور کرنا ناممکن ہے۔ وُہ مُرید جو خُدا سے وِصال چاہتا ہے، اُسے اپنے مُرشد کی سنبھال اَور رہنمائی کی لگاتار ضرُورت ہے۔ اِس دُنیا کی دلفریبی اَور حواس کی پھسلاہٹ اِتنی زبردست ہے کہ وُہ اکیلا اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اِس لئے بُلھے شاہ اپنے مُرشد سے پُرزور اِلتجا کرتا ہے کہ وُہ اُسے محفُوظ اپنی منزل پر پہنچا دے۔

اَپنے سَنگ رلائیں پیارے۔ اَپنے سَنگ رلائیں[1]
پہلے نیہوں لگایا سی تَیں۔ آپے چائیں چائیں[2]
مَیں لایا اے کہ تُدھ لایا۔ اَپنی اَوڑ نبھائیں[3]
راہ پَواں، تاں دھاڑے بیلے۔ جنگل لکھ بلائیں
بھو نکن چیتے تے چِت مچیتے۔ بھو نکن کرن ادائیں
پار تیرے جگا تر چڑھیا، کنڈھے لکھ بلائیں
ہَول دِلی توں تھر تھر کنبدا۔ بیڑا پار لنگھائیں[4]
کرلئی بندگی رَبّ سچے دی۔ ہُون قبول دُعائیں[5]
بُلھے شاہ تے شاہاں دا مُکھڑا۔ گھونگھٹ کھول وکھائیں[6]
اپنے سنگ رلائیں، پیارے۔ اپنے سَنگ رلائیں

(فقیر محمد کلیات بُلھے شاہ کافی ۵)

---

[1] مجھے اپنے آپ میں جذب کر لو میرے محبُوب۔ [2] محبّت خواہ مَیں نے کی ہو، یا تُم نے لگائی ہے، تم اپنی رحمت سے اس کو آخر تک نبھانا۔ یعنی صرف مُرشد کے رحم و کرم سے ہی یہ محبّت انجام تک پہنچ سکتی ہے۔ [3] اگلے تین مصرعوں میں اشارہ کرتے ہیں کہ حرص و ہوس اَور شیطان کی دُنیا میں نفسانی خواہشات کی شکل میں بےشمار دُشمن اِنسان کا راستہ روکے ہُوئے ہیں۔ مَیں دِل کی گھبراہٹ سے تھر تھر کانپ رہا ہُوں۔ [5] کرئی بندگی کی جگہ 'کرلئیں بندگی' چاہیئے۔ [6] ڈاکٹر نذیر احمد نے بُلھے شاہ نُوں شَوہ دا مُکھڑا گھونگٹ کھول وکھائیں" لکھا ہے جو زیادہ ٹھیک لگتا ہے۔

اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں

یہ کافی ایک تنبیہہ کی صُورت میں ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد خدا سے وصال کرنا ہے۔ زندگی مُختصر ہے، اور اس کو فضُول باتوں میں نہیں گنوانا چاہیئے۔ موت کی حقیقت کو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ بُلھے شاہ موت کو شادی کا دن کہتے ہیں۔

بُلھے شاہ نے شادی کی تمثیل کو دو مُتضاد صُورتوں میں استعمال کیا ہے۔ اس تشبیہہ کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ موت، خوشی اور غمی دونوں کا مُوجب ہوسکتی ہے۔ ایک نادان دُنیادار شخص کے لئے جو زِندگی کے بیش بہا تحفہ کو فضُول گنوا دیتا ہے، موت ناقابلِ بیان دُکھ کا مُوجب ہوسکتی ہے۔ لیکن جو شخص اِسے رُوحانی عروج اور وِصال کے لئے صَرف کرتا ہے، اس کے لئے یہ شادمانی کا موقعہ بن جاتی ہے۔

ہندوستانی دُلھن سے اَپنا دولہا چُننے میں کوئی رائے نہیں لی جاتی۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اُسے اپنی مرضی کا ساتھی مِلے، جس کے ساتھ وُہ بخوشی زندگی گُذار سکے۔ عام طور پر سسرال میں اُس کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح وُہ دُنیا دار شخص، جس نے زندگی بھر کوئی رُوحانی ترقی نہیں کی، موت کے وقت اُسے دُکھ اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی رُوح کو موت کے فرشتے زبردستی قبض کرتے ہیں جس سے اُسے بہت اذیت پہنچتی ہے۔ اُسے بجائے اپنے شوہر یعنی خداوند کریم کے ملک الموت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو اُسے اُسکے اعمال کے حساب سے سزا یا جزا دیتا ہے۔ ایسی شادی ایک ظالم کے ہاتھوں اغوا ہونے سے بھی بدتر ہے۔

اِس کے برعکس وُہ دُلھن جو جیتے جی خدا کے 'نام' کا جہیز تیار کرلیتی ہے اُس کے لئے موت ایک خوشگوار موقع بن جاتی ہے۔ مُرشد ایسی رُوح کو موت کے وقت اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اور بالائی رُوحانی طبقات میں رہنمائی کرتا ہُوا اُس کو مقامِ حق میں پہنچا کر اس کے اصلی شوہر یعنی کُل مالک سے مِلا دیتا ہے۔ ایسی رُوح کو آواگون سے دائمی نجات مِل جاتی ہے اور اُس کے لئے موت ایک تحفہ اور فضل وکرم بن جاتی ہے۔

انسانی زندگی آواگون کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ اِس لئے انسان کو نہ صرف پاک وصاف اخلاقی زندگی بسر کرنی چاہیئے، بلکہ رُوحانی شغل کے ذریعے جیتے جی رُوح کو جسم سے نکال کر آنکھوں کے مرکز یعنی نقطۂ سویدا میں یکسُو کرنے کی صلاحیت پیدا کر لینی چاہیئے۔ بُلھے شاہ اِسے اشارتاً چرخے پر سُوت کاتنے سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ فقرأ نے اِسے عام طور پر موت سے پہلے مرنا یا جیتے جی مرنا کہا ہے۔ جب تک کوئی اپنی مرضی سے مرنے کا عمل نہیں سیکھ لیتا، وُہ کلمہ کے ساتھ جُڑ کر خُدا سے وصال نہیں کر سکتا۔

جو شخص اِس موقع کو کھو دیتا ہے اُس کا مستقبل تاریک ہے۔ وُہ اِس دُنیا سے بے یار و مددگار روانہ ہو جائے گا۔ چُونکہ اُس کے پاس کوئی موزُوں حاصلِ راہ نہیں ہے، وُہ راہِ مرگ پر بے سروسامان بھٹکے گا۔ ایسی تقدیر اُن نام نہاد عظیم شاہوں اَور فاتحوں کی رہی ہے۔ جو اِس دُنیا میں کچھ دیر کے لئے بڑی شان و شوکت سے اکڑ کر چلتے تھے۔ اُنہیں اِس دُنیا سے لاچار اَور خالی ہاتھ جانا پڑا۔ اِسی طرح وُہ حسینانِ جہاں جن کے آگے بڑے بڑے شاہ وسُلطان جُھکتے تھے، قبر میں کیڑوں کی خوراک بن گیئں۔

کافی کے آخر میں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ رُوحانی تکمیل کے لئے عِلم و عقل بھی کام نہیں آتے۔ جو چیز ہمیں خُدا کے وِصال کی منزل تک پہنچاتی ہے وُہ کلمہ کا شغل ہے۔

اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں
ایہہ سَون تیرے درکار نہیں

اِک روز جہانوں جانا اے، جا قبرے وِچ سمانا اے
تیرا گوشت کیڑیاں کھانا اے، کر چیتا مرگ وسار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں.....

تیرا ساہا[1] نیڑے آیا اے، کجھ چولی داج رنگایا اے
کیوں اپنا آپ ونجایا اے، اے غافل تینوں سار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں.....

[1] ساہا = شادی کا دن۔ یہاں مُراد موت کے دِن سے ہے۔

تُوں مُتّیاں عمرُ و نجائی اے ، تیری ساعت نیڑے آئی اے

تُوں چرخے تند نہ پائی اے ، کی کرسیں ؟ داج تیار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے مار نہیں....

تُوں جس دن جوبن[1] متی سیں ، تُوں نال سئیاں دے[2] رتی سیں

ہو غافل گلیں[3] وتی سیں ، ایہہ[4] بھورا تینوں سار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے مار نہیں......

تُوں مُڈھوں بہت کچجی سیں ، نِرلجیاں دی نرلجی سیں

تُوں کھا کھا کھانے رجی سیں ، ہُن تائیں تیرا بار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے مار نہیں....

اَج کل تیرا مُکلاوا اے ، کیوں سُتی کر کر دعوے اے

اَن ڈِٹھیاں نال ملاوا اے ، ایہہ بھلکے گرم بازار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے مار نہیں.....

تُوں ایس جہانوں جائیں گی ، پھر قدم نہ ایتھے پائیں گی

ایہہ جوبن رُوپ ونجائیں گی ، تیں رہناں وِچ سنسار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے نہیں.....

منزل تیری دُور دُراڈی ، تُوں پوناں وِچوں جنگل وادی

[5]اَوکھا پہنچن پیر پیادی ، دِسدی توں اسوار نہیں

اُٹھ، جاگ، گھراڑے مار نہیں.....

---

[1] جوانی میں مست، جوانی کا غرور کرنے والی۔ [2] رنگی ہوئی سکھی سہیلیوں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف۔ [3] باتوں میں غلطاں۔ [4] تمہیں ذرا بھی خبر یا پروا نہیں کہ وقت نزدیک آرہا ہے۔ [5] پیدل پہنچنا مشکل ہے اور سواری کرنی مجھے آتی نہیں۔ مطلب یہ کہ تُو نے نہ مُرشد کا دامن پکڑا اور نہ ہی اللہ کی بندگی کی جو تمہاری مددگار ثابت ہو۔ سفر میں کام آنے والا خُدا کا نام، راستہ کا توشہ ہے جو (باقی اگلے صفحہ پر)

اِک اِکلی تنہا چلسیں ، جنگل بَر بر دے وِچ رُلسیں
بے بے توشہ ایتھوں گھلسیں، اوتھے لین اُدھار نہیں
اُٹھ جاگ، گھراڑے مار نہیں.....

اوہ خالی اے سُنج حویلی[1]، توں وِچ رہسیں اِک اکیلی
اوتھے ہوسی ہور نہ بیلی۔ ساتھ کِسے دا بار نہیں
اُٹھ جاگ، گھراڑے مار نہیں.....

جیہڑے تن دیاں وے راجے۔ نال جنہاں دے وجدے واجے
گئے ہو کے بے تختے ناجے، کوئی دُنیا دا عِتبار* نہیں
اُٹھ جاگ، گھراڑے مار نہیں......

کتھے ہے سُلطان سکندر، موت نہ چھڈے پیر پیغمبر
سبھے چھڈ چھڈ گئے اڈمبر۔ کوئی ایتھے پائدار نہیں
اُٹھ جاگ، گھراڑے مار نہیں....

کتھے یُوسف ماہِ کنعانی[2]، گئی زلیخا[3] پھیر جوانی
کیتی موت نے اوڑک فانی۔ پھیر اوہ ہار سِنگار نہیں
اُٹھ جاگ، گھراڑے مار نہیں.....

بقیہ فُٹ نوٹ: صفحہ ۲۲۱ سے آگے ــــ زندگی میں اکھٹا کیا جا سکتا ہے۔ گورو ارجن دیوجی کہتے ہیں ؎ سنت جناں مِل بھائیہو ستجا نام سمال
توشہ بندھو جیا کا ایتھے اوتھے نال (محلہ ۵، صفحہ ۴۹)

[1] حویلی: مُراد قبر میں اکیلے رہنا پڑے گا۔

[2] ماہِ کنعانی: کِنعاں کا چاند: مُراد یُوسف۔ کنعاں مِصر کے ایک علاقے کا نام ہے۔ یعنی چاند جیسا خُوبصُورت یُوسف نہ رہا

[3] زُلیخا کو دوبارہ مِلی جوانی بھی ختم ہو گئی۔ * اعتبار: قافیہ ٹھیک رکھنے کیلئے عتبار لکھا گیا ہے۔

[1] کتھے تخت سلیماں والا، وِچ ہوا اُڈدا سی بالا
اوہ وی قادر آپ سنبھالا، کوئی زندگی دا اعتبار نہیں
اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں....
[2] کتھے میر، ملک سلطاناں؟ سبھے چھڈ چھڈ گئے ٹکاناں
کوئی مار نہ بیٹھے ٹھاناں، لشکر دا جنھاں شمار نہیں
اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں.....
پھُلاں پھل چنبیلی لالا، سوسن سنبل سَرو نرالا
[3] بادِ خزاں کیتا برحالا، نرگس نت خمار نہیں
اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں....
جو کجھ کرسیں، سو کجھ پاسیں، نہیں تے اوڑک پچھوتاسیں
سنجی کونج وانگوں کرلاسیں، کھنباں[4] باجھ اڈار نہیں
اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں......
ڈیرا کرسیں اُہنی جاہیں، جتھے شیر، پلنگ[5] بلائیں
خالی رہسن محل سرائیں، پھر توں ورثے وار نہیں
اُٹھ جاگ گھُراڑے مار نہیں....

---

[1] سلیمان بہت دانا بادشاہ ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تخت ہوا میں اُڑ سکتا تھا۔
[2] بڑے بڑے حاکم اور بادشاہ نہ رہے۔
[3] موسم خزاں کی ہوا۔ یعنی موت نے سب (پھولوں جیسے) انسانوں کو ختم کر دیا۔
[4] پروں کے بغیر تُو اُڑان نہیں بھر سکے گا۔ یعنی خدا کی بندگی کے بغیر تُو اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکے گا۔
[5] جنگلی جانور شیر، چیتے وغیرہ راستہ روکیں گے۔ موت کے بعد کے دُکھوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

اسیں[1] عاجز وِچ کوٹ علم دے ، اوسے آندے وِچ قلم دے
بِن کلمے دے نا ہیں کم دے ، باجھوں کلمے پار نہیں
اُٹھ، جاگ، گُھراڑے مار نہیں....
بُلھا شوہ بِن کوئی نا ہیں ، ایتھے اوتھے دوہیں سرائیں
سنبھل سنبھل قدم ٹکائیں ، پھیر آون دُوجی وار نہیں
اُٹھ، جاگ، گُھراڑے مار نہیں
ایہہ سَون تیرے درکار نہیں

(فقیر محمد
کُلیاتِ بُلھے شاہ، کافی نمبر ۶)

---

[1] کمزور، بے بس، مجبور، ناچار، مغلوب

اُٹھ چلے گوانڈھوں یار

یہ عشقیہ نغمہ ایک ایسے مجمع کی نقش آرائی کرتا ہے جس میں محبوب کی مرکزی حیثیت ہے جب محبوب کے رخصت ہونے کا وقت آتا ہے، تو جدائی کے درد کی چُبھن جو کہ عاشق کے دِل کو تڑپا رہی ہے ایک مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بُلھے شاہ ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جب کہ عنایت شاہ اُس مجمع میں شامل تھے۔ جب وُہ کچھ دوسرے مریدوں کے ساتھ رُخصت ہونے کے لئے اُٹھے، تو بُلھے شاہ کے دِل میں اپنے مُرشد سے علیحدہ ہونے کے درد کی ٹیس اُٹھی۔

کچھ عالموں نے اِس کافی کی بالکل الگ تشریح کی ہے۔ اُن کا خیال ہے، کہ محبوب کا رُخصت ہونا اس جہانِ فانی سے رحلت کرنا ہے۔ بوقتِ موت تمام رشتے دار، دوست، عزیز واقربا مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں، کیونکہ اُس کی اِس دنیا سے روانگی دائمی روانگی ہے۔ وُہ پھر اِس جہان میں کبھی واپس نہ آئے گا۔

اُٹھ چلے گوانڈھوں یار، ربا ہُن کیہہ کریئے!

اُٹھ چلے ہُن رہندے ناہیں، ہویا ساتھ تیار۔ ربا ہُن کیہہ کریئے!
چاروں طرف چلن دے چرچے، ہر سُو پئی پُکار۔ ربا ہُن کیہہ کریئے!
ڈھانڈ کلیجے بل بل اُٹھدی، بِن دیکھے دیدار۔ ربا ہُن کیہہ کریئے!
بُلھا شوہ پیارے باجھوں، رہے اُرار نہ پار۔ ربا ہُن کیہہ کریئے!

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ صفحہ ۸)

۱؎ پیارے محبوب (مُرشد) کے دُور چلے جانے پر طالب کے دِل کے لطیف مگر شدید درد کو بیان کر رہے ہیں۔ عاشق (مُرید) کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وُہ کیا کرے۔
۲؎ محبوب کو دیکھے بغیر کلیجے میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ آگ بھڑک رہی ہے۔
۳؎ پیارے (مُرشد) کے بغیر نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ مُرشد کے بغیر مرید کے بحرِ عالم میں غوطے کھانے کا پُر معنی منظر بیان کر رہے ہیں۔

اِک الف پڑھو چھٹکارا اے

یہ کافی بُلھے شاہ کے من پسند مضمون، خدا کی حقیقت اور وحدت، پر مبنی ہے۔ علم کا دائرہ وسیع ہے۔ لیکن حقیقت کے متلاشی کو ایک حرف کا پڑھنا ہی کافی ہے۔ یہ حرف "الف" ہے، جو خدا کی وحدت کی علامت ہے۔ الف کو یہ اہمیت دینے کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل، یہ لفظ اللّٰہ کا پہلا حرف ہے۔ دوسرے، الف انگشتِ شہادت کی طرح، یعنی اللّٰہ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ تیسرے الف کی شکل ایک (۱) کے ہندسے کے مشابہ ہے۔ اِس لئے وُہ اللّٰہ کی یکتائی کا نشان بھی ہے۔

اِس کافی کے مطابق کائنات کی تخلیق ایک سے شروع ہُوئی، لیکن یہ بڑھ کر لاانتہا ہو گئی۔ اُس ایک کو جاننے کیلئے تمام کتابی علم اور لیاقت بے معنی ہے۔ اِس سے سوائے پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے وحدت تک پہنچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

تیسرے بند میں بُلھے شاہ اُن شرعی مُلّاؤں کی سخت مذمت کرتا ہے جو تلاوتِ قُرآن تو بخوبی کر سکتے ہیں، لیکن جو اپنے نفس اور دُنیاوی خواہشات کے غلام ہیں، اُن کا نفس ایک پاگل کی مانند ہے، جو ہر سُو گھومتا ہے اور لمحہ بھر کے لئے بھی ساکن نہیں ہوتا۔

کافی کے آخری بند میں بُلھے شاہ رُوح کی حیاتِ جاودانی اور اس کے تناسخ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اُس بَرڑ کے درخت کی مثال دیکر سمجھاتا ہے، جو ایک بہت چھوٹے سے بیج سے پیدا ہو کر ایک بہت بڑے درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔ اور جو بچتا ہے وُہ صرف اس کا بیج ہے۔ اِسی طرح رُوح جسم کی صُورت اختیار کرتی ہے جو آہستہ آہستہ پورے قدوقامت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ وُہ دنیاوی دلچسپیوں میں پُورے طور پر اُلجھ جاتی ہے۔ لیکن آخر کار اس کو یہ سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے، اور وُہ اپنے اصل ابتدائی جلال میں واپس آجاتی ہے۔

اِک الف[۱] پڑھو چھٹکارا اے

اِک[۲] الفوں دو تِن چار ہوئے، پھر لکھ کروڑ ہزار ہوئے
پھر[۳] اوتھوں باجھ شمار ہوئے، ہِک الف دا نکتہ نیارا اے

اِک الف پڑھو چھٹکارا اے

کیوں[۴] پڑھنا ایں گڈ کتاباں دی، سِر چاناں ایں پنڈ عذاباں دی

ہُن[۵] ہوئیو شکل جلّاداں دی، اگے پینڈا مُشکل بھارا اے

اِک الف پڑھو چُھٹکارا اے

بَن[۶] حافظ حِفظ قرآن کریں

پڑھ پڑھ کے صاف زبان کریں

پُھر[۷] نعمت وِچ دھیان کریں

مَن پھردا جیوں ہلکارا اے

اک الف پڑھو چھٹکارا اے

---

۲۲۶ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۶ سے آگے ——

[۳] الف کا مفہوم اللہ ہے عربی حروف میں لفظ اللہ لکھتے وقت پہلا حرف الف ہے۔ الف کا رُخ اُوپر کی طرف ہے۔ اس کی شکل مندسہ ایک (۱) جیسی ہے۔ حضرت انور رستکی "قانونِ عشق" کے صفحہ ۲۰۴ پر لکھتے ہیں کہ جس الف کو پڑھنے سے چُھٹکارا ہے۔ وُہ تختی پر سب سے پہلے لکھا جانے والا حرف نہیں۔ وُہ وجودِ مُطلق ہے۔ ایک الف سے ہی سب (بے شمار) پیدا ہُوئے۔

[۴] تم اپنے دماغ پر بے شمار کتابیں پڑھنے کا بوجھ کیوں اٹھائے پھرتے ہو؟

[۵] تم یہاں لوگوں پر ظلم کرتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ بوقت موت "مُشکل گھاٹی میں سے گزرنا پڑے گا۔ اور اپنے اعمال کا خمیازہ بُھگتنا پڑے گا۔

[۶] حِفظ = زبانی یاد کرنا، حافظ = وُہ شخص جسے قرآن شریف ازبر ہو۔

[۷] قُرآن شریف تو بہت صاف زبان میں بخوبی پڑھتے ہو، لیکن مَن پر قابو نہیں، جو دُنیا کی نعمتوں کے پیچھے بھٹکتا ہے اور ہرکارے کی طرح جابجا دوڑا پھرتا ہے۔

بُلھا بی بوڑھ دا بو یاسی
اوہ برچھ وڈا جاں ہو یاسی
جد برچھ اوہ فانی ہو یاسی
پھِر رہ گیا بی اکارا اے
اِک الف پڑھو چھٹکارا اے

(فقیر محمد کلیات بُلھے شاہ، کافی ۱۱)

ٗ اکارا = اکیلا۔ جب بڑ کا وسیع درخت مرتا ہے۔ تو آخر اس کا صرف بیج ہی رہ جاتا ہے۔ مُراد یہ کہ جب جسم کی موت ہوتی ہے تو باقی صرف رُوح رہ جاتی ہے جو لافانی ہے۔

اِک ٹُونا اچنبھا گاواں گی

یہ بُلھے شاہ کی مختصر لیکن پُراثر کافیوں میں سے ایک ہے۔ یہ نغمہ جذبات سے لبریز ہے، جن کی شدّت تیزی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے، برعکس ان طویل کافیوں کے جن میں خیالات کی رفتار مدھم ہے۔ بلھے شاہ کی اِس کافی میں ایک ہی جذبہ ہر اگلے مصرعے میں تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اثر کی یکتائی کے لحاظ سے بھی یہ کافی بے مثال ہے۔

اِس کافی سے اشارہ ملتا ہے کہ ایک دوشیزہ کا شوہر اس کے ایک رقیب کے جنگل میں پھنس گیا ہے اور وُہ خود ایک سخت اضطراب کی حالت میں مُبتلا ہے۔ اپنے شوہر کو واپس لانے کے لئے وُہ مصمم ارادہ کرتی ہے۔ وُہ کہتی ہے کہ وُہ تمام جادُو منتر پھُونکے گی جو اُسے آتے ہیں۔ وُہ بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، چاند، سُورج اور ستاروں کی کرنیں، اپنی سجاوٹ اور سنگار، شوہر کو جیتنے کے لئے استعمال میں لائے گی۔ اور اس طرح سے حالات کو اپنے موافق بنائے گی۔ وُہ کہتی ہے کہ لڑائی اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔ محبوب کو ہر حالت میں واپس لانا ضروری ہے چاہے اس کے لئے کئی جادُو ٹونے اور منتر کام میں لانے پڑیں۔

اِک[1] ٹُونا اچنبھا گاواں گی
مَیں رُٹھا یار مناواں گی
ایہہ[2] ٹُونا میں پڑھ پڑھ پھُوکاں، سُورج اگن جلاواں گی
اکھیّں کاجل کالے بادل، بھَواں سے آندھی لیاواں گی
ست[3] سمندر دِل دے اندر، دِل سے لہر اُٹھاواں گی

---

[1] مَیں ایک حیرت انگیز جادُو (ٹُونا) کر کے رُوٹھا ہُوا محبوب مناؤں گی۔

[2] یہ ٹُونا سُورج جیسی گرمی، کالے بادلوں کی بارش اور خوفناک آندھی کی طرح زبردست ہو گا۔

[3] مَیں دِل کے گہرے سمندروں میں سے پیار کی زبردست ترنگیں پیدا کرونگی۔

بجلی ہو کر چمک ڈراواں ۔ بادل ہو کر جاواں گی
عشق[1] انگیٹھی ہرل تارے ، چاند سے کفن بناواں گی
لامکان[2] کی پٹڑی اوپر ۔ بہہ کے ناد وجاواں گی
لائے سوآن میں شوہ گل اپنے ، نہ میں نار کہاواں گی
اک ٹونا اچنبھا[3] گاواں گی
میں رُٹھا یار مناواں گی

(نذیر احمد :- کلام بلھے شاہ۔
صفحہ ۱۰-۱۱)

---

[1] ہرل = ایک بوٹی۔ ستاروں کو ہرل سے تشبیہہ دی گئی ہے۔
[2] دیکھو صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱
[3] ڈاکٹر نذیر احمد نے امیر خسرو (۱۲۵۲ تا ۱۳۲۵) سے متعلقہ اسی قسم کا ایک ٹونا لکھے جانے کا اشارہ دیا ہے۔ اس ٹونے کے بول کچھ اس طرح ہیں۔

"آج ٹونا میں ایسا بناؤں گی۔
نظام الدین رنگیلے بنے کو، میں پائی باندھ بٹھاؤں گی۔"

اِک رانجھا مینوں لوڑی دا

مُرید کا اپنے مُرشد اور بُلھے شاہ کا عنایت شاہ سے عشق، ہیر رانجھا کے عشق کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ اُس عشق کی علامت ہے، جو رُوح کا خُدا کے ساتھ ابدی اور ازلی ہے۔ یہ عشق اُس وقت سے ہے جبکہ کائنات ابھی ظہور میں بھی نہیں آئی تھی۔ مُرید کے لئے اُس کے مُرشد کا مدِمقابل کوئی نہیں۔ اُس کو خوش کرنے کیلئے مُرید کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔

کافی کا آخری بند اِس گہری سچائی کو ظاہر کرتا ہے، کہ خُدا اور مُرشد ایک ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے، کہ مُرشد میں خُدا نے انسانی جامہ پہنا ہوا ہے۔ مُرشد اپنے مُرید میں خُدا کا عشق جگاتا ہے۔ اور اُسے اپنے ابدی مقام پر لے جاتا ہے۔

اک[1] رانجھا مینوں لوڑی دا

کُن فیکوُنوں[2] اگے دیاں لگیاں، نیہوں نہ لگڑا چوری دا

آپ[3] چھڑ جاندا نال مجھیں دے، سانوں بیلیوں موڑی دا

رانجھے جیہا مینوں ہور نہ کوئی، منتاں کر کر موڑی دا

---

[1] رُوح (ہیر) اپنے مُرشد (رانجھے) کے لئے بے قرار ہے۔

[2] کُن فیکون۔ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جس کا مطلب ہے رَبّ نے کہا "ہو جا" (کُن) اور ہو گیا (فیکوُن)۔ اشارہ تخلیق کے حکم کی طرف ہے۔ آپ اشارہ کرتے ہیں، کہ رُوح کا رَبّ کے ساتھ عشق تخلیقِ کائنات سے بھی پہلے کا ہے۔

[3] مُرید (ہیر) گلہ کرتا ہے کہ اس کا مُرشد (رانجھا) اس سے دُور رہتا ہے۔

مائیں[1] والیاں دے نین سلونے ، سوہا دوپٹہ گوری دا

اَحد[2] احمد وِچ فرق نہ بُلھیا، اِک رتی بھید مروڑی دا
اِک رانجھا مینوں لوڑی دا

فقیر محمد: کلیاتِ بُلھے شاہ
کافی نمبر ۹۔

---

[1] سلونے: خوبصورت، پُرکشش۔ مغرور محبوبہ کی آنکھوں میں زبردست کشش ہے اور خوبرو محبوبہ نے خوبیوں کا سُرخ دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے

[2] احد: رَبّ، احمد: مُرشِد۔ عربی فارسی حروفِ تہجّی میں اَحد سے احمد بناتے وقت "م" کی مروڑی بڑھ جاتی ہے۔ آپ اشارہ کرتے ہیں کہ مُرشِد رَبّ کا رُوپ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رب غیر متشکل (نراکار) ہے لیکن مُرشد میں وہی رَبّ متشکل (ساکار) یا مادّی جسم کے پردے میں چھپا ہُوا ہے۔

اِک نقطے وِچ گل مُکدی اے

اِس کافی کی دو طرح تشریح ہو سکتی ہے، ایک عام اور دُوسری رمزیہ۔ عام تشریح میں مرکزی نُکتہ آخری بند میں سامنے آتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ خدا سے وصال بذریعہ مُرشد ہی ہو سکتا ہے۔ دیکھو مُرشد عبدِ خُدائی ہو، منزل پر پہنچنے کے لئے باقی جو کچھ بھی ضروری ہو وُہ خُود بخود ہوتا جائے گا۔ جب مُرشد مِل جاتا ہے تو مُتلاشی کا دِل صاف ہو جاتا ہے۔ وُہ اپنی نفسانی خواہشات سے آزاد ہو جاتا ہے، اور اُسے عبادت کا صحیح طریق معلوم ہو جاتا ہے۔

بُلھے شاہ اُن تمام شغلوں کا ذِکر کرتا ہے جو متلاشیانِ حق اپناتے ہیں، لیکن جو سب فضول ہیں مُختصر طور پر یہ عمل ہیں زمین پر جھک جھک کے سجدے کرنا، طویل روزے رکھنا، چالیس دِن کی ریاضت، اور زیارت گاہوں پر جانے کیلئے پُرخطر راستے اختیار کرنا وغیرہ وغیرہ۔ مکّے کا حج کرنے والے لوگ بڑے جوش اور وَلولے کے ساتھ بار بار اپنا ماتھا زمین پر رگڑتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی جبینوں پر کالے داغ پڑ جاتے ہیں۔ ان نشانوں کو وُہ بہت پاکیزگی کی علامت مانتے ہیں۔ جب وُہ زیارت کر کے لَوٹتے ہیں، تو نیلے رنگ کے چوغے پہن لیتے ہیں۔ اِس سے وُہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اُنہوں نے غیر معمُولی مذہبی فضیلت حاصل کر لی ہے۔ دیگر مُسلمان پارسائی کے حِصّہ دار بننے کے لئے مکّہ سے واپس آئے اُن حاجیوں کو پیسے چڑھاتے ہیں۔

رمزیہ طور پر نُقطے کا مفہُوم اُس جگہ سے ہے جو دونوں آنکھوں کے پیچھے واقع ہے، اور جسے مُسلمان فقیروں نے نقطۂ سویدا کہا ہے۔ عبادت کا اصل فائدہ رُوح کو یکسُو کر کے جسم سے نکال کے نقطۂ سویدا کے مقام پر لے آنے میں ہے۔ اِس عمل کا رُوحانی مفہُوم "جیتے جی مرنا" کہا گیا ہے۔ جو اِس شغل میں کمال حاصل کر لیتا ہے، وُہ بے پایاں رُوحانی قوّت اور عارفانہ علم کا مالک بن جاتا ہے۔ اصل رُوحانی سفر اِس نُقطے سے شروع ہوتا ہے۔

اِک[1] نُقطے وِچ گل مُکدی اے

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد نے کلام بُلھے شاہ میں سجھاؤ دیا ہے کہ اگر لفظ ربّا ق ص۲۳۴ پر دیکھیں۔

بھنّڑ[1] نقطہ چھوڑ حساباں نُوں ، کر دُور کُفر دِیاں باباں نُوں
لاہ[2] دوزخ گور عذاباں نُوں ، کر صاف دِلے دیاں خواباں نُوں
گل ایسے گھر وِچ ڈھکدی[3] اے ، اِک نُقطے وِچ گل مُکدی اے
ایویں متھا زمین گھسائی دا ، لما پا محراب[4] دِکھائی دا
پڑھ[5] کلمہ لوک ہسائی دا ، دِل اندر سمجھ نہ آئی دا
کدی بات سچی وی لُکدی اے ، اِک نُقطے وِچ ....
کئی حاجی بن بن آئے جی ، گل نیلے جامے پائے جی
حج[6] ویچ ٹکے نے کھائے جی ، بھلا ایہہ گل کہنُوں بھائے جی
کدی گل سچی وی لُکدی اے ، اِک نُقطے وِچ ....

بقیہ:- فُٹ نوٹ :- نُقطہ قینچی والے "ق" سے لکھا جائے تو مطلب "مُختصر سی بات" بنے گا۔ اگر نکتہ "کرسی" والے "ک" سے لکھا جائے تو مطلب لطیف یا پُرمعنی بات بنے گا۔ دونوں حالتوں میں مُراد مختصر لیکن ضروری بات ہی ہے۔ وُہ نکتہ کیا ہے ؟ اِس نکتے کے دو پہلو ہیں۔ ایک دِل کے خوابوں کو صاف کرنا۔ خواب، دِل کی نفسانی خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں جب تک دِل خواہشوں سے پاک نہیں ہوتا، لمبے سفر، سخت چلے مُشکلات سے بھرے حج فضول ہیں۔ دُوسرا پہلو یہ ہے دِل خوابوں سے کیسے پاک ہو ؟ مُرشد کو پکڑ کر رَبّ کے عابد بن جائیں، تو غموں سے بے پروائی ہو جاتی ہے۔ دِل مستی یا خوشی سے بھر جاتا ہے۔ اور جنسی خواہشات کی میل دُور ہو جاتی ہے۔ اور من مکمل طور پر پاک ہو جاتا ہے ؎

پھڑ مُرشد عبد خدائی ہو ، وِچ مستی بے پروائی ہو
بے خواہش بے نوائی ہو ، وِچ دِل دے خوب صفائی ہو

حضرت انور علی رہتکی نے "اِک نکتے" کا مطلب "وحدت کی پہچان" دیا ہے۔ دیکھئے "قانونِ عشق" صفحہ ۲۰۸ تا ۲۱۲،

[1] اِس نکتے کو پکڑ لے۔ باقی جو کچھ ہے اُس کو کُفر سمجھ کر چھوڑ دے۔ [2] گور = قبر۔ موت اور دوزخ کا ڈر چھوڑ دے، اور من سے ہر طرح کے خیالات کو نکال دے ۔ [3] ڈھکدی = مناسب مناسب بات دِل کو صاف کرنے کی ہے ۔ [4] محراب = مسجد کی ڈاٹ۔ زمین پر ماتھا رگڑنے، لیٹ کر محراب کو سجدہ کرنے سے کیا فائدہ ہے (اگر دِل صاف نہیں)، [5] باہر سے کلمہ پڑھتے ہیں لیکن اندر نہ اِسکی سمجھ آتی ہے۔ نہ دِل پر اس کا اثر ہوتا ہے اس طرح لوگوں کی ہنسی کے سوائے کچھ نہیں ملتا۔
[6] لوگ حج کرتے ہیں پھر حج کا ثواب بیچ کر پیسے کما لیتے ہیں۔

اِک[1] جنگل بحریں جاندے نی، اِک دانہ روز دے کھاندے نی
بے[2] سمجھ وجود تھکاندے نی، گھر آون ہو کے ماندے نی
اینویں[3] چلیاں وِچ جِند سُکدی اے، اِک نُقطے وِچ ....

پھڑ مُرشد عبد خدائی ہو، وِچ مستی بے پروائی ہو
بے[4] خواہش بے نوائی ہو، وِچ دِل دے خوب صفائی ہو
بُلھا بات سچی کدوں رُکدی اے، اِک نُقطے وِچ ....

(فقیر محمد: کلیات بُلھے شاہ
کافی ۱۲)

---

۱ تا ۳ ے بحریں = سمندروں۔ وجود = جسم۔ ماندے = کمزور۔ چلّے = خلوت میں چالیس دِن تک تپ کرنا۔ کچھ لوگ جنگلوں میں اور سمندروں کے کناروں پر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ روزانہ ایک دانے پر گذارہ کرتے ہیں۔ وہ خود کو خوار کرتے ہیں۔
۴ ے بے نوائی = فقیری = بے پروائی

اِک نکتہ یار پڑھایا اے

اِس چھوٹی سی کافی میں بھی بُلھے شاہ اپنے مَن پسند مضمون 'خُدا کی ہمہ جائی' پر قلم آرائی کرتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھ کے لئے وُہ ہر شئے میں موجود ہے۔ عوام کے لئے خُدا اور انسان کے درمیان ایک گہری خلیج ہے، لیکن عارف کی نظر میں ہر انسان میں خُدائی عروج تک پہنچنے کا امکان ہے۔ سسّی کیلئے خُدا پنّوں کی شکل میں آیا، اور بُلھے شاہ کیلئے اس نے عنایت شاہ کی صُورت اختیار کی۔

اِک[1] نکتہ یار پڑھایا اے

[2] ع، غ، دی ہِکّا صُورت، ہِک نُقطے شور مچایا اے

اِک نکتہ.........

[3] سسّی دا دِل لُٹّن کارن، ہوت پنّوں بن آیا اے

اِک نکتہ.........

[4] بُلھا شوہ دی ذات نہ کائی، مَیں شوہ عنایت پایا اے

اِک نکتہ.........

فقیر محمد:- کُلیات بُلھے شاہ کافی ۱۰

---

[1] مُرشد نے یہ باریک بھید سمجھایا ہے۔

[2] ع اور غ، عربی، فارسی حروف تہجی کے دو حروف ہیں۔ ان دونوں کی شکل ملتی ہے فرق صِرف اتنا ہے کہ اگر ع کے اُوپر نُقطہ لگا دیں تو غ بن جاتا ہے۔ اِسی طرح خُدا اور مُرشد میں صِرف اتنا فرق ہے کہ خُدا نے مُرشد کی صُورت میں انسانی قالب اختیار کیا ہُوا ہے۔

[3] سسّی (رُوح) کا دِل جیتنے کیلئے ہوت (ربّ) پنّوں (مُرشد) بن کے آ گیا ہے۔

[4] وُہ محبُوب حقیقی قوموں، مذہبوں، مُلکوں، ذاتوں اور نسلوں سے بالاتر ہے۔ وُہ محبوب مجھے عنایت شاہ کی شکل میں مِلا ہے۔

اکھاں وِچ دِل جانی پیاریا

یہ کافی محبوب کے عشق اور اُسکے وِصال کی آرزو سے بھرپور ہے۔ اس میں مُتلاشی کا عشق خُدا کے لئے اور مُرید کا اپنے مُرشد کے لئے اشارتی ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ بُلھے شاہ کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہُوا جبکہ اس کا مُرشد عنایت شاہ اُس سے ناراض ہو گیا۔ اُسے راضی کرنے کے لئے بُلھے شاہ نے ایک ناچنے والی کا بھیس بنا کر بے پروائی کے انداز میں اُس کے آگے ناچنا شروع کر دیا۔ اِس کافی کے آخری بند میں اس بات کا اشارہ مِلتا ہے کہ یہ نظم اسی موقع کے سلسلے میں لکھی گئی تھی۔

اکھاں وِچ دِل جانی پیاریا، کیہی چیٹک[1] لائیا ای
مَیں تیرے وِچ نہیں جُدائی، ساتھوں آپ چُھپائیا ای
مجھیں آئیاں یار نہ آیا، پھُوک برہوں نُوں لائیا ای
مَیں نیڑے تینوں دُور کیوں تناایں، ساتھوں آپ چُھپائیا ای
وِچ[2] مصر دے وانگ زلیخا، گھونگھٹ کھول رُلائیا ای
تُوہ[3] بُلھے دے سر پر برقعہ، تیرے عشق نچائیا ای
اکھاں وِچ دِل جانی پیاریا، کیہی چیٹک لائیا ای

(فقیر محمد، کلیات بُلھے شاہ
کافی ۱۳)

---

[1] چیٹک = لگن، کِھچاؤ۔

[2] جس طرح زلیخا کو مصر میں اپنا جلوہ دکھا کر بے حال کیا تھا اُسی طرح مجھے کر رہے ہو۔

[3] بُلھے شاہ نے برقعہ اوڑھ کر اپنے آپ کو مُرشد سے چُھپا لیا ہے۔ اُس نے اپنے مُرشد کی خاطر ناچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ مصرع اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جبکہ عنایت شاہ بُلھے سے ناراض ہو گیا تھا۔ اور بُلھے شاہ نے ایک ناچنے والی کے لباس میں ناچ اور گا کر اُسے منانے کی کوشش کی تھی۔

اُلٹے ہور زمانے آئے

یہ کافی کئی وجوہات کے سبب اہم ہے۔ تواریخ میں کئی ایسے موڑ آتے ہیں جب وقت کے حالات میں انقلابات اور قطعی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شعرائے عموماً ایسے واقعات کے اشارے اپنی تصنیفات میں قلمبند کئے ہیں۔ یہ اشارے عام طور پر مبہم ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً کسی خصوصی واقعہ یا دور کا صاف صاف ذکر نہیں کرتے۔ البتہ یہاں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشارہ مغلیہ حکومت کے زوال اور سکھوں کے عروج کی طرف ہے جو کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں واقع ہوا۔ اس دور کو بلھے شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

یہ کافی صرف وقت کی سیاسی تبدیلیوں کا ہی ذکر نہیں کرتی، بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ کا بھی مؤثر نقشہ کھینچتی ہے۔ صاحب اوصاف کو پس منظر پھینک دیا گیا تھا۔ خوشامدی اور اخلاقی قدروں سے بے بہرہ لوگوں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

کافی کے آخری بند میں بلھے شاہ کہتے ہیں کہ یہ سب الٰہی منصوبہ کا اہم جزو ہے اور انسان اس میں کوئی خامی نہیں نکال سکتا۔

اُلٹے[1] ہور زمانے آئے ۔ تاں میں بھیت سجن دے پائے
کاں لگڑاں[2] نوں مارن لگے ۔ چڑیاں جُرّے[3] ڈھائے
گھوڑے چگن اروڑیاں ۔ اُتے گدھوں خوید[4] پوائے

---

[1] شاعر زمانے کے نشیب و فراز کا نہایت پُر معنی نقشہ پیش کرتا ہے۔ سماجی اور اخلاقی قدروں میں گراوٹ اور سیاسی اُتار چڑھاؤ کو شاعر رب کی رضا تسلیم کرتا ہے۔ گورو نانک صاحب نے بھی ایک طرف تو اپنے زمانے میں لوگوں پر ہوئے ظلم کی دردناک تصویر کھینچتے ہوئے خدا سے گلہ کیا ہے "ایتی مار پئی کُرلانے تیں کی درد نہ آیا" اور دوسری طرف وقت کی تبدیلی کو مالک کی رضا مانا ہے۔ "آپے جوڑ وچھوڑے آپے ویکھ تیری وڈیائی" (محلہ ا، صفحہ ۳۶۰) سائیں بلھے شاہ کی اس کافی میں بھی یہ دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔

[2] لگڑاں = باز۔ [3] جُرّے = باز۔ [4] خوید = سبز کھیت۔

آپنیاں وِچ اُلفت ناہیں، کیا چاچے کیا تائے
پیئو پُتراں اتفاق نہ کائی، دِھیّاں نال نہ مائے
سچیاں نوں پئے مِلدے دھکے، جھوٹھے کول بہائے
اُگلے[1] ہو کنگالے بیٹھے، پچھلیاں فرش وچھائے
بھوریاں[2] والے راجے کیتے، راجیاں بھیکھ منگائے
بُلھیا! حکم حضوروں آیا، تِس نوں کون ہٹائے
اُلٹے ہور زمانے آئے
تاں مَیں بھیت سجن دے پائے

(نذیر احمد۔ کلام بُلھے شاہ
صفحہ ۱۱۴)

---

[1] جو ترقی پر تھے وُہ کنگال ہو گئے ہیں۔ جو پچھڑے ہُوئے تھے وُہ شان و شوکت سے رہ رہے ہیں۔

[2] ڈاکٹر نذیر احمد نے " بھوریاں والے" اور "بھوریاں والے" دونوں طرح کے درس بارے رائے زنی کی ہے اور "بھوریاں والے" کا اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے۔

" بھوریاں والے یعنی غریب لوگ بادشاہ بن گئے اور بادشاہ فقیر ہو گئے۔ کئی مورخین یہاں سکھوں کے طاقتور ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اُلٹی گنگا بہائیو رے سادھو

اِس نظم میں گہرے رُوحانی معنی پوشیدہ ہیں۔ دریائے گنگا سے مُراد رُوح ہے جو آنکھوں کے مرکز سے اُتر کر سارے جسم میں پھیل گئی ہے۔ اِس پھیلی ہوئی رُوح کو روحانی شغل کے ذریعہ اُسی مرکز پر پہنچانے کا نام اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ آنکھوں کے مرکز یعنی نُقطۂ سویدا سے اصل رُوحانی سفر شروع ہوتا ہے جس کا اختتام رُوح کے خُدا میں جذب ہونے پر ہوتا ہے۔ خُدا کے نام کا ذکر اور مُرشد کی صُورت کا تصوّر اُس تیسری آنکھ میں پہنچنے اور رُوح کو وہاں قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ یہ تمام شغل عشق اور عقیدت کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ (پریم کی ٹُونی ہاتھ میں لیجو، گنجھ مروڑی پڑنے نہ دیجو) شیطانی طاقتیں راستے میں رُکاوٹیں ڈالیں گی، مگر استقلال سے ان پر عبُور پانا چاہیئے۔ (دِسپر لنٹیا) اِس سفر میں منزل پر پہنچنے کیلئے مُرشد کی مدد لازم ہے۔

اُلٹی گنگا بہائیو رے سادھو، تب ہر درشن پائے
پریم کی ٹُونی ہاتھ میں لیجو، گنجھ[1] مروڑی پڑنے نہ دیجو
گیان کا ٹنکلا دھیان کا چرخہ، اُلٹا پھیر پھِرائے
اُلٹے پاؤں پر کُنبھ کرن جائے، تب لنکا کا بھیدُ پائے
دِسپر لنٹیا بن پچھن باقی، تب انحد ناد بجائے
ایہہ گت[2] گور کی پیریں پاوے، گورکا سیوک تبھی سدائے
امرت منڈل مُوں تب ایسی دے، کہ ہری ہر ہو جائے
اُلٹی گنگا بہائیو رے سادھو، تب ہر درشن پائے

(فقیر محمد: کلیاتِ بُلھے شاہ۔ کافی نمبر ۱۵)

---

[1] گنجھ = گانٹھ۔ [2] اشارہ اندر مُرشد کے نُورانی صورت سے وصال کی طرف ہے۔ اندر مُرشد کا نُورانی جلوہ ظاہر ہونے پر ہی عابد مُرشد (معبُود) کا سچّا مُرید (گورسیوک) بنتا ہے۔ اِس کی گورُبھگتی مکمّل ہو جاتی ہے اور اس کی رُوح اندر کا روحانی سفر مُرشد کی رہنمائی میں طے کرنا شروع کر دیتی ہے۔

آماں بابے دی بھلیائی[6]

اِس کافی کے معنی، اگر اِسے کافی کہا جا سکے، غیر واضح ہیں۔ لیکن عام معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے طنزیہ انداز میں اپنے آباؤ اجداد یعنی حضرت آدمؑ اور حوا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر وُہ اُن کی خطا کو اُن کی 'بھلائی' بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُن کی 'بھلائی' اَب ہم پر نازل ہوئی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں ہم اُن کے کارناموں کے باعث سزا بھگت رہے ہیں۔

وُہ اُن کو اَبدی گنہگار تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے منع کرنے کے باوجود گندم چوری کی اور اُسے کھایا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اس وقت سے ہم مُصیبت میں مُبتلا ہیں۔ اُس کے مطابق آدمؑ کی اولاد جو شاعر کی ہمعصر ہے چھوٹی سی بات پر اپنے مفاد کے لئے جھگڑا مول لے لیتی ہے۔ ہر کُنبہ کا رُجحان دوسرے کُنبہ کی طرف لڑائی کا ہے۔ یہ اُس بیج کا نتیجہ ہے جو ہمارے بزرگوں نے بویا۔

آماں بابے دی بھلیائی[1]
اوہ ہُن کم اساڈے آئی

آماں بابا چور دُھراں دے،[2] پُتر دی وڈیائی
دانے اُتوں گُت بگُتی[3]، گھر گھر پئی لڑائی

---

[1] آماں بابے سے شاعر کی مُراد حوا اور آدمؑ سے ہے۔ 'بھلیائی' کا لفظ طنزاً استعمال کیا گیا ہے۔ آدمؑ اور حوا کی 'بھلائی' خُدا کی حکم عدولی ہے جس کا خمیازہ اِنسان بُھگت رہا ہے۔

[2] فقیر محمد کی کتاب میں سبق "چور دوراہاں دے" ہے۔ مگر ڈاکٹر نذیر احمد نے "چور دُھراں دے" لکھا ہے جو زیادہ بامعنی ہے اور یہی سبق یہاں دیا گیا ہے۔ آدمؑ اور حوا ازلی چور ہیں۔ بیٹے کی بڑائی یا عظمت اِسی میں ہے کہ اس کے آباؤ اجداد شروع سے چور تھے۔ 'بھلیائی' کی طرح 'وڈیائی' لفظ بھی طنزیہ استعمال ہُوا ہے۔

[3] گُت بگُتی = عورتیں جب لڑتی ہیں۔ تو ایک دوسرے کی چوٹیاں پکڑ لیتی ہیں۔ شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ اناج کے دانے کی چوری کی وجہ سے جھگڑا بڑھ گیا، جس کا اثر اَب ہر اِنسان پر پڑ رہا ہے۔

اساں[1] قضیئے تداہیں جاپے، جد کنک اوہناں لڑکائی
کھائے[2] خیرا تے پھاٹیئے جُمّا، اُلٹی دستک لائی
طوطے[3] مار باغاں تھیں کڈھے، اُتو رہن اُسے جائی
آہاں بابے دی بھلیائی
اوہ ہُن کم اساڈے آئی

فقیر محمد: کُلیات بُلھے شاہ
کافی ۱۶

---

[1] جنّت میں آدم کے گندم چوری کرنے کی وجہ سے ہمیں یہ قضیئے بھگتنے پڑتے ہیں۔
[2] یہ الٹا کھیل ہے جس میں کرتا کوئی (خیرا) ہے اور بھرتا کوئی اور (جُما) ہے۔
[3] طوطے (خوبصورت یعنی نیک انسان) باغ سے نکال دیئے اور اُلّو (بدے یعنی بد انسان) وہاں رہنے دیئے۔

ایس نیہوں دی اُلٹی چال

یہ بُلھے شاہ کی اُن بہت سی کافیوں میں سے ایک ہے جن کا تعلق خُدا کے اُن مشہور عاشقوں سے ہے جنہیں راہِ عشق میں کئی مُصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ صابر کو نہ صِرف اپنی دولت اور دُنیاوی مقبوضات سے محروم رکھا، بلکہ اُسے اپنی صحت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ وُہ ایک نامُراد مہلک بیماری کا شکار ہو گیا، اور اُس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ شیطان نے اُسے لالچ دیا، کہ اس کا سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے اگر وُہ خدا کا عشق چھوڑ دے لیکن صابر نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

زکریا کا سَر آرے سے کاٹ دیا گیا، جو اُس کے عشقِ الہٰی کی قیمت تھی۔ یحییٰ کے سر کو خنجر سے علیحدہ کر دیا گیا۔ منصُور کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ سلیمان جس کا حُکم پریوں پر بھی چلتا تھا، اور جو دانا کہلاتا تھا، اُس کی انگوٹھی گُم کرائی گئی جس میں طلسمی طاقت تھی۔ اس کو تنوّر میں لکڑیاں ڈالنے کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ تمام اذیتیں اُسے خُدا کے عشق کی وجہ سے اُٹھانی پڑیں۔

کافی کے آخری بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ مندرجہ بالا عظیم عاشقوں کے دُکھوں کی رُوداد کے مدِنظر انسان کی بہتری اِسی بات میں ہے کہ وُہ اپنا مُنہ بند رکھے اور کسی قسم کی شیخی نہ بگھارے۔

ایس نیہوں دی اُلٹی چال

صابر نے جد نیہوں لگایا، ویکھ پیا نے کیہہ دکھلایا
رَگ رَگ اَندر کرم چلایا، زور آور دی گل محُال
زکریا نے جد پایا نہارا، جس دم وجیا عشق نقارا
دھریا سِر تے تِکھا آرا، کیتا ایڈ زوال
حَدوں یحییٰ نے پائی جھاتی، رَمز عشق دی لائی کاتی
جلوہ دِتا اپنا ذاتی، تن خنجر کیتا لال
آپ اشارہ اکھ دا کیتا، تاں مدھوا منصُور نے پیتا
سُولی چڑھ کے درشن لیتا، ہویا عِشق کمال

سُلیمان نُوں عِشق جو آیا ، مُندرا اُس توں چا گوایا
تخت نہ پَریاں دا پھیر آیا ، جھٹ جھوکے پیا بجال
بُلھے شاہ ہُن چُپ چنگیری ، نہ کر ایتھے ایڈ دلبری
گل نہ بن دی تیری میری
چھڈ دے سارے وہم خیال

{فقیر محمد :۔ کلیات بُلھے شاہ
کافی نمبر ۲۰}

اَیسا جگیا گیان پلیتا

وُہ عِلم جو عشق سے پَیدا ہوتا ہے، رُوحانی طور پر اتنا بلند و بالا کرنے والا ہے کہ وُہ تمام مذہبی اور قومی بندھنوں سے انسان کو اُوپر اُٹھا دیتا ہے۔ بُلھے شاہ اعلانیہ کہتا ہے کہ وُہ نہ ہِندُو ہے نہ ہی مسلمان، بلکہ ایک عاشق ہے۔ اور عشق کے ذریعے ہی خُدا مِل سکتا ہے۔

کافی کے دُوسرے بند میں بُلھے شاہ شرعی واعظ کی سخت مذمت کرتا ہے، جو بھولے بھالے لوگوں کو رسموں، رواجوں کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ اُس کی عیّاریوں کا پردہ خُدا کا عاشق ہی فاش کرتا ہے، کیونکہ صِرف اُس نے ہی حقیقت (خُدا) کو پایا ہے۔

اَیسا[1] جگیا گیان پلیتا

نہ[2] ہم ہِندُو نہ تُرک ضرُوری، نام عشق دی ہے منظُوری

عاشق نے ہر جیتا، ایسا جگیا گیان پلیتا

وِیکھو[3] ٹھگّاں شور مچایا، جمنا مرنا چا بنایا

مُورکھ[4] بھُلّے رَولا پایا، جس نُوں عاشق ظاہر کیتا

اَیسا جگیا گیان پلیتا

بُلھا[5] عاشق دی بات نیاری، پریم والیاں بڑی کراری

مُورکھ[6] دی مَت ایویں ماری، واک سخن چُپ کیتا

اَیسا جگیا گیان پلیتا

(فقیر محمد: کُلیات بُلھے شاہ کافی ۲۱)

---

[1] پیچھے عشق سے وُہ عرفان ہوا جس کی روشنی نے اندھیرا دُور کر دیا۔ [2] ہِندُو مُسلمان کا فرق مِٹ گیا اور صِرف عشق کو منظوری مِلی۔ [3] اِن ٹھگوں (مُلّاؤں، قاضیوں و پنڈتوں) نے ایسی شریعتیں جاری کی ہیں جو آواگون کا مُوجب بنی ہیں۔ [4] جاہل اُن کے زیرِ اثر آ گئے، لیکن عاشقوں نے اُن کا پردہ فاش کر دیا۔ [5] عاشقوں کی بات عاشقوں کو ہی اچھی لگتی ہے۔ [6] لیکن عاشقوں کی بات سُن کر نادان کی عقل ماری جاتی ہے۔ دانا لوگوں نے اپنا مُنہ بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

ایہہ اچرج سادھو کون کہاوے

سائیں بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم کے رنگ نیارے ہیں۔ اُس محبوبِ حقیقی کی رموز کو سمجھ پانا ناممکن ہے۔ جو کوئی اُس سے واصل ہو جاتا ہے، اُس کے لئے "ناد اور بانگ" کا تفرقہ ختم ہو جاتا ہے، اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں کلمۂ الٰہی کے ہی نام ہیں۔ اس حالت میں ختم اور مومن کا فرق کافور ہو جاتا ہے۔ اور ہر جگہ ایک ہی الٰہی نور برستا دکھائی دیتا ہے۔

ایہہ[1] اچرج سادھو کون کہاوے، چھِن چھِن رُوپ کِتے بن آوے
مکہ[2] لنکا سہدیو کے بھیت، دوئی کو ایک بتاوے
جب[3] جوگی تُم وصل کروگے، بانگ کہے بھاویں ناد وجاوے
بھگتی[4] بھگت نتارو ناہیں، بھگت سوئی جیہڑا من بھاوے
ہر[5] پرگٹ پرگٹ ہی ویکھو، کیا پنڈت پھر بید سُناوے
دھیان[6] دھرو ایہہ کافر ناہیں، کیا ہندو کیا ترک کہاوے
جب دیکھوں تب اوہی اوہی، بُلھا شوہ ہر رنگ سماوے
ایہہ اچرج سادھو کون کہاوے، چھِن چھِن رُوپ کِتے بن آوے

(فقیر محمد: کلیات بُلھا، نظم ۱۰۵، صفحہ ۲۴۴)

---

[1] اس عارف کو، جو محبوبِ حقیقی میں جذب ہو چکا ہے، کیا کہہ کر پکاریں؟ وہ محبوب لحہ بہ لحہ نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔

[2] سائیں بُلھے شاہ نے انسانی وجود کو مکہ بھی کہا ہے اور لنکا بھی۔ شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سب قالبوں اور عبادت گاہوں میں ایک ہی محبوب چھپا ہوا ہے (دیکھئے کتاب کا صفحہ ۲۰۵)

[3] جب اپنے اندر خدا سے ملاپ کر لوگے، تو یہ پتہ چل جائے گا کہ اس انحد شبد کو ہی مسلمان بانگ اور ہندو ناد کہتے ہیں۔

[4] عابد اور عبادت میں تمیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ سچا عابد وہ ہے جو خدا کو پسند ہے۔

[5] جب وہ ہری (خدا) سب جگہ سمایا ہوا دکھائی دیتا ہے، تو پھر پنڈت وید وں میں سے کیا پڑھ کر سنا رہا ہے۔

[6] غور سے دیکھو کوئی بھی کافر نہیں ہے، خواہ اُسے ہندو کہہ کر بلایا جائے یا مسلمان کہہ کر۔

ایہہ دُکھ جا کہوں کِس آگے

محبُوب سے جُدائی کا دُکھ اتنا ہی شدید ہے جتنی کہ اُس کے وصال کی خُوشی۔اس کافی میں بُلّھے شاہ نے فُرقت کے غم کا بیان کیا ہے۔عالمِ فُرقت میں روم روم زخم کی طرح درد کرتا ہے۔ عاشق کی ہر رات بیداری کی رات ہے۔اُس کی ہر رات آنسو بہاتے اور وصال کی آرزُو کرتے گذر جاتی ہے۔عاشق اپنے محبُوب کی خوشی کیلئے کچُھ بھی کرنے کو تیار ہے۔لیکن اُسے معلُوم نہیں کہ اس کا محبُوب کس بات سے خوش ہو گا۔پرانی یادوں میں کھویا ہُوا عاشق ماضی کی اُن گھڑیوں کو یاد کرتا ہے جب کہ محبُوب نے اُس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا۔یہ مُعاملہ ہنسی کھیل میں شرُوع ہُوا تھا لیکن بعد ازاں اُس نے سنجیدہ صُورت اختیار کر لی۔

اِس کافی سے ایسا لگتا ہے کہ عاشِق کے دِل میں خدشہ ہے کہ اس کے کسی فعل نے محبُوب کو ناراض کر دیا ہے۔کافی کے اختتامیہ بند میں شاعر اپنے محبُوب سے واپس آنے کی التجا کرتا ہے۔اس کے عوض وُہ اپنا سب کچُھ۔جسم،دِل،دولت اور زندگی۔قربان کرنے کیلئے تیار ہے۔

ایہہ[1] دُکھ جا کہوں کِس آگے
رُم رُم گھاہ پریم سے لاگے

سِکّت[2] سِکّت ہے رَین وہانی، ہمرے پیا نے پیڑ نہ جانی
کیہ جانوں پیا کیا مَن بھانی

بِلکّت[3] بِلکّت رَین وِہاسی، ہاسے دی گل پے گئی پھانسی
اِک[4] مرنا دُوجا جگدی ہانسی

---

[1] پیار کے زخموں کا دُکھ کس کے آگے کہوں؟

[2] تڑپتے تڑپتے رات بیت گئی۔محبُوب نے میرا دَرد نہ پہچانا۔

[3] میں نے بےچینی میں رات بسر کی ہے۔ہنس ہنس کر لگائی گئی محبت اَب گلے کی پھانسی بن گئی ہے۔

[4] یہاں ہجر کے غم میں جان جا رہی ہے اور اِدھر لوگ ہنسی اڑا رہے ہیں۔

کرت بھرت نت موہی رے موہی۔ کون کرے موہے سے دلجوئی[1]
شام پیا مَیں دیتی ہُوں دھروئی
دُکھ جگ کے موہے پُوچھن آئے[2]، جن کے پیا پردیس سدھائے
نہ پیا آئے نہ پیا آئے۔ ایہہ دُکھ جا کہوں کس جائے
بُلھا شاہ گھر آ پیار یا، اِک گھڑی کے کرن گزار یا
تن من دھن جیا تیں پروار یا
ایہہ دُکھ جا کہوں کس آگے۔ رُم رُم گھاہ پریم کے لاگے
(فقیر محمد: کلیات بُلھے شاہ
کافی ۲۳)

۱۔ مجھے کون تسلی دے؟ اے پیارے! مَیں تیرے پیار کی دہائی دیتی ہُوں۔
۲۔ پریتم سے جُدائی کی وجہ سے ساری دُنیا کے دُکھ میری مزاج پُرسی کے لئے آئے ہیں۔ یعنی دُکھوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔

بَس کرجی ہُن بس کرجی

اِس کافی میں بظاہر ایک شوہر اپنی بیوی سے کسی بات پر ناراض ہو گیا ہے اور اپنے آپ کو اس کی نظروں سے چھپا لیا ہے۔ اُس کی بیوی کو وُہ خوشگوار یادیں ستاتی ہیں جو اُس کے خاوند کے وصال سے وابستہ ہیں۔ اُس کے دِل میں اپنے خاوند کے منانے کی اُمنگیں اُٹھتی ہیں۔ وُہ ہر طرح کی کوشش سے اُس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ رمزیہ طور پر کافی کا مفہوم یہ بھی ہے کہ خُدا انسان کے اُس کے سانس سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن اُس کی خودی اور گناہوں کے باعث اُس سے پوشیدہ رہتا ہے۔ وُہ خُدا سے مِل سکتا ہے بشرطیکہ وُہ اپنے عیب چھوڑ دے۔ پچھلے گناہوں پر شرمسار ہو، آگے کے لیئے توبہ کرے اور اس سے ملنے کے لیئے دِل میں سچی تڑپ پیدا کرلے۔

بَس کرجی[1] ہُن بس کرجی
اِک بات اساں نال ہَس کرجی

تُسیں دِل میرے وِچ وسدے ہو
ایویں ساتھوں دُور کیوں نسدے ہو
نالے[2] گھت جادُو دِل کھسدے ہو

ہُن کِت ول جاسونس کرجی
بس کرجی ہُن بس کرجی

تُسیں موئیاں نُوں مار نہ مُکدے سی
کھِدو وانگ کھونڈی نِت کُٹدے سی
گل کردیاں دا گل گُھٹ دے سی

---

[1] محبوب کسی بات سے ناراض ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ محبوبہ التجائیں کرتی، کہ آپ مجھے بہت سزا مِل چکی ہے۔ اَب تُم ناراضگی چھوڑ کر میرے ساتھ ہنس کے بات کرو۔

[2] جادُو گھت کے = جادُو ڈال کر، دِل کھسدے ہو = دِل کو کھینچتے ہو۔

ہُن نیہ لگاؤ کسّ کر جی
بس کر جی ہُن بس کر جی

تُسیں چھپدے ہو اساں پکڑے[1] ہو
اساں نال زُلف دے جکڑے ہو
تُسیں اجے چھپن نوں تکڑے ہو

ہُن جان نہ ملدا نسّ کر جی
بس کر جی ہُن بس کر جی

بُلّھا[2] شوہ میں تیری بردی ہاں
تیرا مُکھ ویکھن نوں مردی ہاں
نِت سَو سَو منتاں کردی ہاں

ہُن[3] بیٹھ پنجر وِچ دھس کر جی
بس کر جی ہُن بس کر جی

(فقیر محمد: کلیات بُلّھے شاہ
کافی ۲۵)

---

[1] ہم نے تمہیں پیار کی قید میں پھانس لیا ہے۔
[2] بردی: غلام، باندی: ، مردی ہاں: قربان جاتی ہوں۔
[3] پنجر: وجود، جسم۔ یعنی اب میرے اندر دھنس کر بیٹھ جاؤ کہ پھر نکل نہ سکو۔

بُلھا کیہہ جانے ذات عشق دی کون

اس خوبصورت نغمۂ عشق میں بُلھے شاہ ہیر کی زبانی عشق کی فطرت کا بیان کرتا ہے۔ رانجھا کے عشق میں ہیر نہ صرف گھر کے کام کاج بھول جاتی ہے بلکہ اپنے ماحول سے بھی بے خبر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ سو سکتی ہے اور نہ جاگ کر اس کے دل کو قرار آتا ہے۔ بظاہر وہ رانجھا کو بُرا بھلا کہتی ہے۔ لیکن دل ہی دل میں اس کیلئے دعائیں مانگتی ہے۔ اس طرح عشق کی ایسی زبان میں وہ لوگوں سے اپنے دل کا راز چھپانا چاہتی ہے۔
کافی کے آخری شعر میں بُلھے شاہ اشارہ کرتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کہیں دور نہیں۔ وہ جنگلوں اور بیابانوں میں نہیں ملتا۔ وہ عاشق کے دل کے اندر ہی بستا ہے۔

۱۔ بُلھا کیہہ جانے ذات عشق دی کون
۲۔ نہ سوہاں نہ کم بکھیڑے ونجے جاگن سون
۳۔ رانجھے نوں میں گالیاں دیواں، من وچ کراں دعائیں
۴۔ میں تے رانجھا اکو کوئی، لوکاں نوں ازمائیں
۵۔ جس بیلے وچ بیلی دسے، اُس دیاں نواں بلائیں
۶۔ بُلھا شوہ نوں پلّے چھڈکے، جنگل ول نہ جائیں
بُلھا کیہہ جانے ذات عشق دی کون ۞

(کلیاتِ بُلّھا: کافی ۲۶)

۱؎ عشق کی کوئی ذات نہیں ہے۔ خدا کا پیار قوموں، مذہبوں، ملکوں، رنگوں، نسلوں اور ذاتوں پاتوں کی قید سے آزاد ہے۔ ۲؎ سوہاں : خبریں۔ ونجے : بھول جانا۔ یعنی عشق میں اپنے آپ کی اور کام کاج کی سوجھ بوجھ نہیں رہتی۔ ۳؎ گالیاں : طعنے۔ ہیر ظاہری طور پر تو رانجھے سے گلے شکوے کرتی ہے لیکن اندر سے اس کا دل رانجھے کے پیار سے لبریز ہے۔ یہ بڑا خوبصورت بیان ہے۔ عاشق کے گلے شکوے اسکے پیار کی نشانی ہوتے ہیں۔ ۴؎ میرا محبوب کے ساتھ جھگڑا ظاہری اور بناوٹی ہے۔ ہم لوگوں کو آزمانے کے لئے جھگڑے کا دکھاوا کرتے ہیں، لیکن اندر سے ایک ہی ہیں۔ ۵؎ بیلے : اجاڑ بیابان۔ جس بیابان میں میرا محبوب رہتا ہے میں اس پر قربان جاتی ہوں۔ ۶؎ محبوبِ حقیقی اندر ہے اس سے منہ موڑ کر جنگلوں و بیابانوں میں اسکی تلاش کرنا فضول ہے۔ آپ نے ایک اور کافی میں کہا ہے ؎
"پریتم پاس تے ٹولنا کس نوں، بھُل گیا سکھر دوپہری"

بُلّھا کیہہ جاناں مَیں کَون ؟

یہ کافی بُلھے شاہ کی مشہور ترین کافیوں میں سے ہے۔ انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ کافی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ فلسفیوں اور شاعروں نے یہ سوال عام کیا ہے " مَیں کہاں سے آیا ہُوں، اور مجھے کہاں جانا ہے" ؟ لیکن یہ سوال بہت کم پُوچھا گیا ہے کہ " مَیں کون ہُوں، یعنی یہ 'مَیں' جو آنا جانا ہے، کیا ہے" ؟

" مَیں کون ہُوں" ؟ سوال کے جواب میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ وُہ کسی جماعت یا گروہ سے بندھا ہُوا نہیں ہے۔ وُہ نہ مومن ہے اور نہ ہی کافر۔ نہ وُہ پاک ہے اور نہ ہی پلید۔ وُہ کسی مذہبی کتاب کا پیرو کار نہیں۔ نہ وُہ سویا ہُوا ہے، نہ وُہ جاگتا ہے۔ وُہ شادی غمی دونوں حالتوں سے مبرا ہے۔ یہ تمام امتیاز محض اتفاقیہ ہیں، یعنی کسی دُوسری چیز پر مبنی ہیں۔ لیکن اُس کی ذات ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنے آپ میں کامل ہے یعنی کسی اور چیز پر مبنی نہیں۔

آگے چل کر بُلھے شاہ کہتا ہے کہ وُہ نہ پانی سے اور نہ مٹی سے، نہ آگ سے اور نہ ہَوا سے بنا ہے۔ اس کا تعلق نہ ایک مُلک سے ہے نہ دوسرے سے۔ وُہ نہ عربی ہے نہ لاہوری۔ نہ ہندی ہے، نہ تُرکی اور نہ ہی پشوری، یعنی وُہ کسی ایک مذہب سے وابستہ نہیں ہے۔ دراصل مذہب کے معاملے میں وُہ کسی روایتی اور تنظیمی صُورت میں یقین نہیں رکھتا۔ وُہ تمام عناصر جن سے انسان بنایا گیا ہے مادی ہیں، اِس لئے فانی ہیں۔ لیکن اُس (خُدا) کی ذات لافانی ہے۔

کافی کے آخری بند میں یہ بات کُھل کر انسان کے سامنے آتی ہے کہ وُہ اصل میں کیا ہے؟ اور وُہ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی اصلیت نہ اُس کا جسم ہے اور نہ ہی نفس، بلکہ رُوح ہے۔ جب انسان کی رُوح پر پڑے مادیت اور اعمال کے تمام غلاف اُتر جاتے ہیں تو رُوح فقط رُوح رہ جاتی ہے۔ رُوح لافانی ہے۔ وقت اور مقام کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وُہ پیدائش و موت، عرُوج و زوال کی حالتوں سے بالاتر ہے۔ وُہ ذاتِ مُطلق کی ایک شعاع ہے، امرِ ربی ہے، اور واپس اُسی حقیقت میں مِل جاتی ہے۔ اِسی مفہوم کے پیشِ نظر بُلھے شاہ کہتا ہے کہ وُہ آغاز بھی ہے اور انجام

بھی۔ وُہ سوائے اُس واحدِ مطلق کے کسی کو نہیں پہچانتا۔" اوّل آخر آپ نوں جاناں۔
نہ کوئی دُوجا ہور پچھاناں"

بُلھا کیہہ جاناں میں کون

نہ میں مومن وچ مسیتاں، نہ میں وِچ کُفر دِیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وِچ پلیتاں، نہ میں مُوسیٰ نہ فرعون۔ بُلھا کیہہ جاناں۔۔۔۔
نہ میں اندر بید کتاباں، نہ وِچ بھنگاں نہ شراباں
نہ وِچ رِنداں مست خراباں، نہ وِچ جاگن نہ وِچ سون۔ بُلھا کیہہ جاناں۔۔۔۔۔۔
نہ وِچ شادی نہ غمناکی، نہ[1] میں وِچ پلیتی پاکی
نہ[2] میں آبی نہ میں خاکی۔ نہ[3] میں آتش نہ میں پَون بُلھا کیہہ جاناں۔۔۔۔۔۔
نہ میں عربی نہ لاہوری، نہ میں ہندی شہر نگوری
نہ ہندو نہ تُرک پشوری، نہ میں رہندا وِچ ندون۔ بُلھا کیہہ جاناں۔۔۔۔۔۔
نہ میں بھید مذہب دا پایا، نہ میں آدم حوّا جایا
نہ میں اپنا نام دھرایا۔ نہ وِچ بیٹھن نہ وِچ بھَون۔ بُلھا کیہہ جاناں۔۔۔۔۔۔
اوّل آخر آپ نوں جاناں۔ نہ کوئی دُوجا ہور پچھاناں
مَیں تھوں ہور نہ کوئی سیاناں۔ بُلھا شوہ کھڑا ہے کون

بُلھا کیہہ جاناں میں کون

(فرید محمد؛ کلیات، کافی ۲۷)

---

[1] پلیتی = غلاظت۔ پاکی = پاکیزگی۔
[2-3] میں پانی، مٹی، آگ اور ہوا یعنی پانچ عناصر کی پیدائش نہیں ہوں۔
[4] رُوح نہ جوڑ ہے کہ حرکت نہ کر سکے۔ اور نہ ہی رُوح کی بنیادی خصلت پر آواگون (تناسخ) کا اثر ہوتا ہے۔

بُلّھے نُوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں

اَدب میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں ایک کلاسیکی نظم زندگی کے کسی اصل واقعہ سے منسُوب ہو۔ یہ ایک ایسی ہی نظم ہے۔ یہ نہ صِرف اچھی شاعری کی ایک مثال ہے، بلکہ بُلّھے شاہ کی زندگی کے ایک اہم واقعہ سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ جب وُہ عنایت شاہ کا مُرید بن گیا تو اُس کے رشتہ دار جنہیں اپنی اُونچی ذات کا غرور تھا، اُسے لعنت ملامت کرنے لگے۔ اُنہوں نے اِسے نہ صرف اپنی بے عزتی سمجھا، بلکہ حضرت محمدؐ صاحب اَور حضرت علیؑ کے تئیں بھی ذِلّت کا باعث جانا، کیونکہ بُلّھے شاہ بحیثیت سیّد کے اُن کی حد سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے طنزیہ فقروں کے جواب میں بُلّھے شاہ نے کہا کہ وُہ اُونچی ذات کا کہلانے کے حق کو ترک کرنے کے لئے تیار ہے۔ اِس کی جگہ وُہ نیچی ذات کا ارائیں کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے، کیونکہ اس کا مُرشد اِس ذات سے ہے۔ تاہم وُہ اپنے نکتہ چینوں کو کہتا ہے کہ وُہ اِس واقعہ کو خُدائی رضا تسلیم کریں۔ بُلّھے شاہ اصل میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ خُدا اپنی رضائے مطلق سے عرفانِ الٰہی کا تحفہ جس کو چاہے عطا کرتا ہے۔ وُہ کئی بار یہ فضیلت ادنےٰ مرتبہ لوگوں کو بھی بخشتا ہے، اَور اعلیٰ دُنیاوی مرتبہ کے لوگوں کو اپنے آپ سے دُور رکھتا ہے۔

بُلّھے نُوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں
"من لے بُلّھیا ساڈا کہنا، چھڈ دے پلّا رائیاں[1]
آل نبیؐ اَولادِ علیؑ نُوں، نُوں کیوں لیکاں لائیاں[2]؟
جیہڑا[3] ساڈوں سیّد سدّے، دوزخ مِلن سزائیاں

---

[1] رائیاں = ارائیں یعنی حضرت شاہ عنایت۔

[2] لیکاں لائیاں = بدنام کیا۔

[3] سائیں بُلّھے شاہ کہتے ہیں کہ اُس ذات پات پر لعنت ہے اَور وُہ دوزخ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کوئی سانوں رائیں آکھے ، بہشتی پینگھاں پائیاں"
رائیں سائیں سبھن تھائیں ، رَبّ دیاں بے پروائیاں[1]
سوہنیاں پرے ہٹائیاں تے کوجھیاں لے گل لائیاں
جے توں لوڑیں باغ بہاراں ، چاکر ہو جا رائیاں
بلھے شاہ دی ذات کیہہ پچھنیں؟[2]
شاکر ہو رضائیاں

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ
صفحہ ۱۹)

بقیہ:- فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۴ سے آگے :- جانے کا باعث ہوتی ہے، جو انسان کو مرشدِ کامل سے دور رکھتی ہے۔ جو مرشد کی ذات ہے وہی میری ذات ہے۔ کبیر صاحب کہتے ہیں، کہ طالب کا تعلق مرشدِ کامل کے خاکی قالب کے اندر کام کر رہے الٰہی نور سے ہے۔ ؎

ذات نہ پوچھو سادھ کی پوچھ لیجئے گیان، مول کرو تلوار کا پڑی رہن دو میان"

[1] وہ بے پروا مالک ہر جگہ سمایا ہوا ہے۔ اس نے ارائیں (حضرت عنایت شاہ) کا روپ اختیار کر لیا ہے۔
[2] شاکر = شکر گزار، صابر۔ رضائیاں = رضا میں رہنا۔

بنسی اچرج کاہن بجائی

اِس کافی میں تصوّف کی ایک گہری رمز پنہاں ہے۔ بانسری کی علامت جو بھگوان کرشن کے نام کے ساتھ اور یہاں رانجھا سے منسوب کی گئی ہے، ایک بلند رُوحانی طبق (عالمِ لاہوت) کی موسیقی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بُلھے شاہ کہتا ہے کہ ہر ایک شخص بانسری کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کا راز اُسی کو معلوم ہے جو اپنے اندر نغمۂ الہٰی کو سُنتا ہے ؎

جو کوئی انحد دی سُر پاوے، سو اِس بنسی دا شیدائی

جو کوئی عرفان کے لئے کاوش کرتا ہے، اُسے وُہ پالیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان پُورا تردد کرے اور ٹھیک سمت میں بڑھے۔ حالانکہ بانسری کی کئی سُریں ہیں، لیکن ایک واحد سُر (نغمۂ الہٰی) اِن سب میں کام کرتی ہے۔ (اِکّو سُر سب وِچ دم مارے)

آخری بند میں بُلھے شاہ یاد دِلاتا ہے کہ خدا دُور نہیں، اگر ہم کلمہ سے تعلق ٹوٹنے نہ دیں۔ (رکھیں کلمے نال بیوپار) اگر ایسا ہو تو مصیبت کے وقت (بوقتِ موت) مُرشد ہماری سنبھال کرے گا۔

بنسی اچرج کاہن بجائی

بنسی والیا چاکا رانجھا
تیرا سُر سب نال ہے سانجھا
تیریاں موجاں ساڈا مانجھا

ساڈی سُرتیں آپ ملائی

بنسی والیا کاہن کہاویں
شبد انیک انوپ سناویں
اکھیاں دے وچ نظر نہ آویں

کیسی بکھڑی کھیڈ رچائی

بنسی سب کوئی سُنے سناوے
ارتھ ایہدا کوئی وِرلا پاوے
جو کوئی اَلف دی سُر پاوے
سو اِس بنسی دا شیدائی

سُنیاں بنسی دیاں گھنگھوراں
کُوکاں تن مَن وانگوں موراں
ڈِٹّھیاں اُس دیاں توڑاں جوڑاں
اِک سُر دی سب کلا اُٹھائی

اُس بنسی دا لمّا لیکھا
جس نے ڈھونڈا اُس نے دیکھا
ساری اُس بنسی دی ریکھا
ایس وجودوں صفت اُٹھائی

اِس بنسی دے پنج ست تارے
آپو اپنی سُر بھردے سارے
اِکّو سُر سب وِچ دم مارے
ساڈی اُس نے ہوش بُھلائی

بُلّھا پیج پئے تکرار
بُوہے آن کھلو تے یار
رکھیں کلمے نال پیار
تیری حضرت بھرے گواہی، بنسی اپڑج کاہن بجائی

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۲۸)

بھانویں جان نہ جان وے

مُرید اپنے مُرشِد سے التجا کرتا ہے کہ وُہ اس کے گھر کے آنگن میں آجائے، خواہ وُہ اس کے دِل کی خستہ حالت کو جانتا ہے یا نہیں۔ بُلّھے شاہ ہیر اور رانجھا کی تمثیل استعمال کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ جیسے رانجھا دُنیا کی نظر میں محض چرواہا تھا، مگر ہیر کو دِل و جان سے عزیز تھا۔ اسی طرح عنایت شاہ دُنیا کے لئے صِرف ایک معمولی ارائیں تھا۔ لیکن بُلّھے شاہ کا وُہ دین و ایمان سب کچھ تھا۔ جس طرح ہیر نے رانجھے کی خاطر اپنے والدین کو چھوڑ دیا، اسی طرح عنایت شاہ کو حاصل کرنے کیلئے بُلّھے شاہ دُنیا کو ترک کرنے کیلئے تیار ہوگیا۔

بھانویں[1] جان نہ جان وے ویہڑے آوڑ میرے۔ مَیں تیرے قُربان وے ویہڑے آوڑ میرے

تیرے جیہا مینُوں ہور نہ کوئی

ڈھونڈاں جنگل بیلا روہی

ڈھونڈاں تا سارا جہان وے ویہڑے آوڑ میرے۔ مَیں تیرے قُربان وے ویہڑے آوڑ میرے

لوکاں دے بھانے چاک[2] مہیں دا

رانجھا لوکاں وِچ کہیندا

ساڈا تاں دِین ایمان وے ویہڑے آوڑ میرے۔ مَیں تیرے قُربان وے ویہڑے آوڑ میرے

آپے[3] چھوڑ لگّی لڑ تیرے

شاہ عنایت سائیں میرے

لائیاں دی لج پال وے ویہڑے آوڑ میرے۔ مَیں تیرے قُربان وے ویہڑے آوڑ میرے

(نیّر عمر کلیات کافی ۳۲)

---

[1] مُرید چاہتا ہے کہ اس کا محبُوب چاہے اُسکے دِل کے درد کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن اُس کے آنگن میں آجائے۔ [2] چاک: مویشی چرانے والا نوکر۔

[3] میں (بُلّھے شاہ) اپنا دین مذہب، خاندان، کُنبہ یعنی سب کچھ چھوڑ کر تمہاری پناہ میں آیا ہُوں۔ اب تم (عنایت شاہ) میری عزّت رکھ لو۔

بھروسا کیہہ آشنائی دا

یہ کافی بُلّھے شاہ کی اُن کافیوں میں سے ہے، جو پیغمبروں اور خدا کے عاشقوں کے دُکھوں اور مُصیبتوں سے متعلق ہیں۔ خدا کے عاشق اُس کی بے پروائی سے ڈرتے ہیں۔ نہ معلوم وُہ کب اُس کی بے رُخی، بے پروائی اور بے اعتنائی کا شکار ہو جائیں۔

اِس کافی میں خدا کے کئی نامور عاشقوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، جنہیں خدائی عشق بہت مہنگا پڑا۔ ابراہیم کو جلتی چتا پر پھینکا گیا۔ شاہ سلیمان کو افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یُونس کو مچھلی کی خوراک بنایا گیا۔ یُوسف کو مِصر کے بازار میں نیلام کیا گیا۔ زکریّا کا سر آرے کے ساتھ چیرا گیا۔ صابر کے جسم میں کیڑے ڈالے گئے۔ شمس تبریز کی کھال اُتاری گئی۔ حضرت محمدؐ صاحب کے نواسے حُسین کو کربلا کے ریگستان میں پیاسا مار دیا گیا۔ یحییٰ کا سر تلوار سے قلم کر دیا گیا۔ راہِ عشق میں شہید ہُوئے عاشقوں کی فہرست دینے کے بعد بُلّھے شاہ اعلان کرتا ہے کہ اب وُہ اُس محبُوب کو اُس کے ہر رنگ میں بخوبی پہچانتا ہے۔ وُہ دُوسروں کو کچھ بھی نظر آئے لیکن بُلّھے شاہ سے اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتا۔

بھروسا[1] کیہہ آشنائی دا، ڈر لگدا بے پروائی دا
ابراہیم چِکھا وِچ پائیو، سُلیمان نوں بھٹھ جھکائیو
یُونس مچھی نوں نگلائیو[2]، پھِر یُوسف مِصر وکائی دا

---

[1] بھروسا = بھروسہ۔ آشنائی = محبّت۔ بابا فرید نے بھی فرمایا ہے ؎
"جے جاناں سوہ نڈھڑا تھوڑا مان کری"

[2] نگلائیو = نِگلوا دیا۔

ذکریا سر کلوتر[1] چلائیو۔ تھا بِ دست تن چیرے پائیو
شنعاں گل زنار پوائیو۔ کتے اُلٹا پوش نبائی دا
پیغمبر[2] تے نور آپائیو۔ نام امام حسین دھرائیو
جھولا جبرائیل جھلائیو۔ پھر پیاسا گلا کٹائی دا
جا[3] ذکریا رکھ چھپایا۔ چھپنا اُس دا بُرا منایا
آرا سر تے چا وگایا۔ سنے رکھ چرائی دا
یحییٰ اُس دا یار رکھایا۔ نال اوسے دے نیہوں لگایا
راہ شرع دا آن بتلایا۔ سر اُس دا بال کٹائی دا
ملبھاشوہ ہن صحیح سنجاتے ہیں۔ ہر صورت نال پچھاتے ہیں
کتنے آتے ہیں کتے جاتے ہیں۔ ہن میتھوں بھل نہ جائی دا

بھروا سا کیہہ آشنائی دا
ڈر لگدا بے پروائی دا

(فقیر محمد:۔ کلیات کافی ۳۰)

---

[1] کلوتر = آرا۔ زنار = جنیؤ۔ پوش = کھال

[2] پیغمبر کے ذریعہ الہٰی نور کا ظہور کیا، اور امام کا نام حسین رکھوایا۔ اِسے جبرائیل فرشتے نے جھولا جھلایا، لیکن پھر اُسی حسین کو کربلا کے میدان میں پیاسا رکھ کر قتل کروایا۔

[3،4] ذکریے کو پہلے درخت میں چھپنے کی ترغیب دی، پھر اُسی درخت کو مع ذکریے کے آرے سے چیروا دیا۔ اِسی طرح یحییٰ کے ساتھ کیا۔

بھینا! میں کتدی کتدی ہٹی

اس کافی میں بُلھے شاہ نے عشق اور رُوحانی شغل کی مُتناسب خوبیوں سے آگاہ کیا ہے۔ طالب کا مُرشد کے تئیں عشق اُسے شرعی راہ اور رُوحانی شغل کی بہ نسبت تیز رفتاری سے خُدا کے وصل کی منزل تک لے جاتا ہے۔ (بھینا! میں کتدی کتدی ہٹی، واج دیہج اساں کیہہ کرنا جس پریم کٹوری مُٹھی)۔ ایسا اِس لئے ہوتا ہے کہ طالب اپنے مُرشد میں جذب ہو جاتا ہے، جو خُدا رسیدہ ہے۔ عبادت کا راستہ لمبا اور دُشوار ہے۔ اِس لئے اس کا چل آہستہ آہستہ بکتا ہے۔ اِس کے علاوہ شیطان کا خطرہ بھی لاحق ہے، جو اُسے منزلِ مقصود پہ پہنچنے میں رُکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ شاعر اِس کافی میں استعارۃً اُن دشواریوں کا ذکر کرتا ہے، جو راہِ عشق میں لاحق ہوتی ہیں یعنی عبادتِ الٰہی میں خلل ڈالتی ہیں۔ شاعر موت کو خوش آمدید کہتا ہے، کیونکہ یہ اُسے جسم کے قید و بند سے نجات دلاتی ہے۔ اور خُدا کے قریب لے جاتی ہے:

بھلا ہویا میرا چرخہ ٹُٹا، میری جند عذابوں چُھٹی
بُلھا شوَہ نے ناچ نچائے، دھم پئی کر کُٹی

[1] بھینا! میں کتدی کتدی ہٹی
[2] چھجّی، پڑی پچھواڑے رہ گئی، ہتھ وِچ رہ گئی جُٹی

---

[1] عشق کے بغیر عبادت کا چرخہ کاتنے والی رُوح کئی بار تھک جاتی ہے۔ عشق کے بغیر کی گئی کمائی سے نہ تو لطف ملتا ہے، اور نہ ہی کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ عبادت بھی دِل میں خداوند کریم کا عشق پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اِس عشق کے بغیر چرخے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے، لیکن جب دِل میں عشق کی مستی چھا جاتی ہے (پریم کٹوری مُٹھی) تو رُوح اپنے آپ محبوب کی طرف کھنچی جاتی ہے۔ ضرورت رُوحانی شغل کو ترک کرنے کی نہیں، بلکہ اِس شغل میں عشق و تڑپ کا رنگ بھرنے کی ہے۔ [2] چھجّی: پونیاں رکھنے کی ٹوکری، (باقی صفحہ ۲۶۲ پر)

اگے چرخہ، پچھے پیڑھا، میرے ہتھوں تند تروٹی
بھوندا بھوندا اورا ڈِگا، چَنب اُلجھی تند نٹی
بھلا ہویا میرا چرخہ ٹٹا، میری جند عذابوں چھٹی
واج دہیج نوں اس کیہہ کرنا، جس پریم کٹوری مُٹھی
تلبھا شوہ نے ناچ نچائے، دُھم پئی کر کُٹی
بھینا! میں کتدی کتدی ہٹی

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ:
صفحہ ۲۰)

(بقیہ فٹ نوٹ:۔ ۲۶۱ سے آگے) پڑی = چھوٹی پٹاری، چھبی = پونیوں کا جوڑا، اورا = جس پر سوت کا دھاگا لپیٹا جاتا ہے۔
لے جس نے عشق کے پیالہ کا لطف لے لیا۔ ؎ محبوب نے مجھے عشق میں ناچ نچایا۔ میں اس طرح کھل کر ناچی کہ ہر طرف میرے ناچ کی دھوم مچ گئی۔

بے حد رمزاں دسدا نی ڈھولن ماہی

اِس چھوٹی سی، مگر پُر اسرار نظم میں بُلھے شاہ یہ رمز ظاہر کرتا ہے کہ خُدا ہر انسان کے اندر ہے۔ منصور میں ہی نہیں، بلکہ اُس کے جلاّدیں اور اُس تماشائی میں بھی، جو ایک طرف کھڑا اِس نظارے کو دیکھ کر مُسکرا رہا ہے۔ خُدا کا ظہور ہے۔ خُدا خصوصاً مُرشد کے قالب میں رُونما ہوتا ہے، جو کہ انسانی جامہ میں خود خُدا کے سوا کوئی اور نہیں۔

بے حد رمزاں دسدا نی ، ڈھولن ماہی
[1] میم دے اوہلے وسدا نی ۔ ڈھولن ماہی
اَولیاء [2] منصور کہاوے
رمز اَناالحق آپ بتاوے
آپے آپ نُوں سُولی چڑھاوے
تے کول کھلو کے ہسدا نی ۔ ڈھولن ماہی
بے حد رمزاں دسدا نی ، ڈھولن ماہی
میم دے اوہلے وسدا نی ، ڈھولن ماہی

(فقیر محمد: کُلیات. کافی ۱۲۳)

---

[1] حرف "م" 'احمد' میں استعمال ہوتا ہے، لیکن 'احد' میں نہیں ہے۔ 'احد' کا مطلب 'ایک' یا 'وحدت' ہے، جو خُدا کی علامت ہے۔ 'احمد' کا مطلب 'سب سے زیادہ قابلِ تعریف' ہے، جس سے مُراد پیغمبر یا مُرشد ہے۔ اِس لئے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ خُدا کا ظہور پیغمبر یا مُرشد کی ذات میں پایا جاتا ہے۔

احد در میم احمدؐ گشت ظاہر۔ دریں دور اوّل آمد عین آخر (گلشن راز)

ز احمدؐ تا احد یک میم فرق است۔ جہانے اندر آں یک میم غرق است (جامی)

[2] اَولیا = ولی، خدا خود ہی منصور کی شکل میں آتا ہے۔

پانڈھیا ہو!

اس عشقیہ نغمہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوشیزہ کو قاصد کے ہاتھ اپنے محبوب کو صرف خط دینے پر ہی تسلی نہیں ہے۔ بظاہر عشق میں مبتلا یہ لڑکی کچھ فاصلہ قاصد کے ساتھ چلتی ہے، اور اس کو بار بار ذہن نشین کراتی ہے، کہ یہ بات نہ بھولنا، وہ بات نہ بھولنا۔ وہ یقینی طور پہ بتا سکتی ہے، کہ قاصد اس کی حالت تفصیلاً بیان کرتے وقت نہ شرمائے گا۔ وہ اس کے محبوب کو جناب طرف بے حجاب اس کے دل کی حالت تفصیل سے بیان کرے، اور اس کا پُر امید جواب لیکر جلدی واپس آئے۔

جھب سُکھ دا سنیہڑا لیاویں وے

پانڈھیا ہو۔

میں دُبڑی میں کُبڑی ہوئیاں
میرے دُکھڑے سب بتاویں وے

پانڈھیا ہو!

کھلی لٹ گئی، ہتھ پراندا!
ایہہ گونڈیاں نہ شرماویں وے

پانڈھیا ہو!

یاراں لکھ کے کتابت بھیجی
کیسے گوشے بہہ سمجھاویں وے

پانڈھیا ہو!

بلھا: شوہ دیاں مڑن مہاراں
تے پتیاں نوں جھب دھاویں وے پانڈھیا ہو!

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ: صفحہ ۲۱)

پانی بھر بھر گئیاں سبھے آپو اپنی وار

ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے ایک خوبصورت مثال دیتے ہوئے بلھے شاہ اِس دُنیا کو ایک کنوآں کہتا ہے۔ اور اس دُنیا کے لوگ وُہ عورتیں ہیں جو اپنے گھڑے بھرنے کے لئے کنوئیں پر آتی ہیں۔ جس طرح پانی بھرتی ہوئی عورتوں کی ایک لمبی قطار کنوئیں پر دیکھنے میں آتی ہے، اسی طرح لوگ اِس دُنیا میں ایک نہ ختم ہونے والی قطار میں آ اور جا رہے ہیں۔

ایک اور تمثیل میں شاعر کہتا ہے کہ جس طرح زیوروں سے سجی دھجی ایک دُلہن کا ہار سنگار رائیگاں ہے اگر اُس کا شوہر اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اُسی طرح انسان کی شان و شوکت اور دُنیاوی مرتبہ بے کار ہے، اگر خدا کو وُہ قبولِ خاطر نہیں۔ ایسے لوگ باوجود دولت، رُتبہ اور اقتدار کے زندگی کی جنگ ہار جاتے ہیں، کیونکہ وُہ زندگی کا اصل مقصد یعنی خدا سے وصال حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

پانی بھر بھر گئیاں سبھے آپو اپنی وار

اِک بھرن آئیاں اِک بھر چلّیاں، اِک کھلیاں نیں باہنہاں پسار

ہار حمیلاں پائیاں گل وِچ

بانہیں چھنکے چُوڑا

کتنیں بک بک جھمتر باہے

سب اُڈ سبھ پُورا

مُڑ کے شوہ نے جھات نہ پائی، ایویں گیا سنگار۔

---

1. جو لوگ کئی قسم کے نیک اعمال کرتے ہیں، مگر جن کا محبوبِ حقیقی کو خوش کرنے والی سچی عبادت کی طرف رجوع نہیں ہے، وُہ محبوب کی خوشی کو حاصل نہیں کر سکتے۔

مَتھّیں[1] مہندی، پیریں مہندی،
سِر تے ڈھڑی گُندائی۔
تیل پھلیل، پاناں دا بیڑہ
دَندیں مِستی لائی۔
کوئی جو سَد پیئو نے گجھی، وِسریا گھر بار

بُلھیا شوہ دی پَندھ پَویں جے[2]
تاں تُوں راہ پچھلنے
"پَوَن ستاراں! پاسیوں منگیا
دائے پیا ترے کانے"
گونگی ڈوری کملی ہوئی، جان دی بازی ہار
پانی بھر بھر گئیاں سبھے آپو اپنی وار
(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ
صفحہ ۲۲)

---

[1] تیل پھلیل = خوشبودار تیل، پاناں دا بیڑہ = کئی طرح کی عیش وعشرت، دَندیں مِستی لائی = دانتوں کو چمکایا اور ہونٹوں کو رنگ دیا۔ سَد پیئو نے گجھی = غیب کی آواز، مطلب آخری بلاوا آ گیا۔ وِسریا گھر بار = سب کچھ چھوڑنا پڑا، کسی کی سوجھ بوجھ نہ رہی۔ وہ لوگ جنہوں نے دُنیاوی عیش وعشرت میں وقت ضائع کر دیا، موت کے وقت خالی ہاتھ چلے گئے۔

[2] محبوب کے وصال کا صحیح راستہ اختیار کر لینے سے ہی سفر ختم ہو سکتا ہے۔
پَون ستاراں = خوش قسمتی کا پانسہ۔
ترے کانے = بدقسمتی والا داؤ۔

پایا ہے کچھ پایا ہے

اِس نظم میں بھی ہمہ اوست کا رنگ نمایاں ہے۔ ایک بار جب خدا کو اپنے اندر دیکھ لیا جاتا ہے تو وُہ باہر ہر چیز میں نظر آنے لگتا ہے۔ وُہ دشمن میں بھی اتنا ہی موجود ہے جتنا کہ دوست میں۔ وُہ مجنوں میں بھی ہے اور لیلیٰ میں بھی۔ وُہ مُرشد میں تو ہے ہی طالب میں بھی جلوہ گر ہے۔ وُہ نہ صرف مسجد میں رہتا ہے بلکہ مندر میں بھی موجود ہے۔ بلھے شاہ کے نزدیک مُسلمان اور ہندو میں کوئی فرق نہیں۔ جو لوگ اِن تفرقات میں اُلجھ جاتے ہیں وُہ بھی اسی کا کھیل ہے۔

آخری بند میں خدا کے وصال کیلئے دُعا کی گئی ہے۔ یہ مثال از خود مسرت جاودانی ہے، اور یہ وصال صرف مُرشد کی امداد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ دُلہا شوہ کا میں محتاج ہُوا۔

(مہاراج ملے میرا کاج ہوا)

پایا ہے کچھ پایا ہے[1]
سنگورنے الکھ کھایا ہے

کہوں ویر پڑا کہوں بیلی ہے[2]
کہوں مجنوں ہے کہوں لیلیٰ ہے

کہوں چور بنا کہوں ساہ جی ہے[3]
کہوں منبر تے بہہ واعظی ہے۔

---

[1] اِس کافی میں وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کا اظہار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مُرشدِ کامل نے یہ تعلیم دی ہے کہ کثرت کے پیچھے ایک پوشیدہ وحدت کارگر ہے۔

[2] وَیر = دشمنی، بیلی = دوست۔ مُراد گورو اور چیلے میں (مُرشد اور مُرید میں)، وُہ خود بیٹھا ہُوا ہے، اور خود ہی اپنا راستہ دکھا رہا ہے۔ "سب اپنا راہ دکھایا ہے" "کہیں آپ آپ کا پنتھ بتایا ہے" بھی لکھا ہُوا ملتا ہے۔ [3] منبر = مسجد میں وعظ کرنے کا مقام۔

کہُوں آپ گُوڑو کہوں چیلی ہے
سب اپنا راہ دکھایا ہے

کہُوں تیغ بہادر غازی ہے[1]
کہوں آپنا پنتھ بنایا ہے

کہوں مسجد کا ورتارا ہے
کہوں بنیا ٹھاکر دوارا ہے

کہوں بیراگی جپ دھارا ہے
کہوں شیخن بن بن آیا ہے

کہوں تُرک کتاباں پڑھتے ہو
کہوں بھگت ہندو جپ کرتے ہو

کہوں گور گندی میں پڑتے ہو
گھر گھر لاڈ لڈایا ہے

بُلھا! شوہ کا میں محتاج ہوا
مہاراج ہے میرا کاج ہوا

درشن پیا دا میرا علاج ہوا
لگا عشق تاں ایہہ گُن گایا ہے

انور علی رُہتکی : قانونِ عشق. صفحہ ۲۰۶۔ کافی ۵۸ ؛

---

[1] غازی : دین کے لئے جان قربان کرنے والا۔

پتیاں لکھاں میں شام نوں

دلھا کی عدم موجودگی میں اس کی دلھن اسے اپنے دل کی قابلِ رحم حالت پر خط لکھتی ہے۔ دوسرے معنوں میں اس تمثیل میں طالب کی اپنے مرشد کے ہجر میں ناقابلِ برداشت حالت کا ذکر ہے۔ یہ ایسی حالت ہے کہ نہ تو برداشت کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس سے بھاگا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس نے عاشق کو مضبوطی سے جکڑ رکھا ہے۔ یہ ایک پُرسوز آفت ہے جس میں نیند اور بھوک دونوں نافور ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی عاشق اسے ترک کرنے کیلئے تیار نہیں۔ عشق کی راہ دشوار اور پُرخطر ہے۔ تاہم جو پھل آخر میں سب کچھ برداشت کرنے پر حاصل ہوتا ہے وہ اس قیمت سے جو ادا کی گئی ہے کہیں زیادہ میٹھا ہے۔

پتیاں لکھاں میں شام نوں

مینوں پیا نظر نہ آوے

آنگن بنا ڈراؤنا

کت بدھ رین وہاوے

پاندھے پنڈت جگت کے

میں پوچھ رہی آں سارے

پوتھی بید۔ کیا دوس ہے

جو اُلٹے بھاگ ہمارے

بھائیا وے جوتشیا!

اِک سچی بات بھی کہیو

جے میں ہینی بھاگ دی

تم چُپ نہ رہیو

لے محبوب (شام) کی جدائی میں محبوبہ کا وقت نہیں گذرتا۔ پتیاں = خط

بھیج سکاں نے بھج جاواں
سَب تج کے کراں فقیری
پر دُلڑی، تلڑی، چولڑی ہے
گل وِچ پریم زنجیری
نیند گئی کِت دیش نُوں
اوہ بھی ویرن میری
مَت سُفنے میں آن ملے
اوہ نیندر کیہڑی
رو رو جیئو وِلاوندیاں
غم کرنی آں دُونا
نینوں نیر بھی نہ چلتن
کِسے کِیتا ٹُونا
ساجن تُمری پیت سے
مجُھ کو ہاتھ کیہہ آیا
چھتر سُولاں سِر جھالیا
پر تیرا نینھ نہ پایا
پریم نگر چل وسیئے
جِتھے وَسے کنت ہمارا
بُلھیا! شوہ توں منگنی ہاں۔ جے دئے نظارا

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ، نسخہ ۳۲)

لے حالت ایسی دردناک ہو چکی ہے، کہ عشق کا راستہ چھوڑ کر فقیری کا راستہ اختیار کرنے کو دل کرتا ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ لیکن گلے میں عشق کی دوہری، تیہری، چوہری زنجیر ہے، مطلب عشق کو چھوڑ سکنا ناممکن ہے۔

پردہ کس توں راکھی دا

خالق اپنی مخلوق کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ اُس کو وُہ چند لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں، جن کی اندرونی آنکھ کھُلی ہُوئی ہے۔ عام آدمی کیلئے وُہ پوشیدہ ہے، مگر اہلِ بصیرت کے لئے آشکار۔

ہمہ اوست کا رنگ پُوری کافی پر چھایا ہُوا ہے۔ وُہ شاہد[1] اور مشہود[2] دونوں میں موجود ہے وُہ خود ہی اپنے آپ کو چھپائے ہُوئے ہے۔ اور پھر آپ ہی خود کو ظاہر کئے ہُوئے ہے۔ وُہ لیلیٰ کی صُورت اختیار کر کے پھر خود ہی مجنوں کی شکل میں آگیا۔ تاکہ وُہ اپنی ہی تجلّی کی جھلک دیکھ سکے۔ وُہ آپ ہی شمس، منصور اور زکریّا کی صُورت میں تھا، اور پھر خود ہی اُن کے جلاد کی شکل میں آیا۔ اُس کے ہی حُکم سے دُنیا عالمِ ہست میں آئی، اور اُسی کے حُکم سے انسان کو اُس (خدا) کی شکل پر بنایا گیا۔

آخری بند میں بُلھے شاہ نے اپنے آپ کو خدا کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن یہ بھی کہا ہے کہ وُہ بلھے شاہ میں آشکار ہو گیا ہے۔ یا یُوں کہیئے کہ خدا اور بلھا ایک ہو گئے ہیں۔

پردہ کس توں راکھی دا
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا

پہلوں آپے ساجن ساجے دا
ہُن دسنا ایں سبق نماجے دا
ہُن آیا آپ نظارے نُوں
وِچ لیلیٰ بن بن جھاکی دا

---

[1] شاہد = دیکھنے والا۔
[2] مشہود = جس کو دیکھا جائے۔

شاہ شمس[۱] دی کھل لہائیو
منصور نوں چا سولی دوائیو
زکریے سر کلوتر دھرائیو
ایہہ[۲] لیکھا رہیا باقی دا

کن[۳] کیہا فیکون کہایا
بے چونی دا چون بنایا
خاطر تیری جگت بنایا
سر پر چھتر لولاکی دا

ہن ساڈے ول دھایا اے
نہ رہندا چھپ چھپایا اے
کتے بلھا نام دھرایا اے
وچ اوہلا رکھیا خاکی دا

پردہ کس توں راکھی دا
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا
(فقیر محمد:- کلیات کافی ۳۶)

---

۱ شمس کی کھال اُتروانے والا، منصور کو سولی پر چڑھوانے والا۔ زکریا کو آرے سے چروانے والا تو ہی ہے۔

۲ اوس کا تو ذکر ہی کیا کرنا ہے۔

۳ تو نے اپنے حکم کے ذریعے کائنات کو پیدا کیا اور معدومیت کی حالت سے دنیا کی تخلیق کی۔

پڑھ تالیو ہُن عاشق کیہڑے

اِس کافی ہیں بُلھے شاہ نے سچّے عاشق کی جانچ کے کچھ معیار رکھے ہیں۔ اور اُن کی کچھ مثالیں دی ہیں۔
عشق میں عاشق اپنی ہستی، اپنے محبوب کی ہستی میں کھو دیتا ہے۔ عاشق اپنے آپکو تو کھو دیتا ہے لیکن اپنے محبوب کو پالیتا ہے۔ اُس تک عاشق کی رسائی شاہ رگ کے ذریعہ ہوتی ہے۔

خُدا ہمہ جائی ہے وُہ ہیر میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ رانجھا میں، لیکن اِس حقیقت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ جو اِس سچائی کو سمجھ لیتے ہیں اُن چند خوش قسمت لوگوں کے لئے دُنیا کے تمام جھگڑے اور تفرقات مٹ جاتے ہیں۔

اِس عارفانہ حقیقت کی آگہی کہ خُدا ہر انسان کے اندر موجود ہے اُن کو نصیب ہوتی ہے، جو علی الصباح اس کی عبادت میں سخت کاوش کرتے ہیں۔ (آدگرنتھ میں علی الصباح کے وقت کو امرت ویلا کہا گیا ہے، وُہ وقت جب خدا کے کلمہ کا آبِ حیات حاصل ہوتا ہے)

یہ خُدا ہی تھا جس نے منصُور سے کہلوایا "مَیں خُدا ہُوں" یہ اعلان منصُور خود نہیں کر سکتا تھا۔ اور اِس کے بعد خُدا خود ہی شرعی مُلّاؤں کی صُورت میں اُسے قتل کرنے کیلئے آگیا۔

آخری بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ دُنیا عمُوماً لوگوں کی فضیلت کا اندازہ اُن کے اُن رسم ورواج ادا کرنے کی بنا پر لگاتی ہے۔ لیکن خُدا صِرف مذہب کے اصل جوہر سے نہ کہ بیرونی رسُومات کی ادائیگی پر خوش ہوتا ہے۔ یہ سمجھ بھی انسان کو خُدا کی رحمت سے ہی آتی ہے۔

پڑھ تالیو ہُن عاشق کیہڑے

نیہوں لگا مت گئی گوانی
تخُن اقرب ذات پچھانی
سائیں بھی شاہ رگ توں نیڑے
پڑھ تالیؤ ہُن عاشق کیہڑے

ہیرے[1] توں مُڑ رانجھا ہوئی
ایہہ گل وِرلا جانے کوئی
مُک گئے سب جھگڑے جھیڑے پڑ تالیوں ہُن عاشق کیہڑے

لئے[2] براتاں راتیں جاگن
نُور نبی دے برسن لاگن
اوہو ویکھ اساڈے جھیڑے پڑ تالیو ہُن عاشق کیہڑے

انا الحق[3] آپ کہائیا لوکا
منصُور نہ دیندا آپے ہوکا
مُلّاں بن بن آون نیڑے پڑ تالیو ہُن عاشق کیہڑے

بُلھا شاہ شریعت[4] قاضی ہے
حقیقت پر بھی راضی ہے
سائیں[5] گھر گھر نیاؤں نبیڑے پڑ تالیو ہُن عاشق کیہڑے

(فقیر محمد: کلیات کافی ۳۷)

---

[1] ہیر رانجھا ہو گئی، یعنی رُوح مُرشد اور رَب کا رُوپ ہو گئی۔

[2] براتاں = خوشیاں۔ جو رات کو جاگ کر عبادت کرتے ہیں، وُہ رُوحانی خوشیاں حاصل کرتے ہیں اور اُن پر نبی اور خداوند کریم کا نُور برستا ہے۔

[3] تُو نے خود منصور سے "مَیں رَب ہوں" کا نعرہ لگوایا۔ مُلاّ تو یونہی اکڑ کر بن بن کر اُسکو سُولی پر چڑھانے کیلئے چل پڑے تھے۔

[4] شرعی لوگ یعنی مُنصف یا جج بن کر معصوم لوگوں کے اچھے یا بُرے ہونیکے متعلق فتوے عائد کرتے ہیں مگر خدا حقیقت یا سچی روحانیت پر خوش ہوتا ہے۔

[5] وُہ (خُدا) ہر ایک کی اندرُونی حالت دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔

پیاریا سانوں مِٹھڑا نہ لگدا شور

یہ کافی محبوب کے وصال سے پیدا ہوئی مسرت اور وجد کی حالت میں لکھی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ اُن متعدد کافیوں سے بالکل مختلف ہے جن میں محبوب کے فراق سے پیدا ہوئے رنج والم کا رنگ نمایاں ہے۔

ایک دوشیزہ کا جب اپنے محبوب سے وصال ہو جاتا ہے تو اُسے دُنیا کا شور وغل اور ہنسی مذاق اچھے نہیں لگتے۔ وُہ عالمِ تنہائی میں اپنے محبوب کے خیالوں میں گم رہنا چاہتی ہے۔ اُس کے دِل میں جب پیار کا غنچہ کھِل اُٹھتا ہے، تو وُہ عجیب مستی کی حالت میں آجاتی ہے۔ ایسی حالت میں وُہ کسی سے بات کرنے یا کسی کی بات سُننے کیلئے تیار نہیں ہوتی۔ بُلھے شاہ چرخہ کاتنے میں مشغول ایک دوشیزہ کی مثال دیتے ہوئے اس کے دِل کی حالت بیان کرتا ہے، جب کہ کوا اُس کے ہاتھ سے پُونی چھین لیتا ہے، جس وقت وُہ اپنے محبوب کے خیالوں میں محو تھی۔

اِس تشبیہہ کا رُوحانی مفہوم یہ ہے کہ خُدا کی تلاش، بیرُونی شور وغُل میں، جس میں مندر مسجد اور شرعی اصُول شامل ہیں کرنا بے سُود ہے۔ جو لوگ اُس محبُوب، کو اپنے اندر ڈھونڈتے ہیں وُہ نہ صرف مذہبی تفرقات سے بچے رہتے ہیں، بلکہ وُہ خُدائی وصال کا سرُور بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ آخری بند میں بُلھے شاہ طالب کو اپنے دِل میں اپنے مرُشد کے تئیں عشق و عقیدت پیدا کرنے کیلئے راغب کرتا ہے۔ کیونکہ اِس سے بے شمار نعمتیں اس پر برسیں گی۔

پیاریا سانوں مِٹھڑا نہ لگدا شور، ہُن مَیں تے راضی رہنا
پیاریا سانوں مِٹھڑا نہ لگدا شور، ہیں گھر کھِلا شگوفہ ہور
ویکھیاں باغ بہاراں ہور، ہُن منہوں کجھ نہ کہنا
بُن مَیں موئی نی میریئے ماں، پُونی میری لے گیا کاں
ڈو ڈو کردی مگرے جاں، پُونی دے دے سائیں دے ناں
بُلھا سائیں دے نال پیار، مہر عنایت کرے ہزار
اہو قول تے اہو قرار، دلبر دے وِچ رہنا
پیاریا سانوں مِٹھڑا نہ لگدا شور، ہُن میں تے راضی رہنا

([illegible] صفحہ ۴۷)

پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہُوئے

عشق کی شدت میں عاشق اپنی ہستی اپنے محبوب میں کھو دیتا ہے۔ اِس مختصر سے نغمہ میں بُلّھے شاہ مُرشد کے عشق میں ہُوئی اپنی حالت بیان کرتا ہے۔ وُہ اَپنے آپ کو مجنُوں سے بھی تشبیہہ دیتا ہے، جس نے اپنے آپ کو اپنی محبُوبہ لیلیٰ میں کھو دیا تھا۔

آخری بند میں ظاہر ہے کہ وُہ لوگوں کے طعنوں سے بے نیاز ہے۔ جسے اپنا محبُوب مِل جائے، وُہ کسی بات کی پروا نہیں کرتا۔

پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہُوئے
اَب پیا کِس نُوں کہیئے؟
ہجر وصل ہم دونوں چھوڑے
اَب کِس کے ہو رہیئے؟
مجنُوں[1] لال دیوانے وانگُوں
اَب لیلیٰ ہو رہیئے
بُلّھا شوہ گھر میرے آئے
اب کیوں طعنے سہیئے

(فقیر محمد: کلیات کافی ۳۹)

---

[1] جِس طرح مجنُوں لیلیٰ کا دیوانہ بن کر لیلیٰ میں جذب ہو گیا تھا ہم کو بھی محبُوب میں جذب ہو کر اس کا روپ ہو جانا چاہیئے۔

پیارے بن مصلحت اُٹھ جانا

اِس دُنیا میں ہمارا قیام چار روزہ یا چار دِن کی چاندنی کہا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری ہستی فانی ہے۔ انسان کو اس امر کا احساس کر لینا چاہیئے۔ اُسے اپنے آپ کو نہ ٹلنے والی آخرت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اُسے ظالمانہ اور احمقانہ اعمال ترک کر دینے چاہئیں۔ اور اس کی بجائے اُسے رحمدلی اور دانائی سے کام لینا چاہیئے۔ اگر وہ نیک اعمال کریگا، تو یہ آخرت میں اُس کے کام آئیں گے۔ وہاں کسی نے اس کا ساتھ نہیں دینا۔ اُسے اپنی قسمت کا خود ہی سامنا کرنا پڑے گا۔

آخری بند میں بُلھے شاہ خُدا سے دُعا کرتا ہے کہ وُہ اپنے کرم سے اُسے یہ طاقت بخشے کہ وُہ اپنے قوی دشمن یعنی اپنے ہی نفس کو ہرانے میں کامیاب ہو سکے۔ اپنے آپ میں وُہ اتنا ناتواں ہے کہ اِس لڑائی میں فتح نہیں پا سکتا۔

پیارے[1] بِن مصلحت اُٹھ جانا
توں کدی نے ہو سیانا

کر کے چاوڑ[2] چار دہاڑے
تھیسیں اَنت نمانا
ظُلم کریں تے لوک ستاویں
چھڈ دے ظُلم، ستانا

جِس جِس دا وی مان کریں توں
سو وی ساتھ نہ جانا

---

[1] مصلحت = نیکی۔ اچھائی۔ تم بغیر نیک کام کئے ہی چلے جاؤ گے۔ کچھ سمجھ سے کام لو۔

[2] چاوڑ = من مانی حرکتیں۔ خرابیاں۔ عیش و عشرت۔ تھیسیں = ہو جاؤ گے۔ نمانا = عاجز۔ چار دِن من مانی کرنیکے بعد اس دنیا سے کُوچ کرنا پڑیگا۔ ظلم کرنا اور لوگوں کو ستانا چھوڑ دے۔

شہرِ خموشاں ویکھ ہمیشہ
جیں وِچ جگ سمانا
بھر بھر پُور لنگھاوے ڈاڈھا
مُلک الموت مہانا
ایتھے ہین تنتے سب
میں اوگُنہار نمانا
بُلھا دُشمن نال برے وِچ
ہے دُشمن بل ڈھانا
محبوب ربانی کرے رسائی
خوف جائے ملکانا

پیارے بن مصلحت اُٹھ جانا
توں کدی تے ہوسیانا

(فقیر محمد: کلیات کافی ۴۰)

۱؎ شہرِ خموشاں = قبرستان
۲؎ ڈاڈھا = زور آور۔ زبردست۔ ملک الموت = موت کا فرشتہ = مہانا۔ ملاح
۳؎ تنتے = مغرور، شیخی بگھارنے والا = اوگُنہار = گُنہگار
۴؎ دُشمن بل ڈھانا = زبردست دشمنوں کا گروہ یعنی مَن اور اس کے بُرے خیالوں نے بُری طرح روح کو گھیر رکھا ہے۔
۵؎ ملکانا = فرشتہ، یعنی وُہ محبوب اگر کرم کرے تو موت کے فرشتے کا ڈر دُور ہو جائے۔

پیاریا سنبھل کے نیہوں لا

عِشق درد اور مُصیبت کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ انسان کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ وُہ عِشق میں جلدبازی سے کام نہ لے۔ مگر عشق کی کشش اس قدر تیز تر ہوتی ہے کہ قوی ارادے والے شخص بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بُلھے شاہ نے اِس کافی میں اُن عاشقوں کے نام شمار کئے ہیں، جنہیں عِشق کی راہ میں مُصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ یُوسف، زلیخا، مجنوں، شمس تبریز، زکریاؑ اور منصُور سبھی کو عشق کے بدلے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ وِہ عِشق جو اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ طاقتور ہے، مُرشد اپنے طالب کو عطا کرتا ہے۔ بُلھے شاہ مُرشد کو عِشق اور عِرفان کی شراب نکالنے والا کہتا ہے۔ یہ شراب وُہ ہے جو پینے والوں پر ایک نرالا اثر کرتی ہے۔

آخری بند میں طنز ہے۔ بُلھے شاہ اِسی انداز میں عاشق کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر وُہ سُکھ کی نیند سونا چاہتا ہے تو شریعت کی خلاف ورزی سے باز آئے اگر وُہ منصُور کی طرح مئے عشق سے بیخود ہو کر اناالحق پکارا ٹھا تو اُسے سُولی کے تختہ سے عشق کے نغمے گانے پڑینگے۔

پیاریا[1] سنبھل کے نیہوں لا، پچھوں پچھوتاویں گا

جاندا جا نہ آویں پھیر

اوتھے بے پرواہی ڈھیر

اوتھے ڈاڈھے کھاندے شیر[2]

تُوں وی پھندیا جاویں گا

---

[1] میراں بائی کہتی ہے ء پریتم جو میں جانتی پریت کئے دُکھ ہوئے۔ نگر ڈھنڈورہ پیٹتی پریت کرے نہ کوئے سائیں بُلھے شاہ خبردار کرتے ہیں کہ عشق کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔

[2] عِشق کرنا شیر آدمی کا کام ہے۔ کمزور دِل انسان کے بس کی بات نہیں۔

کھوہ[1] وِچ یُوسف پائیو نے۔ پھڑ وِچ بازار وکائیو نے

اِک اَٹّی مُل پوائیو نے، تُوں کوڈی مُل پواویں گا

نیہوں لا ویکھ زلیخا نے۔ اوتھے عاشق نرڑھن پے

مجنوں کردا ہے ہے ہے۔ تُوں اوتھوں کی لیاویں گا؟

اوتھے[2] اِکناں پوست لہائی دے۔ اِک آریاں نال چرائی دے

اِک سُولی پکڑ چڑھائی دے۔ اوتھے تُوں وی سیس کٹاویں گا

گھر[3] کلالاں دا تیرے پاسے۔ اوتھے آون مست پیاسے

بھر بھر پیون پیالے کاسے، تُوں وی جی للچاویں گا

دِلبر[4] مُن گیئوں کیت لو۔ بھلکے کیہہ جاناں کیہہ ہو

مستاں دے نہ کول کھلو۔ تُوں وی مست سداویں گا

بُلھیا[5] غیر شرع نہ ہو۔ سُکھ دی نیند رجھ کے سو

مُونہوں نہ انا الحق گو۔ چڑھ سُولی ڈھولے گاویں گا

پیار یا سنبھل کے نیہوں لا پچھوں پچھوتاویں گا۔ (فقیر محمد: کلیات، کافی ۴۱)

---

[1] یُوسف کو پہلے کنوئیں میں پھینکا گیا۔ پھر وُہ سُوت کے ایک لچھے کے مول لکا، تیرا اتنا بھی مول نہیں پڑے گا۔

[2] پوست = کھال۔ عشقِ حقیقی کے جرم میں شمس کی کھال اتار دی گئی۔ زکریا کو آرے سے چیر دیا منصور کو سُولی پر چڑھایا گیا۔ [3] کلال = شراب بیچنے والے یعنی خدا کے عاشق۔ عاشقوں کو عشق کے جام بھر بھر کر پیتے دیکھ کر تیرا بھی دل للچائے گا۔ [4] لو = طرف۔ عاشقوں کی صحبت میں گئے، تو تجھے بھی عاشق سمجھ کر دُکھ دینگے [5] اے بُلھا تو شرع کے خلاف نہ جا، اگر تو سُکھ کی نیند سونا چاہتا ہے۔

تانگھ ماہی دی جلیاں

معمول کے برعکس اِس کافی میں ہیر رانجھا کی بجائے بُلھے شاہ نے سوہنی مہینوال کی تمثیل استعمال کی ہے۔ دریائے چناب کی طوفان خیز لہریں سوہنی کو اپنے محبوب مہینوال سے مِلنے کی کوشش سے نہ روک سکیں۔ اُس نے کچے گھڑے پر دریا عبور کرنے کی کوشش کی، اور وُہ دریا میں ہی غرق ہو گئی۔ اِسی طرح کوئی رُکاوٹ طالب کو اپنے مُرشد تک پہنچنے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

آخری بند میں بُلھے شاہ اپنے آپ کو ایک دلفریب دُلہن تصور کرتا ہے اور کہتا ہے " اگر میرا محبوب گھر آئے تو مَیں اُس کا دِل چُرا لُوں"۔

تانگھ ماہی دی جلیاں۔ نت کاگ اُڈاواں کھلیاں[1]

کوڑی دمڑی پلے نہ کائی۔ پار وتجھن نوں میں سدھرائی[2]

نال ملاحاں نے نہیں اشنائی۔ جھیڑاں کراں وللیاں[3]

نَیں جھنّدل دے شور کنارے۔ گھُمن گھیر وِچ ٹھاٹھاں مارے[4]

ڈُب ڈُب موئے تارُو بھارے۔ جے شور کراں نال تجلیاں

نَیں جھنّدل دے ڈونگھے پاہے۔ تارُو غوطے کھاندے آہے

ماہی مُنڈے پار سدھائے[5]۔ مَیں کپول رہیاں کلیاں

نیں جھنّدل دیاں تارُو پھاٹاں[6]۔ کھلی اُڈیکاں ماہی دیاں واٹاں

عشق ماہی دے لائیاں چاٹاں۔ جے کوکاں تاں میں گلیاں

---

[1] کھلیاں = کھڑی ہُوں۔ کاگ اُڈاواں = ماہی کو پیغام بھیجتی ہُوں۔

[2-3] سدھرائی = ارمان لئے ہُوئے۔ وتجھن نوں = جانے کے لئے۔ ملاح کا مفہوم مُرشد ہے۔

[4] نیں جھنّدل = دریائے چناب یعنی بحرِ ہستی جس کو پار کرنا مُشکل ہے۔

[5] ماہی مُنڈے = ملاحوں کے لڑکے، مُراد مُرشدِ کامل کے مُرید۔

[6] تارُو پھاٹاں = پار لے جانے والی لہریں۔ چاٹ = لذت

پار جھناؤں جنگل بیلے، اوتھے خونی شیر بگھیلے
جھب رَب مینوں ماہی میلے، مَیں ایس فِکر وِچ گلیاں[1]

اَدھی رات لٹکدے تارے، اک لٹکے اِک لٹکن ہارے[2]
مَیں اُٹھ آئی ندی کنارے، ہُن پار لنگھن نُوں کھلیاں

مَیں ان تارُو سار کیہہ جاناں، وَنجھ چپّہ نہ تُلا پُرانا[3]
گھمّن گھیر نہ ٹھانگ ٹکانا، رو رو پھاٹاں تلیاں

بُلھا شوہ گھر میرے آوے، ہار سنگار میرے مَن بھاوے
مُنہ مکٹ متھے تِلک لگاوے، جے دیکھے تاں مَیں بھلیاں[4]

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۴۲)

---

[1] ماہی = محبوب۔ یہاں مُراد مُرشد سے ہے۔ شاعر خُدا سے دُعا کرتا ہے، کہ وُہ اُسے اس کے مُرشد سے جلد ملائے تاکہ وُہ خطروں کو پار کر سکے۔

[2] ستاروں کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔

[3] تُلہا پرانا۔ ناؤ (جسم) پُرانا (بوڑھا) ہے۔ کوئی بانس یا چپّو یعنی سہارا نہیں۔ گرداب پاؤں نہیں ٹکنے دیتے۔ مَیں ہاتھ ملتی رو رہی ہُوں۔

[4] مَیں تب ہی اپنے آپ کو خوبصورت سمجھوں، اگر محبوب میری جانب (پیار سے) دیکھے۔

تسی آؤ ملو میری پیاری

موت کو دلہن کے سسرال روانہ ہونے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جیسے ایک عورت اپنے شوہر اور سسرال والوں کو اپنی شیریں طبع اور عاجزی سے خوش کرلیتی ہے، اسی طرح وہ انسان جس کے دل میں خدا کا عشق اور عقیدت ہے، اس کی درگاہ میں مقبول ہوتا ہے۔

آخری بند میں بلھے شاہ امید ظاہر کرتا ہے کہ باوجود اس کے عیبوں کے اس کا محبوب اس کو سینے سے لگائے گا، کیونکہ اس کی رحمت کے رنگ نرالے ہیں۔

تسی آؤ ملو میری پیاری
میرے ٹرنے دی ہوئی تیاری

سبھے رل کے تورن آئیاں ۔ مائیاں پھوپھیاں چاچیاں تائیاں
سبھے روندیاں زاروزاری
میرے ٹرنے دی ہوئی تیاری

سبھے آکھن ایہہ گل جانی ، رہویں توں ہر دم ہو نمانی
تاہئیں لگیں گی اوتھے پیاری
میرے ٹرنے دی ہوئی تیاری

سبھے ٹور گھراں نوں مڑیاں ، میں ہو اِک اکلڑی ٹریاں
ہوئیاں ڈاراں وں میں کونج نیاری
میرے ٹرنے دی ہوئی تیاری

بلھا شوہ میرے گھر آوے ۔ میں بُچّی نوں لے گل لاوے
اِکو شوہ دی اے بات نیاری
میرے ٹرنے دی ہوئی تیاری

(فقیر محمد: کلیات: کافی ۴۲)

تُسی کرو اساڈی کاری

اِس کافی میں عشق کو مرض دوبدن، کہا گیا ہے۔ شاعر اس مرض کی دوا چاہتا ہے۔ عاشق کو شکایت عشق کے درد کی نہیں، اُس کو شکایت ہے تو محبوب کی جُدائی کی۔ دوسرے لفظوں میں اگر مرض جُدائی ہے، تو علاج وصال ہے۔

عشق کا مطلب خودی کو مکمل طور پر فنا کرنا ہے۔ عاشق کے لئے اُس کے محبوب کی ہستی ہی اصل حقیقت ہے۔ محبوب میں فنا ہونے کا ایسا سرور ہے کہ عاشق اپنی الگ ہستی میں واپس نہیں آنا چاہتا۔

تُسی کرو اساڈی کاری[1]
کیہی ہو گئی وید٘ن[2] بھاری

اوہ گھر میرے وِچ آیا
اوس آ مینوں بھرمایا
پچھو جادُو ہے کہ سایا
اُس توں لو حقیقت ساری....

۲

اوہ دِل میرے وِچ وَسدا
بیٹھا نال اساڈے ہَسدا
پچھاں باتاں تے اُٹھ نَسدا
جے بازاں وانگ اُڈاری...

۳

ہیں شوَد دریاواں پئی آں
ٹھاٹھاں لہراں دے مُنہ گئی آں
بھڑکے گھمن گھیر بھوئی آں
پُربرکھا رین اندھاری...

۴

وے توں کیسے چینچر[3] چائے
نارے کھاری ہیٹھ چھپائے
مُنج دی رسّی ناگ بنائے
ایہناں سحراں نوں بلہاری...

---

[1] کاری: علاج [2] ویدن = دُکھ درد [3] چینچر چائے = چرتر بنائے۔ کھیل رچائے۔

۵

ایہہ جو مُرلی کاہن وجائی
دِل میرے نُوں چوٹ لگائی
آہ دے نعرے کردی آہی
میں رووّاں زار و زاری....

۶

عِشق[۱] دیوانے لیکاں لائیاں
ڈاڈھیاں گھنیاں سَتھاں پائیاں
ہاں میں بکری کول قصائیاں
رہندا اسہم ہمیشہ بھاری..

۷

عشق رُوہیلہ[۲] ناہیں چُھپیدا
اَندر وڑیا بنتیں نچدا
مَینُوں دیئو سنیہڑا سچ دا
میری کرو کوئی غم خواری.....

۸

مَیں کیہہ مہر محبت جاناں
سَئیاں کردیاں زور دھگاناں
گلگل میوہ کیہہ مدواناں
کیہہ[۳] کوئی وَید پساری.....

۹

نوشوہ[۴] جِس دا بانس بریلی
ٹُٹی ڈالوں رہی اکیلی
کُوکے بیلی بیلی بیلی!
اوہدی کرے کوئی دِلداری.....

۱۰

بُلھا شوہ دے جے مَیں جاواں
اپنا سر دھڑ پھیر نہ پاواں
اوتھے جاواں پھیر نہ آواں
ایتھے اینویں عمر گزاری....

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۴۴)

---

۱ پاگل عشق نے بدنام کیا اور گہری خلیج حائل کردی۔ ۲ عشق روہیلہ = ظالم عشق۔ ظالم عشق چھپائے نہیں چھپتا۔ اندر چھپاؤں تو باہر منڈیر پر چڑھ کر ناچتا ہے۔

۳ کیا کوئی اور دوا دارو نہیں ہے؟

۴ نوشوہ = محبوب۔ نوشوہ بریلی کا بانس ہے اور میں اس کے نام کی بانسری ہوں۔ بریلی بانسوں کے لئے مشہور ہے۔

تُو ہیوں ہیں مَیں ناہیں سجنا

عاشق اور معشوق، مُرشد اور مُرید دو قالب مگر ایک جان ہیں۔ طالب کو اپنی مرضی مُرشد کی رضا میں فنا کرنی پڑتی ہے۔ مُرید کی رُوح مُرشد کی ہستی کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ وُہ مُرشد میں اس قدر جذب ہو جاتا ہے، کہ اس کا جاگنا، سونا، بولنا، چُپ ہونا مُرشد کے مطابق ہو جاتا ہے۔

کافی میں آئے جُملہ "کھنڈر کی پرچھائیں" (کھوے دا پرچھاواں) کی تشریح مختلف معانی میں کی گئی ہے۔ کچھ شرح کرنے والوں نے اس سے مُراد رہٹ کا وُہ چکر لیا ہے جو محور کے گِرد گھومتا ہے۔ کچھ ایک کے نزدیک اس کا اشارہ اُس مکان کی طرف ہے جس کی چھت گر گئی ہو اور جس کی پرچھائیں سُورج کی حرکت کے مطابق گھومتی ہو۔ دیگر مبصرین ایک ویران مکان سے مُراد لیتے ہیں جس میں بُھوت پریت رہتے ہوں۔

تُو ہیوں[1] ہیں، مَیں ناہیں سجنا۔ تُو ہیوں ہیں، مَیں ناہیں!
کھوے[2] دے پرچھاویں وانگوں گھُم رہیاں مَن ماہیں
جے[3] بولاں توں نالے بولیں، چُپ رہواں مَن ماہیں
جے سونواں توں نالے سونویں، جے ٹُراں توں راہیں
ماھیا! شوہ گھر آیا میرے
جِندڑی[4] گھول گھمائیں
تُو ہیوں ہیں، مَیں ناہیں سجنا!
تُو ہیوں ہیں، مَیں ناہیں!

(نذیر احمد: کلامِ بُلھے شاہ صفحہ ۲۵)

---

[1] اس کافی میں فنا فی اللہ کا خوبصورت بیان ہے۔

[2] کہتے ہیں کہ تم کھنڈر کی پرچھائیں کی طرح میرے دِل میں گھوم رہے ہو۔

[3] میرے بولتے وقت تم ہی بولتے ہو۔ چُپ رہوں تو تم من میں رہتے ہو۔

[4] جِنڈری: جان۔ گھول گھمائیں = قُربان کرتی ہُوں۔

تیں کت پر پاؤں پسارا اے

یہ نظم انسان کے لئے ایک تنبیہہ کی صورت میں ہے۔ انسانی زندگی کے قلیل عرصہ میں اس کے لئے لازم ہے کہ وُہ اس اہم کام کو سرانجام دے جس کے لئے اُسے اس دُنیا میں بھیجا گیا ہے۔ دُنیا کو ایک سرائے مانا گیا ہے جس میں مسافر کا قیام صرف ایک رات کے لئے ہے۔

نظم کا تیسرا بند انسان کو یاد دلاتا ہے کہ وُہ خُدا کی ذات سے وابستہ ہے۔ اُسے اِس مادّی دُنیا کو اپنا اصلی اور مستقل گھر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

آخری بند میں سالک کیلئے امید کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ لگتا ہے۔

تیں کت پر پاؤں پسارا اے، کوئی دم کا اہناں گزارا اے
اِک پلک جھلک دا میلہ اے، کجھ کر تے ایہو ویلا اے
ایہہ گھڑی غنیمت دہاڑا اے، تیں کت پر پاؤں پسارا اے
اِک رات سراں دا رہنا اے، ایتھے آ کر پھیر نہ بہنا اے
کل سب دا کوچ نقارا اے، تیں کت پر پاؤں پسارا اے
توں اوس مقاموں آیا ایں، ایتھے آدم بن سمایا ایں
بن چھنڈ مجلس کوئی کارا اے، تیں کت پر پاؤں پسارا اے
بھلا شوہ ایہہ بھرم نہارا اے، سر چکیا پریت بھارا اے
اُس منزل راہ نہ کھاڑا اے، تیں کت پر پاؤں پسارا اے
کوئی دم دا اہناں گزارا اے

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۴۷)

تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا

بلھے شاہ کی کافیوں میں یہ کافی پسندیدۂ خاص و عام ہے۔ اس کافی کے ساتھ ایک واقعہ منسوب ہے جو اس طرح ہے: ایک دفعہ بلھے شاہ کا مُرشد عنایت شاہ اُس کے ساتھ ناراض ہو گیا۔ جب وُہ کسی بھی طریق سے اپنے مُرشد کو منانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اُس نے ایک رقاصہ کا بھیس بدلا اور ناچنا شروع کر دیا۔ جب عنایت شاہ اُس راستے سے گُذرا تو وُہ ناچ دیکھنے کیلئے ٹھہر گیا۔ جب اُس نے بلھے شاہ کو پہچان لیا تو وُہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، اور اُس کی خفگی دُور ہو گئی۔

اس کافی میں پانچ بند ہیں۔ پہلے چار کا تعلق ہجر کے غم اور محبوب کی دُوری سے ہے۔ آخری بند محض تصورانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک اصل واقعہ سے منسوب ہے جس کے بارے میں اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا!

تیرے عشق نے ڈیرا میرے اندر کیتا. بھر کے زہر پیالہ مَیں تاں آپے پیتا
جھبدے بوہڑیں وے طبیبا . نہیں تے میں مر گئیا
تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا!

چھُپ گیا وے سُورج، باہر رہ گئی آ لالی وے مَیں صدقے ہووں دیویں مُڑ جے وِکھالی
پیرا! میں بھُل گئیاں . تیرے نال نہ گئیا
تیرے عشق نچائیاں کر تھیا تھیا!

ایس عشقے دے کولوں مینوں ہٹک نہ مائے، لاہُو جاندڑے بیڑے کیہڑا موڑ لیائے
میری عقل جو بھُلی . نال مُہانیاں دے گئیا

---

۱ لاہُو جاندڑے - تیزی سے جا رہے۔ میری عقل جاتی رہی جو مَیں نے ملاح (مُرشد) پر بھروسہ کر کے پیار کا راستہ اختیار کر لیا۔ (میری عقل جو بھُلی نال مہانیاں دے گئیا) بیان میں طنز ہے کیونکہ صُوفی ملاح کے ساتھ جانے کو غلطی نہیں کہہ سکتا۔

تیرے عشق نچائیاں کر تھیّا تھیّا!

ایس عشقے دی جھنگی وچ مور بولیندا، سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا

سانوں گھائل کرکے، بھیر خبر نہ لیتّا

تیرے عشق نچایا کر تھیّا تھیّا!

بُلھا شوہ نے آندا مینوں عنایت دے بوہے[1] جس نے مینوں پوائے چولے ساوے تے سُوہے

جاں میں ماری ہے اَڈی، مِل پیا ہے وہیتا

تیرے عشق نچائیاں کر تھیّا تھیّا!

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ

صفحہ ۲۶ - ۲۷)

---

[1] خدا تجھے میرے مُرشد عنایت شاہ کے ذریعے آیا ہے۔ مُرشد نے خوبصورت کپڑے پہنا کر محبوبِ حقیقی سے مِلا دیا۔ "مِل پیا سے وہیتا" کا مطلب وہی ہو سکتا ہے اور وحی والا یا الٰہی بھید جاننے والا عارف (مُرشد) بھی ہو سکتا ہے۔

ٹک بُوجھ کون چُھپ آیا اے

خُدا اس دُنیا میں مُرشد کے بھیس میں آتا ہے۔ بُلھے شاہ کا اشارہ بظاہر اس کے اپنے مُرشد عنایت شاہ کی طرف ہے۔

گو عشق میں غم پنہاں ہے، لیکن عاشق اِس کو کسی قیمت پر ترک کرنے کے لئے تیار نہیں عشق سے محروم ہونا زندگی سے محروم ہونا ہے۔ عشق میں درد ہے لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اِس درد میں ایک راحت بھی ہے۔

بُلھے شاہ کہتا ہے کہ وُہ سب سے بڑا گنہگار ہے، لیکن کلمہ (نام) کے شغل اور مُرشد کی رحمت سے اس نے اپنے تمام گُناہ دھو دیئے ہیں۔ نام ہی ایک ایسی دولت ہے جسے انسان موت کے بعد اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے جب کہ سب دُنیاوی اشیاء اُسے پیچھے چھوڑنی پڑتی ہیں۔ تاہم اُسے شیطان کی چالوں سے چوکنا رہنا چاہیئے، جو ہر وقت اِنسان کو گمراہ کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہے۔

دیگر بہت سی کافیوں کی طرح اِس کافی میں بھی بتایا گیا ہے کہ خُدا کو اپنے اندر پا لینے کے بعد وُہ ہر جگہ، ہر شے میں موجود نظر آتا ہے۔ عارِف کو مختلف مذہب و مِلت، ملک و قوم کے لوگوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اُسے ہر انسان میں خُدا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ایک بند میں بُلھے شاہ مذہب کے الگ الگ پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ پہلو ہیں شرلعیت، طریقت، حقیقت اور معرفت۔

یہ عجیب بات ہے کہ انسان کا نصب العین خُدا کی رسائی ہوتے ہُوئے اُسے اجازت نہیں کہ وُہ اِس راز کو حاصل کر کے اسے افشا کرے۔ جس نے بھی اِس قانون کو توڑا، اسکا وہی حشر ہُوا جو منصور کا ہُوا تھا سخت محنت اور قربانی خُدا کے وصال کیلئے لازمی شرائط ہیں۔ وُہ تمام لوگ جنہوں نے اِس دولت کو پایا، اُنہیں جیتے جی مرنا پڑا، یعنی اپنے جسم سے رُوح کو نکال کے آنکھ کے مرکز پر اکٹھا کرنا پڑا۔ کسی کو یہ دولت بغیر پُوری قیمت ادا کئے حاصل نہیں ہُوئی۔

ٹُک[1] بُوجھ کون چھپ آیا اے
کِس بھیکھی بھیکھ وٹا یا اے

جِس[2] نہ دَرد دی بات کہی، اُس پریم نگر نہ جھات پئی
اوہ[3] ڈُب موئی سب گھات گئی، اُس کیوں جنڈری نے جایا اے

مانند[4] پلاس بنائیو ای، میری صُورت چا لکھائیو ای
مُکھ[5] کالا کر دکھلائیو ای، کیا سیاہی رنگ لگایا اے

اِک[6] رَبّ داناں خزانہ اے، سَنگ چوراں یاراں داناں اے
اُس[6] رحمت دا خصمانا اے، سَنگ خوف رقیب بنایا اے

دُوئی دُور کرو کوئی شور نہیں، ایہہ تُرک ہِندُو کوئی ہور نہیں
سب سادھ کہو کوئی چور نہیں، ہر گھٹ وِچ آپ سمایا اے

ایویں[7] قِصّے کاہنوں گھڑنا ایں، تے گلستاں بوستاں پڑھنا ایں
ایویں بے مُوجب کیوں لڑنا ایں، کِس اُلٹا وید پڑھایا اے

---

[1] ذرا بُوجھ یہ کون بہروپیا سوانگ بھر کر آیا ہے۔ اشارہ رَبّ کے مُرشد کی شکل میں ظاہر ہونے کی طرف ہے۔

[۲-۳] جس نے دُکھ درد برداشت نہیں کیا وُہ عشق کی گلی میں جھانک نہیں سکتا۔ وُہ ایک زندہ لاش کی طرح ہے۔ اُس کی نکمّی ماں نے اُسے جنم کیوں دیا؟

[۴-۵] تُو نے کپڑے (CANVAS) کے اُوپر میری تصویر کھینچی ہے، میری شکل گہرے کالے رنگ سے بنائی۔ اُس سے آپ کی عاجزی ظاہر ہوتی ہے۔ بابا فریدؔ نے بھی کہا ہے ؎

فریدا کالے میڈے کپڑے کالا میڈا ویس
گُنہی بھریا میں پھراں لوک کہن درویس

[۶-۷] رَبّ کا نام سچا خزانہ ہے۔ چوروں، یاروں اور داناؤں کے اندر بھی وُہی ہے۔ شیطان کی شکل میں دُشمن بھی رُوح کے ساتھ ہی لگا دیا گیا ہے، جو رُوح کو اِس خزانے سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

[8] گُلستاں بُوستاں: فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی کی نصیحتوں بھری کتابیں۔

اُلٹا وید: پنجابی کا مشہور محاورہ ہے جس کا مطلب ہے اُلٹا عِلم۔ آپ بیرونی رسم و رواج کو بے معنی قِصّے اور اُلٹا وید کہتے ہیں۔

شرلعیت ساڈی دائی اے، طریقت ساڈی مائی اے
اگوں حق حقیقت آئی اے، اِنے معرفتوں کجھ پایا اے
بیٹھے وِرلی بات بتاون دی، تسی سمجھو دِل تے لاون دی
کوئی گت دسو اِس باون دی، ایہہ کاہنوں بھیت بنایا اے
ایہہ پڑھنا عِلم ضرور ہویا، پر دسنا نامنظور ہویا
جِس دسیا سو منصور ہویا، اُس سولی پکڑ چڑھایا اے
میتھوں کسب نہ فکر تمیز کیتا۔ دُکھ تن عارف بایزید کیتا
کر زہد کتاب مجید کیتا۔ کسے بے محنت نہیں پایا اے
اِس دُکھ سے کچرک بھاگیں گا، رہیں سُتا کدتوں جاگیں گا
پھیر اُٹھ دا رو ون لاگیں گا۔ کسے غفلت مار سُلایا اے
غ ع دی صورت اِک بھہرا، اِک نقطے دا ہے فرق پڑا
جو نقطہ دِل بھیں دُور کرا، پھر غین و عین جیت پایا اے

لہ شرلعیت = بیرونی رسم و رواج۔ طریقت = نیک چال چلن و اعمال کی تعلیم۔ معرفت = عرفان۔ خدا کے ساتھ عارف کے وصال کو عقل اور ادراک سے سمجھنا۔

۲ہ باون کی گت = خدا کا بھید۔ آپ بتائیں کہ اس نے یہ راز کیوں چھپایا ہے۔
۳ہ خدا کا راز جاننا ضروری ہے۔ لیکن جو اسے دُنیا پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے منصور کی طرح سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔
۴ہ کسب = پیشہ، تمیز = پہچان، سوجھ بوجھ۔ بایزید ایک صوفی فقیر ہوا ہے اُسے تکلیفیں ضرور سہنی پڑیں لیکن آخر میں وہ عارف بن گیا۔ مطلب یہ کہ اس نے اپنے آپ کو قرآن شریف کی روحانی تعلیم کا مجسمہ بنالیا۔ بلا محنت کسی کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔
۵ہ کچرک: کب تک۔ تو محنت (عبادت) کرنے سے کب تک بھاگے گا۔ تو کب تک غفلت کی نیند سویا رہے گا۔ جب ہوش آئے گا، تو تو روئے گا پچھتائے گا۔

۶ہ عین غین = غین مرشد کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور عین خدا کے لئے۔ جس طرح عین اور غین میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے۔ اسی طرح خدا اور مرشد میں صرف انسانی وجود کا فرق ہے۔

جیہڑا مَن وِچ لگّا دُو آ رے، ایہہ کون کہے مَیں مُو آ رے[1]
تن سب عنایت ہُو آ رے، پھر مُلہا نام دھرایا اے
ٹُک بُوجھ کون چھُپ آیا اے
کِس بھیکھی بھیکھ وٹایا اے

(فقیر محمد کلیات: کافی ۴۸)

[1] جب تک دِل سے دُوئی دُور نہیں ہوئی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خودی کا خاتمہ ہو گیا۔ جب "خودی" کا خاتمہ ہو گیا، تو تن من عنایت شاہ (مُرشد) کا رُوپ بن گیا۔

زنجیر نہ عشق مجازی لاگے

مُرشد کی رُوحانی صُورت کی منزل حاصل کرنے کے لئے اس کی جسمانی شکل کے مرحلہ سے گزرنا لازم ہے۔ افلاطون نے اِس موضوع کو اپنی کتاب "سمپوزیم" (Symposium) میں اسی طرح سمجھایا ہے۔ وُہ لکھتا ہے کہ جس ہستی کو کبھی دیکھا نہیں گیا، چھُوا نہیں گیا، الغرض جو کبھی مشاہدہ میں نہیں آیا، اُس سے کبھی عشق نہیں ہو سکتا۔

عِشق عاشق کو وجدو سرور کی بلند چوٹیوں پر لے جاتا ہے۔ وُہ حقیقت میں اس دُنیا سے مرجاتا ہے کیونکہ دُنیا کی کوئی چیز اس پر اثر نہیں کرتی۔

عشق کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جب عاشق اپنے محبُوب سے جُدا ہو جاتا ہے اور اس کے وصال کے لئے تڑپتا ہے تو شدید درد اور بے چینی کی حالت میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔

عشق کی سب سے اُونچی کیفیت میں عاشق کو محبُوب ہر شے میں اور ہر جگہ موجُود نظر آتا ہے۔ ایسا عاشق غیبی طاقت حاصل کر لیتا ہے اور اُس کی ہر بات میں گہری سچائی ہوتی ہے حقیقت کے مشاہدہ سے اس پر خُدائی رحمت برسنے لگتی ہے۔

زنجیر نہ عشق مجازی لاگے، سُوئی سیوے نہ بِن دھاگے
عِشق مجازی داتا ہے، جس پِچھے مست ہو جاتا ہے
عِشق جنھاں دے ہڈیں پیندا، سوئی نِرجیوت مر جاندا
عِشق پِتا تے ماتا اے، جِس پِچھے مست ہو جاناں اے
عاشق دا تن سُکدا جائے، مَیں کھڑی چند پر کے سائے
ویکھ معشُوقاں کھِڑ کھِڑ ہاسے، عِشق بے تال پڑھاتا ہے
جس تے عِشق ایہہ آیا ہے، اوہ بے بس کر دکھلایا ہے
نشہ رُوم رُوم میں آیا ہے، اِس وِچ نہ رتی اوہلا ہے
ہر طرف دِسیندا مولا ہے، مُلّھا عاشق وی ہُن ترداہے
جس فکر پیا دے گھر دا ہے، رَب ملدا ویکھ اُدھر دا ہے
مَن اندر ہویا جھاتا ہے، جس پچھے مست ہو جاتا ہے

(فقیر محمد، کلیات، ص ۵۰)

جِس تَن لگیا عِشق کمال

بامُراد با کالِ عشق عاشق پر سرُور و وجد طاری کر دیتا ہے۔ وُہ دُنیا کے عیش و آرام اَور رنج والم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دُنیا کی نظر میں ایسا شخص دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔ وُہ نہ صِرف دُوسروں کی مَدد سے بیگانہ ہے بلکہ اُسے خدُا کی درگاہ میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خدُا کے وِصال سے اس کے تمام شکوک وشبُہات حل ہو جاتے ہیں۔ تمام مذہبی اختلافات اس کے لئے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وُہ ہر شے میں خدُا کا ظہُور پاتا ہے۔ اَور کمالِ سرُور کی حالت میں مَست رہتا ہے۔

۱ جِس تن لگیا عِشق کمال، ناچے بے سُرتے بے تال
۲ دَرد مَند نُوں کوئی نہ چھیڑے، جِس نے آپے دُکھ سہیڑے
۳ جمنا جیُونا مُول اکھیڑے، بُوجھے آپ خیال
۴ جِس نے ویس عِشق دا کیتا، دُھر دربار وں فتوے لیتا
۵ جدوں حضُوروں پیالہ پیتا، کُجھ نہ رہیا جواب سوال
۶ جِس دے اَندر وَسیا یار، اُٹھیا یارو یار پُکار
۷ نہ اوہ چاہے راگ نہ نار، اینویں بیٹھا کھیڈے حال
۸ بُلھیا! شوہ نگر سچ پایا، جھُوٹھا رَولا سبھ مُنایا
۹ سچیاں کارن سچ سنایا، پایا اُس دا پاک جمال

(ڈاکٹر نذیر احمد، پنجابی انتخاب، صفحہ ۲۸-۲۹)

---

۱ جو عِشق کی انتہا تک پہنچ گیا اُس کے اندر الہٰی مستی پیدا ہو گئی۔ ۲ سچے عاشق خود ہی عشق کے دُکھ کو طلب کرتے ہیں۔ ۳ مُول = جڑ۔ خدُا کے عاشق جنم مَرن کی جڑ اُکھاڑ ڈالتے ہیں۔ یعنی وہ آواگون (تناسخ) کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ۴، ۵ ڈاکٹر نذیر احمد اس کافی کی تشریح کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ جس عاشق کا لباس پہن لیا۔ اس نے عشق کے شہنشاہ (خداوندِ کریم) کے ہاتھ سے پریم کا پیالہ پی لیا اَور وُہ دنیاوی طور طریقے سے بے نیاز ہو گیا۔ ۶، ۷ جب باطن کے گوشے گوشے میں محبُوب کے کلمہ (الہٰی کلمہ) کی آواز گونجنے لگ پڑی تو باہر کے (دُنیاوی) ناچ گانے پھیکے پڑ گئے۔ اُونچے درجے کے صوفی باہر کے رنگ و ناچ وگانے کے حامی نہیں تھے۔ ۸ شوہ نگر = مقامِ حق سے مراد ہے۔ پاک جمال یعنی نورِ الہٰی دیکھا، تو دُنیا کے سب تماشے جھُوٹے معلوم ہونے لگے۔

جند کُڑّی دے مُنہ آئی

اِس کافی میں بُلھے شاہ عِشق کی راہ میں آنے والی مُشکلات کا ذکر کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ عِشق کا بوجھ پہاڑ کے وزن سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن عاشِقِ صادق اسے برداشت کرنے سے نہیں جھجکتا، کیونکہ اُس کے دِل میں محبُوب کی ایک جھلک پانے کی شدید آرزُو ہے۔ حضرتِ مُوسیٰ نے خدا کا دیدار پانے کی تمنا ظاہر کی۔ خدا نے اُسے خبردار کیا کہ وُہ اس کے جلوہ کی تجلّی کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ مُوسیٰ کے اصرار پر خدا نے پھر کہا، کہ وُہ پہلے کوہِ طُور پر نظر ڈالے جس پر اُس نے اپنے نُور کا ظہُور کیا۔ جب خدا نے اپنی نظر کوہِ طور پر ڈالی تو وُہ فوراً جل گیا، اور مُوسیٰ اسکی تجلّی کی تاب نہ لاکر بیہوش ہو گیا۔

عاشق غمِ دِل کی شِدّت کی وجہ سے مجبُور ہے کہ وُہ خُدا سے براہِ راست تعلق قائم کرے حالانکہ وُہ جانتا ہے کہ ایسا تعلق رکھنے والے لوگ کبھی سُکھ کی نیند نہیں سو سکتے۔ عاشق دُوسروں کے مُشاہدات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وُہ اپنی آنکھ سے اس کا جلوہ دیکھنا چاہتا ہے۔

اِس کافی کے ایک بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ باوجود اس کے کہ خدا بندے کے عَین نزدیک ہے، دَوستو رستو وِچ بُکل دے، وُہ نظر نہیں آتا۔

ایک اَور بند میں کہا گیا ہے کہ عِشق کی مستی کی حالت میں ایک لہر دِل سے اُٹھتی ہے، جو عاشق کو راز افشا کرنے پر مجبُور کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس کی اُسے اجازت نہیں۔

آخری بند میں بُلھے شاہ نے اپنے محبوب کا وصال پا کر خوشی کا اظہار کیا ہے۔

جند کُڑّی دے مُنہ آئی

آپے ہَیں تُوں لَحمک لَحمی[1] آپے ہیں تُوں نیارا
گلّاں سُن سُن تیریاں میرا عقل گیا اُڈ سارا
شرعت[2] تُوں بے شریعت کر کے، بھلی کھبھن وِچ پائی

---

[1] لحمک لحمی = سمایا ہوا۔ [2] تُو نے مجھے شریعت کے اصُولوں سے آزاد کر کے عِشق کی منجدھار میں لا کر چھوڑ دیا؟ کنارے کیوں نہیں لگاتا؟

ذرہ[1] عشق تساڈا دِسدا، پربت کولوں بھارا
اِک گھڑی دے ویکھن کارن، چُک لیا جگ[2] سارا
کیتی محنت بِلدی ناہیں، ہُن کیہہ کرے لوکائی
واویلا کیہہ کرناں جندے، جو ساڑے سو ساڑے
سُکھاں دا اک پُولا ناہیں، دُکھاں دے کھواڑے
ہُونی[3] سی جو اُس دِن ہوئی، ہُن کیہہ کریئے بھائی
صلاح نہ منّدا وات نہ پُچھدا، آکھ ویکھاں کیہہ کردا
کل مَیں کملی تے اوہ کملا، ہُن کیوں میتھوں ڈردا
اوہلے بہہ کے رمز چلائی، دِل نوں چوٹ لگائی
سینے[4] بان دھندالاں گل وِچ، اِس حالت وِچ جالاں
چاچا سِر بھوئیں تے ماراں، رو رو یار سنبھالاں
اگّے وی ستیاں نیہوں لایا، کہ ہُن ہی پریت لگائی
جگت وِچ روشن نام تساڈا، عاشق توں کیوں نسدے ہو
وسّو رستو وِچ بُکل دے، اپنا بھیت نہ دسدے ہو
ادھکڑے[5] وِچکاروں پھڑ کے، میں کر اُلٹ لٹکائی
اندر والیا باہر آویں، باہوں پکڑ کھلوواں
ظاہرا[6] میتھوں لکّن چھپّن، باطن کولے ہوواں
ایسے باطن پھٹّی زلیخا، ہُن باطن برلائی

---

[1] تیرے عشق کا ذرہ پہاڑ سے بھی بھاری ہے۔ لیکن میں نے سارا پہاڑ سر پر اُٹھا لیا ہے
[2] جس دِن عشق کیا اُسی دِن جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ [3] سینے میں پیار کے تیر اور گلے میں دُنیا کی پھانسی ہے
[4] ادھکڑے وِچکاروں پھڑ کے = درمیان سے پکڑ کر۔
[5] ظاہرا تو دُور دوڑتے ہو لیکن اندر میرے نزدیک ہو۔ اِس اندرونی جھلک نے ہی زلیخا کو تباہ کیا تھا۔ میں بھی اِس اندرونی کشش کی وجہ سے دُکھی ہو رہی ہوں۔

آکھنیاں سی آکھ سنائیاں، مچلا سُندا ناہیں

ہتھ مروڑاں بھاٹاں تلیاں، رووا ں ڈھائیں ڈھائیں

لینے بھیں مُڑ دیتا ہو یا، ایہہ تیری بھلیائی[1]

اِک اِک لہر اجیہی آوے، ہہیں دسنیاں سو دساں

صحیح آکھاں تاں سُولی بھا ہا، جھوٹھ کہاں تاں وساں

ایسی نازک بات کیوں آکھاں، کہندیاں ہووے پرائی

وٹّی وسیلہ پاکاں دا، نسِیں آپے ساڈے ہو وۓ

جاگدیاں سنگ ساڈے جاگو، سوواں تاں نالے سوۓ

جس نے تیں سنگ پریت لگائی، کیہڑے سُکھ سوائی

آسیاں لیکاں لائیاں مینوں[2]. ہور کئی گھر گالے

اُپر واروں پاویں جھاتی، وتیں بھریں دو آلے

لکن چھپن نے چھل جاون، ایہہ تیری وڈیائی

تیرا میرا نیاؤں نبیڑے، رُومُوں قاضی آوے[3]

کھول کتاباں کرے تسلی، دوہاں اِک بیتاوے

پھر میاں قاضی میرے اُتّے. میں قاضی بھرمائی

بلھا شوہ توں کیہا جیہا، ہُن توں کیہا میں کیہی[4]

تینوں جو میں ڈھونڈن لگی، میں بھی آپ نہ رہی

پایا ظاہر باطن تینوں، باہر اندر رُشنائی

(بنیاد کلیات کافی ۵۲)

---

[1] تیرے نیک پاک انسان تو الہام کے ذریعے تجھے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میں تیرے ساتھ ایسا سیدھا تعلق چاہتی ہوں، کہ تو پل بھر کے لئے بھی مجھ سے جُدا نہ ہو۔ گو مجھے یہ معلوم ہے، کہ تیرے ساتھ پیار کرنے والے کبھی سُکھ کی نیند نہیں سو سکتے [2] لیکاں لاؤنیاں = بدنام کرنا۔ اُپر واروں = اوپر سے۔ تو نے مجھے ہی بدنام نہیں کیا بلکہ اور بھی کئی گھر تباہ کئے ہیں۔ ظاہرا تو دُور سے مجھے دیکھتا ہے لیکن باطن میں تو ہر دم میرے ساتھ ہے۔ [3] ایسا لگتا ہے کہ اس مصرع میں مولانا روم کی طرف اشارہ ہے [4] پہلے سوال یہ تھا، کہ تو کیسا ہے اور میں کیسی ہوں۔ اب یہ سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کیونکہ تو اور میں ایک ہو گئے ہیں۔

جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا

مُرشد میں خدا کا عکس نظر آتا ہے۔ اِس لئے جس رنگ میں مُرشد اپنے مُرید کو رنگتا ہے، اُس میں خدا کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اِس کافی میں مُرید اعلانیہ کہتا ہے کہ مُرشد نے اُسے گہرے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

یہ کافی پڑھنے والوں کے لئے مُشکلات سے پُر ہے۔ اوّل تو اس کا رُخ کسی ایک محبت کی طرف نہیں، دوسرے اِس کا مضمون نظم کی طرح مُسلسل نہ ہو کر اس کا ہر شعر غزل کی طرح آزاد ہے[1] اور ہر شعر میں ایسی تمثیلات ہیں، جن کا آپسی تعلق مبہم ہے۔ مثال کے طور پر دوسرے شعر میں "دُرِّ معانی" اور "نیناں دا گھنڈ" بظاہراً بے تعلق ہیں۔ ایک قیاس یہ ہے کہ "درِ معانی سے مُراد مُرشد کے دانشمندانہ قول ہیں، جبکہ "نیناں دا گھنڈ" کا اشارہ مُرشد اور خدا کی یکسانیت کی طرف ہے۔

جُملہ "صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ" (بہرہ، گونگا اور اندھا ہونا) کا رمزیہ اشارہ کان، زبان اور آنکھ بند کرنے سے ہے۔ عبادت میں اِسی عمل سے طالب اپنی رُوح کو جسم سے نکال کر آنکھ کے مرکز پر لے آتا ہے۔ اِس لگاتار مشق (ریاضت) سے اُسے "مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا" (مرنے سے پہلے مرو) کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اِسے جیتے جی مرنا بھی کہا گیا ہے۔ ایسی موت کا مطلب وُہ زندگی پانا (Resurrection) ہے جس کا انجیل میں ذکر ہے۔ اِس قسم کی موت نہ صرف اپنی مرضی سے لائی جا سکتی ہے، بلکہ یہ حیاتِ جاودانی کی طرف لے جاتی ہے۔

کافی کے مقطع میں اشارہ اُس موقع کی طرف ہے، جس میں بُلھے شاہ کو اپنے مُرشد کے سامنے ایک عورت کے بھیس میں ناچنے پر اس کے اپنے قصُور کی مُعافی مِل گئی تھی۔

جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا مُرشد والی لالی او یار
دُرِّ معانی[1] کی دُھوم مچی ہے، نیناں توں گھنڈ اُٹھالیں او یار

---

[1] گہرے روحانی بھیدوں کی دُھوم مچی ہے۔

زلفِ[1] سیاہ وِچ ہویدِ بیضا، اوہ چمکار وکھالیں او یار
صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ[2] ہوئیاں، لائیاں دی لج پالیں او یار
مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا[3]، مویاں نُوں پھر جوالیں او یار
اوکھا جھیڑا عِشقے والا، سنبھل کے پیر ٹکالیں او یار
ہر شئے اندر نوں آپے ہیں، آپے دیکھ وکھالیں او یار
بلھیا! شوہ گھر میرے آیا، کر کر ناچ دکھالیں او یار
جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا
مرشد والی لالی او یار

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ: صفحہ ۳۱)

---

[1] ماتھے میں تیسری آنکھ (نقطۂ سویدا) جہاں سے نورِ الٰہی کا دیدار ہوتا ہے۔
[2] صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ = بہرہ۔ گونگا اور اندھا۔
[3] مرنے سے پہلے مرو۔ حدیث شریف کا قول ہے۔

فقیر محمد نے اپنی کتاب کلیاتِ بلھے شاہ میں ذیل کے دو شعر درج کئے ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔:

احد[1] وِچوں احمد ہویا، وِچوں میم نکالی او یار
سُورۃ یٰسین مُزمل والا، بدلاں گرج سنبھالی او یار

[1] احد = واحد رب، احمد = حضرت محمدؐ صاحب یعنی خدا میں سے رسُول کا ظہور ہُوا۔
سورۃ یاسین = قرآن شریف کا چھتیسواں سورۃ (باب)

چُپ کر کے کریں گُذارے نُوں

اِس کافی میں بُلھے شاہ مشورہ دیتے ہیں کہ انسان کو خاموش رہنا چاہیئے، اگر وُہ ناخوشگوار حالات سے بچنا چاہتا ہے۔ عوام کے لئے سچ کڑوا ہے۔ وُہ سچائی پسند لوگوں سے جھگڑا مول لے لیتے ہیں۔ صرف عاشق اِس قانون سے مُبرا ہے۔ اُسے سچ نہ صرف عزیز ہے بلکہ وُہ سچ کو ظاہر کرنے سے باز نہیں آتا، خواہ اس کے لئے اُسے بھاری قیمت بھی دینی پڑے، جیسے کہ منصورؒ نے ادا کی۔

سچ اور شرع ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ سچ جھوٹے دِکھاوے اور شرعی رسم و رواج کی پروا نہیں کرتا۔ عاشق کے دِل سے سچائی خوشبو کے جھونکے کی طرح باہر نکلتی ہے۔ عاشق کے لئے یہ دُنیا محض ایک فریب ہے۔

چُپ کر کے کریں گُذارے نُوں

سچ سُن کے لوک نہ سہندے نی، سچ آکھیئے تاں گل پیندے نی
پھر سچے پاس نہ بہندے نی، سچ مِٹھا عاشق پیارے نُوں

سچ شرع کرے بربادی اے، سچ عاشق دے گھر شادی اے
سچ کردا نِویں آبادی اے، جیہا شرع طریقت ہارے نُوں

چُپ عاشق توں نہ ہُندی اے، جس آئی سچ سوگندھی اے
جس ماہل سُہاگ دی گُندی اے، چھڈ دُنیا کُوڑ پسارے نُوں

بُلھا شوہ سچ ہُن بولے ہیں، سچ شرع طریقت پھولے ہیں
گل چوتھے پدری کھولے ہیں، جیہا شرع طریقت ہارے نُوں

چُپ کر کے کریں گُذارے نُوں

(فقیر محمد: کلیات،
کافی ۵۴)

چلو ویکھئے اُس مستانڑے نوُں

مُرشد کو اِس کافی میں "مستانڑا" کہا گیا ہے، کیونکہ وُہ عشقِ الہیٰ کی مَے سے مست ہے۔ بُلھے شاہ اپنے تمام ساتھیوں سے کہتا ہے کہ وُہ اس کے مُرشد کی پناہ میں آئیں جو ہر ایک کو عرفان کی شراب میں رنگ دیتا ہے۔ پھر آگے وُہ کہتا ہے کہ خُدا دُور نہیں ہے۔ وُہ ہمارے اندر شہ رگ کے نزدیک رہتا ہے۔ اُسے پانے کے لئے انسان کو چاہیئے کہ وُہ اپنی رُوح کی دھارا کو جسم کے نو دروازوں (حواس) سے کھینچ کر اپنی آنکھ کے مرکز پر اکٹھی کرے۔ مادی دُنیا فانی ہے، ایک دھوکا ہے یہ دُکھوں اور مُصیبتوں کی بستی ہے۔ اِس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسان اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب وُہ کسی مُرشد کی پناہ میں جائے اور اُس کی ہدایت کے مطابق عمل کرے، نہیں تو وُہ دُنیا کی بھُول بھلیوں میں کھو جائے گا۔ مُرشد کا ہاتھ خدا کا پوشیدہ ہاتھ ہے۔

چلو ویکھئے اُس مستانڑے نوُں
جہدی ترنجناں دے وِچ پئی اے دُھم
اوہ تے مَے وحدت وِچ رنگدا اے
نہیں پچھدا ذات دے کیہ ہو تُم

جیہدا شور چوپھیرے پیندا اے،
اوہ کول تیرے نِت رہندا اے
ناۓ نَحنُ اَقرَبُ[1] کہندا اے
ناۓ آکھے وَفِی اَنفُسِکُم[2]

---

[1] نحنُ اقربُ = قرآن شریف کی آیت جس میں خُدا بندے سے کہتا ہے کہ مَیں شہ رگ سے تمہارے نزدیک ہُوں۔
[2] وَفی انفُسکُم = مجھے اپنی رُوح اور ذات میں مکمل طور پر دیکھو۔

چھڈ جھوٹھ بھرم دی بستی نوں
کر عشق دی قائم مستی نوں
گئے پہنچ سجن دی ہستی نوں
جیہڑے ہو گئے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ[1]

نہ تیرا اے نہ میرا اے
جگ فانی جھگڑا جھیڑا اے
بناں مرشد راہبر کیہڑا اے
پڑھ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ[2]

بُلھے شاہ ایہہ بات اشارے دی
جنہاں لگ گئی تانگھ نظارے دی
وس پیندی گھر و نجارے دی
ہے یَدُاللہِ فَوْقَ اَیْدِیْکُمْ[3]

(فقیر محمد:۔ کلیات۔ کافی ۵۵)

---

[1] جو دُنیا کی طرف سے بہرے، گونگے اور اندھے ہو گئے ہیں، یعنی بے نیاز ہو گئے۔ اُنہوں نے خدا کو پالیا ہے۔

[2] قرآن شریف کی آیت ہے جس کا مطلب ہے: ساری دُنیا اُس خدا کے حکم سے وجود میں آئی ہے۔

[3] اللہ کا ہاتھ سب ہاتھوں سے افضل ہے۔

حاجی لوک مکّے نوں جاندے

اِس کافی میں بُلّھے شاہ نے ہیر۔رانجھا کی تمثیل کے ذریعے مُرشد کے ساتھ اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اہلِ اسلام کے لئے متبرک ترین زیارت گاہ مکّہ معظمہ ہے۔ اور سب سے زیادہ قابلِ تعظیم ہستی حضرت محمدؐ صاحب ہیں لیکن ہیر کیلئے اس کا سب کچھ رانجھا ہے۔ اور بُلّھے شاہ کے لئے اس کا مُرشد عنایت شاہ۔ پانچویں مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا انسانی جسم میں بستا ہے نہ کہ اُن متبرک جگہوں میں جو اینٹوں پتھروں سے بنی ہیں۔ (میرے گھر وِچ نوشوہ مکّہ) اُن پارسا مسلمانوں میں کچھ چور اُچکے بھی ہیں، لیکن بُلّھے شاہ کا مُرشد کے ساتھ عشق اُن تمام الائشوں سے مُبرّا ہے۔ یہ تمام نظم مستی سے لبریز ہے۔

حاجی لوک مکّے نوں جاندے[1]
میرا رانجھا ماہی مکّہ

مَیں تے منگ رانجھے دی ہوئیاں[2]
میرا بابل کردا دھکّا

حاجی لوک مکّے نوں جاندے
میرے گھر وِچ نوشوہ مکّہ[3]

وِچے حاجی وِچے غازی
وِچے[4] چور اُچکّا

---

[1] میری چال دُنیا سے اُلٹی ہے۔ لوگ مکّہ کے حج کے لئے جاتے ہیں، لیکن میرے لئے میرا رانجھا (مُرشد) ہی اصلی مکّہ ہے۔ حضرت سلطان باہو نے کہا ہے "مُرشد دا دیدار ہے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہُو"

[2] میری رانجھے کے ساتھ سگائی ہوگئی ہے (لوگ مجھے کھیڑے کے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں)

[3] جس مکّہ میں میرا محبوب ملتا ہے وہ میرے اندر ہے۔

[4] من کے اندر ہی پراگندہ خیالات اور کئی عیب ہیں (وِچے چور اُچکّا) من کے اندر ہی ان کو جیتنے والے جوہر (حاجی اور غازی) بھی ہیں۔

حاجی لوک[1] مکے نوں جاندے
اساں جانا تخت ہزارے
جت[2] وَل یار اوتے وَل کعبہ
بھانویں پھول کتاباں چارے
نی میں کملی ہاں
(فقیر محمد: کلیات، کافی ۵۶)

---

[1] مقامِ حق (تخت ہزارہ) بھی اپنے اندر ہے اور عاشق اپنے اندر مکہ کا حج مکمل کرکے دلبر (محبوب، خدا) کے ساتھ وصال کرتے ہیں۔ روح کا پاؤں کے تلوؤں سے سمٹ کر سر کی چوٹی پر پہنچنا حج پورا کرکے تخت ہزارہ (مقامِ حق) پہنچنے سے مراد ہے۔

[2] کتاباں چارے: توریت، زبور، انجیل اور قرآن۔ یعنی سبھی مذاہب کی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ سچا کعبہ وہ ہے جہاں اللہ تعالےٰ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ہمارے اندر رہتا ہے اس لئے سچا کعبہ ہمارے اندر ہے۔

حجاب کریں درویشی کولوں

انسان درویشانہ زندگی بسر کرنے سے کتراتا ہے۔ دُنیا میں قیام کے دَوران وُہ کئی قسم کی بدیاں کرتا ہے۔ دوسروں پر ظلم و جبر کرتا ہے، اَور نفسانی خواہشات کا شکار ہوتا ہے۔ وُہ یہ بھُول جاتا ہے کہ وُہ عمل اَور ردِّ عمل کے قانون کے زیرِ اثر ہے۔ یعنی جیسا کوئی کرتا ہے، ویسا ہی بھرتا ہے۔ وُہ یہ بھی یاد نہیں رکھتا کہ انسانی زندگی ایک نایاب مَوقع ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے آواگون کے چکّر سے رہائی پانے کے لئے عطا کیا ہے۔

زندگی مختصر ہے۔ نجات حاصل کرنے کا کام دُشوار اَور طویل ہے۔ اِس لئے فضُول اعمال میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

مَوت کے وقت انسان کو اکیلے جانا ہے۔ کوئی یار و مددگار اس کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں رشتہ داروں کی آہ و فغاں بھی بناوٹی ہوتی ہے، کیونکہ ان کی نظر تو وِرثے میں ملنے والی جائداد پر ہوتی ہے۔ مَوت سب سے بڑی لعنت ہے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ اس کو سب سے بڑی نعمت میں بدلا جا سکتا ہے، اگر انسان جیتے جی مرنے کا عمل سیکھ لے۔ دُوسرے لفظوں میں اگر وُہ اپنی رُوح کو رُوحانی شغل کے ذریعے جسم سے سمیٹ کر آنکھ کے مرکز پر یکسُو کرے۔ تو ایسی مَوت اختیاراً اَور دُکھ سے مبرّا ہی نہیں بلکہ مستی اَور سرُور سے ہم آہنگ ہوگی۔

حجاب[1] کریں درویشی کولوں، کدتک حُکم چلاویں گا

گل الفی[2] سر پا برہنہ، بھلکے رُوپ وٹاویں گا

اِس[3] لالچ نفسانی کولوں، اوڑک مُونڈ منا ویں گا

گھاٹ[4] زکوٰۃ منگن گے پیادے، کہو کیہہ عمل وکھاویں گا

---

[1] حجاب = شرم۔ درویشی = فقیری۔ تم فقیری سے شرم کرتے ہو، کب تک دُنیا میں حکم چلا سکو گے؟ یعنی دُنیا میں ہمیشہ نہیں رہنا۔ [2] الفی = فقیروں کی پوشاک یا کفنی۔ سر پا برہنہ = پیر سے پاؤں تک ننگا۔ [3] نفس اَور حواس کی خواہشات کو پُورا کرنے کے لالچ میں پھنس کر اپنا سر مُونڈوا لوگے۔
[4] پیادے = مَوت کے فرشتے۔ زکوٰۃ = محصُول، ٹیکس۔ گھاٹ: درگاہ کے راستے میں۔

آن بنی حد سِر تے بھاری، اگوں کیہہ بتلاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

حق پرایا جاتو ناہیں، کھا کھا بھار اُٹھاویں گا
پھیر نہ آکر بدلہ دیسیں، لاکھی کھیت لُٹاویں گا
داء لا کے وِچ جگ دے جوئے، جتنے دَم ہراویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

جیسی کرنی ویسی بھرنی، پریم نگر ورتارا اے
ایتھے دوزخ کٹ توں دلبر، اگے کھُل بہاراں اے
کیسر بیج جو کیسر جمّے، لسن بیج کیہہ کھاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

کر دکھائی میرے بھائی، ایہو وقت کماون دا
پوںؑ ستاراں پیندے نے، ہُن داء نہ بازی ہارن دا
اُجڑی کھیڈ چھپن گیاں، تروں اُجھاڑ دکان اٹھاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

کھاویں ماس چباویں بیڑے، انگ پوشاک لگائیا ای
ٹیڈھی پگڑی آکڑ چلیں، جُتی پیر اڑائیا ای
پلدا ایں توں جم دا بکرا، اپنا آپ کہاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

پل دا واسا وسن ایتھے، رہن نوں اگے ڈیرا اے
لے لے تحفے گھر نوں گھلیں، ایہو ویلا تیرا اے

ؑ پوں ستاراں = خوش قسمتی والا داؤ یا پانسہ۔

اوتھے تیتھے نہ لگدا کجھ دی، ایتھوں ای لے جاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

پڑھ[1] سبق محبت اوسے دا توں، بے موجب کیوں ڈھناں ایں
پڑھ پڑھ قصے مغز کھپاویں، کیوں کھبھن وچ کھبھناں ایں
حرف عشق دا اکو نکتہ، کاہ کو اٹھ لدا ویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

بھُجھ مریندیاں نام اللہ دا، ایہو بات چنگیری اے
دونویں ٹھوک پتھر ہٹیں بہالے، اوکھی جہی ایہہ پھیری اے
آن بنی جد سر پر بھاری، اگوں کیا بتلاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

اماں[2] بابا بیٹی بیٹا، پچھ ویکھاں کیوں رونلے نی
رناں کنجکاں بھیناں بھائی، وارث آن کھلوندے نی
ایہہ جو کُڑدے نوں نہیں لدا، مر کے آپ لٹاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

اِکّ اکلیاں جانا ایں تیں، نال نہ کوئی جاوے گا
خویش[3] قبیلہ روند اپڑدا، راہوں ہی مڑ آوے گا
شہروں باہر جنگل وچ واسا، اوتھے ڈیرا پاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

کراں نصیحت وڈی جے کوئی، سن کر دل تے لاوے گا
موئے تاں روز حشر نوں اٹھن، عاشق نہ مر جاوے گا

---

[1] تو عشق کا سبق پڑھ۔ دوسرے لمبے چوڑے قصے پڑھ کر مغز کھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کھبھن: کیچڑ۔ کھبھناں: پھنسنا۔ [2] آخری وقت رشتے دار اس لئے روتے پیٹتے ہیں کہ انکو جائداد کے وارث بننے کا انتظار ہوتا ہے۔ کنجکاں: چھوٹی عمر کی لڑکیاں۔ [3] خویش قبیلہ: رشتہ دار۔

جے توں مریں مرن توں اگے، مَرنے دا ئل پا ویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

جاں[1] راہ شرع دا پکڑیں گا، تاں اوٹ محمدؐ دی ہووے گی
کہندی ہے پر کردی ناہیں، ایہو خلقت رووے گی
ہُن سُتیاں تینوں کون جگاوے، جا گدیاں پچھتاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

جے توں ساڈے آکھے لگیں، تینوں تخت بہاواں گے
جیں نوں سارا عالم ڈھونڈے، تینوں آن ملاواں گے
ڈُہدی ہو کے زُہد کماویں، لے پیا گل لاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

اینویں[2] عمر گوا ئیا اوگت، عاقبت چا رُڑھائیا ای
لالچ[3] کر کر دُنیا اُتے، مُکھ سفیدی آئیا ای
اجے[4] وی سُن جے تائب ہوویں، تاں آشنا سداویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

بُلھا شوہ دے چلناں ایں تاں، چل کیہا چِر لا یا اے
جکّو[5] تکو کیہہ کرنے، جاں وطنوں دفتر آیا اے
واحدیاں خط عقل گئیو ای، رو رو حال وِنجاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں، کد تک حکم چلاویں گا

نقیر محمد: کلیات
کافی ۵۷

---

[1] لوگ کہتے ہیں کہ شرع کے مطابق عمل کروگے تو حضرت محمد صاحب تمہاری حفاظت کریں گے۔ کہنے کو تو شرعی لوگ ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں لیکن اُن کی اصل تعلیم پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو آخر میں پچھتانا پڑے گا۔ [2] اوگت = فضول۔ عاقبت = انجام۔ تو نے اپنی عمر فضول گنوا دی اور اپنی عاقبت خراب کرلی۔ [3] دُنیاوی لالچ اور طمع کی وجہ سے تمہارے چہرے کا نُور ختم ہو گیا ہے اور تمہیں بڑھاپے نے گھیر لیا ہے۔ [4] تائب = توبہ کرنے والا۔ آشنا = عاشق۔ اگر اب بھی تم توبہ کر لو تو خُدا کے عاشق بن سکتے ہو۔ [5] جکّو تکو = حیل وحجّت۔

خاکی خاک سُوں رَل جَانا

انسان کا خاتمہ خاک میں ہوتا ہے، خواہ اُسے جلا یا جائے یا دفنایا جائے۔ اس کا تکبر اور غرور کتنا جھوٹا اور بے معنی ہے! وُہ لوگ جنہیں وُہ بہت عزیز سمجھتا ہے، اُس سے الگ ہو کر کبھی اِس دُنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ زندگی کے دَوران جو لوگ پل بھر کے لئے بھی اس سے جُدا نہیں رہ سکتے تھے، موت کے بعد اُسے ہمیشہ کیلئے بھُول جاتے ہیں۔ اُس شخص کی زندگی جو اپنے عزیز و اقربا سے بچھڑ جاتا ہے، موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔

اِس طرح انسان اِس دُنیا سے لاچاری اور بے بسی کی حالت میں رُخصت ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ اُس کے اپنے اختیار میں نہیں کہ وُہ کہاں رہے۔ اُسے لازم ہے کہ وُہ اپنے آخری سفر کے لئے سامان اکٹھا کرے۔ وُہ ایک ہی چیز اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے، اور وُہ ہے خُدا کا نام۔ اس دُنیا کی کوئی اور چیز اس کے ہمراہ نہیں جا سکتی۔

خاکی[1] خاک سُوں رَل جانا، کُچھ نہیں زور دھگانا
گئے سو گئے پھیر نہیں آئے، میرے جانی میت پیارے
میرے[2] باجھوں رہندے ناہیں، ہُن کیوں اساں وسارے
چِت پیار نہ جائے ساتھوں، اُبھے[3] ساہ نہ رہندے
ایس موئیاں دے پرلے پار، جیئوندیاں دے وِچ بہندے
اوتھے[4] نگر بیانے لگے، تاں اسیں ایتھے آئے
ایتھے ساڈوں رہن نہ مِلدا، اَگے کِت وَل دھائے
بُلھا ایتھے رہن نہ مِلدا، روندے پیڈرے چلے
اکو نام اوسے دا خرچی۔ پیسہ ہور نہ پَلے[5]

(بُلّھا، کلیات، ص ۵۸)

---

[1] انسان خاک سے بنا ہے اور آخر خاک میں مِل جائے گا۔ [2] جو ہمارے بغیر نہیں رہتے تھے، وُہ ہمیں کیوں بھُول گئے ہیں۔ [3] اُبھے ساہ = شدتِ غم میں سسکتے جو سانس آتے ہیں انہیں "اُبھے ساہ" کہتے ہیں۔ [4] موت کے فرشتوں نے وہاں سے یہاں بھیج دیا۔ جم کے پیادے = موت کے فرشتے۔
[5] بغیر نام کے کوئی چیز ساتھ نہیں جا سکتی۔

خلق تماشے آئی یار

اہلِ اسلام میں یہ روایت ہے کہ وُہ کسی بُزرگ کے مزار پر اکٹھے ہو کر محفل لگاتے ہیں جس میں گانے کے بولوں کے ساتھ ڈھول، ڈھولک، تھالی وغیرہ بجاتے ہیں۔ اُسے دربار یا جھنج کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دُنیا اور اُس کی رونق کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

گو کافی کے بند زیادہ ہم ربط نہیں ہیں، لیکن پھر بھی اس کافی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دُنیا ایک میلہ یا بازار ہے، جہاں لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ استعارہ بدلتا ہے اور دُنیا کی تشبیہہ کھیتی سے دی گئی ہے، جس میں لوگ اچھے یا بُرے اعمال کی شکل میں بیج بوتے ہیں۔ یہ استعارہ فلسفۂ اعمال (کرم سدھانت) کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے مطابق ہم دُنیا میں اپنے اعمال کی بنا پر سزا یا جزا پاتے ہیں۔

شاعر اس بازار کو قیام کی موزوں جگہ نہیں سمجھتا، کیونکہ یہاں ہر شے تغیر آشنا اور بے ثبات ہے۔ بُوڑھے بھی مر جاتے ہیں اور جوان بھی۔ شاعر اِس امید کا اظہار کرتا ہے، کہ آخرت میں حالات اِس سے مختلف اور بہتر ہوں گے۔

خلق تماشے آئی یار

اَج کیہہ کیتا؟ کل کیہہ کرنا؟ بھَبھّڑ اساڈا آیا!
ایسی واہ کیاری بیجی، چِڑیاں کھیت وِنجایا
اِک الانبھا سیاں دا ہے، دُوجا ہے سنسار
ننگ نامُوس انھوں دے ایتھے، لاہ پگڑی بھوئیں مار
مُنڈھا کِردا[1]، بُڈھا کِردا، آپو اپنی واری
کیہہ بی بی، کیہہ باندی لونڈی، کیہہ دھوبن بھٹھیاری

---

[1] کِردا = گِردا یعنی مر جاتا ہے۔

بُلھا شوہ نوں ویکھن جاوے۔ آپ بہانہ کردا
گونو گونی بھانڈے گھڑکے۔ بھٹیکریاں کر دھردا
ایہہ تماشا ویکھ کے چل پو۔ اگلا ویکھ بازار
واہ واہ چھنج پئی دربار، خلق تماشے آئی یار!

(نذیر احمد:- کلام بلھے شاہ:صفحہ ۲۵)

۱؎ گونا گونی (گوناگوں): قسم قسم کے۔

دِل لوچے ماہی یار نُوں

یہ بُلّھے شاہ کی اُن کافیوں کی نمائندگی کرتی ہے، جو جذبات کی گہرائی اور شدّت کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان اور زبان کی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ یہ کافی نہ صِرف دِل کو سیدھی چھُوتی ہے بلکہ اس کا اثر بھی پُرزور ہے۔ جِس شدّت کے ساتھ عِشق کے ستائے ہُوئے دِل کے درد کو بیان کیا گیا ہے، وُہ انسانی رُوح کی تاروں کو جھُنجھنا دیتا ہے۔

یہ نظم عاشق کی اپنے محبُوب کے لئے پُرشوق آرزُو کی ایک اچھی مثال ہے۔ اشارہ یہاں طالب کے اپنے مُرشد کے ساتھ گہرے لگاؤ کی طرف ہے۔ شاعِر اُن خوش قِسمت لوگوں سے رشک کرتا ہے جن کو مُرشد کی قُربت اور رحمت میسّر ہے۔ اس کے برعکس وُہ اپنی بدقِسمتی پر آنسُو بہاتا ہے کہ وُہ اپنے مُرشد کے ناقابلِ برداشت ہجر میں مُبتلا ہے۔

جیسے کہ عاشق عموماً افواہ پھیلانے والوں اور چُغل خوروں پر الزام لگاتے ہیں، اِسی طرح بُلّھے شاہ شکایت کرتا ہے کہ اِسی قِسم کے لوگوں نے محبُوب کے دِل میں اُس کے خلاف غلط فہمی پیدا کر دی ہے جس سے محبُوب کے دِل میں گانٹھ پڑ گئی ہے۔ عاشق فریاد کرتا ہے اور دردِ فراق کی ٹیسوں نے اُسے پاگل کر دیا ہے۔ وُہ محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ فُرقت کی اِس بے رحم آگ کو جو اس کے دِل میں لگی ہُوئی ہے، سوائے اس کے کوئی نہیں بجھا سکتا۔

آخری بند میں مندرجہ بالا حالات کے برعکس شاعِر ازحد خوشی کا اظہار کرتا ہے، کیونکہ اس کا اپنے محبُوب سے وصال ہو گیا ہے۔ وجد کی حالت میں وُہ پکار اُٹھتا ہے "آخر کار میرا محبُوب، میرا پُرجلال صاحب، میرے گھر آ گیا ہے۔ اُس نے مجھے سینے سے لگا لیا ہے، جس سے میرے تمام رنج والم بحرِ مسرت کی لہروں میں ڈوب گئے ہیں۔

دِل لوچے ماہی یار نُوں

دِل لوچے ماہی یار نُوں

اِک ہَس ہَس گلّاں کردیاں
اِک رونا رِیاں دھونڈریاں مردیاں
کہوۓ پُھلی بسنت بہارنُوں
دِل لوچے ماہی یارنُوں

مَیں نہاتی دھوتی رہ گئی
اِک گنڈھ ماہی دِل بہہ گئی
بھاہ لائیے ہار شنگارنُوں
دِل لوچے ماہی یارنُوں

میں کملی کیتی دُوتیاں
دُکھ گھیرچوپھیروں لیتیاں
گھر آ ماہی دیدار نُوں
دِل لوچے ماہی یارنُوں

بُلھا شوہ میرے گھر آیا
مَیں گھُٹ رانجھن گل لایا
دُکھ گئے سمندر پارنُوں
دِل لوچے ماہی یارنُوں

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۵۹)

۱؎ پُھلی = کِھلی ہوئی۔ موسمِ فصلِ گل۔
۲؎ بھاہ = آگ
۳؎ دُوتیاں = دُشمن
۴؎ دُکھوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی

جیسا کہ پہلے کچھ کافیوں میں بتایا گیا ہے، چرخہ انسانی جسم کی علامت ہے۔ یہاں لوہار سے مراد مرشد ہے۔ عشق میں مبتلا لڑکی کا استعارہ رُوح کے لئے استعمال ہوا ہے، جو اپنے محبوب کے وصال میں تڑپ رہی ہے۔ چرخہ کاتنے سے مُراد عبادت کرنا ہے اور بغیر مُرشد کی ہدایت کے ٹھیک ڈھنگ سے عبادت یا رُوحانی شغل ممکن نہیں۔ کچھ اور کافیوں کی طرح اِس کافی میں بھی بُلّھے شاہ نے چرخے کی تمثیل بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی ہے۔ چرخے کے مختلف نقائص ان رُکاوٹوں کی علامت ہیں جو روحانی شغل کی راہ میں حائل ہوتی ہیں جس طرح چرخے کے نقائص ایک ماہر لوہار ہی دُور کر سکتا ہے اُسی طرح روحانیت کی راہ میں رُکاوٹیں ایک مُرشد کی مدد سے ہی دُور ہو سکتی ہیں۔ یہاں رانجھا سے مُراد خداوند کریم اور ہیر سے مُراد بے چین رُوح ہے، جو اس کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔

دُوسرے بند میں شاعر رُوح کی خدا کے لئے شدید تڑپ کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ بند کی آخری سطریں خوشی کے اظہار کے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ بُلّھے شاہ کہتا ہے "اگر میرا محبوب مجھے اپنے گلے لگائے تو یہ سمجھو کہ میں نے سو من سُوت کات لیا ہے۔ (سے مناں دا کت لیا تُمبھا، مینوں شَوہ گل لاوے)۔

ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی
ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی، کتیا مُول نہ جاوے

۱؎ اِس کافی میں اُس عابد و شاغل، کے من کی حالت بیان کرتے ہیں جو کہ مُرشد کی جُدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے رُوحانی شغل رُوکھا لگتا ہے۔ دھیڑ بان اُتے جو پڑنا ہیں، کئی فقیروں نے رُوحانی کمائی کو بے ذائقہ پتھر دا اُونی سِل، چاٹنے سے تشبیہہ دی ہے۔ کافی میں ایک طرف تو "کتیا مُول نہ جاوے" (بالکل کاتا نہیں جاتا) کی لے اور کاتا نہ جا سکنے کی بہت سی وجوہات کا بیان اس دُھن کو اُونچا اُٹھاتا ہے اور دوسری طرف "کون لوہار بلاوے" "نکلے توں دل لاہیں لوہارا" "مینوں پیارا مکھ دکھلانے" "ماہی چھیڑ گیا نال ہیں وٹے" "جِت دل یار اُتے دل کھیا برہا ڈھول بجائے" اور "شوہ مینوں گل لانے" کی لے لگاتار بلند ہوتی جاتی ہے۔

تکلے[1] نُوں وَل پے پے جاندے
کون لُہار سداوے

تکلے توں وَل لاہیں لُہارا
تندی ٹُٹ ٹُٹ جاوے

گھڑی گھڑی ایہہ جھوٹے کھاندا
چھلّی اِک نہ لاہوے

پینا نہیں جو بڑی بُھجاں
بائڑ ہتھ نہ آوے

چمڑیاں اُتّے چوبڑ ناہیں
ماہل پئی بڑلاوے

ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی
کتیا مُول نہ جاوے

دِن چڑھیا کد گُزرے
مینوں پیار انکھ دکھلاوے

---

[1] تندی = تار، رُوح کی تار، ذکر اَور تصوّر میں محو ہونا ۔ چھلّی = کاتے ہُوئے دھاگے کا گچھا = اندر رُوحانی ترقّی ہونا ۔ بائڑ = چرخے کے بڑے پہیئے کے دو تھال جیسے تختوں کے درمیان تنا ہُوا دھاگہ جس پہ ماہل کسی جاتی ہے ۔ چمڑیاں = چمڑے کے ٹکڑے جن میں سے تکلا نکلتا ہے چوبڑ = تیل ملنا ۔ "ہتھی ڈھلکنا"، "تکلے نُوں وَل پینا" = مَن کا شغل میں نہ لگنا ۔ چرخے کا جھوٹے کھانا، چمڑوں کا خشک ہونا ۔ اَور ماہل کا بڑلاؤنا = شغل میں آنے والی مشکلات کی طرف اشارے ہیں ۔ شغل میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دُور کرنا مُرشدِ کامل کا کام ہے ۔

ماہی[1] چھڑ گیا نال مہیں دے
کتن کس نوں بھاوے

جت وَل یار اُتے وَل اکھیاں
دِل میرا بیلے دھاوے

تِنجن[2] کتن سدن تیاں
برہوں ڈھول وجاوے

عرض ایہو مینوں آن مِلے ہُن
کون وسیلہ جاوے

سَے[3] مَناں دا کت لیا بُلھا
مینوں شوہ گل لاوے

دِن چڑھیا کد گزرے
مینوں پیارا مُنہ دکھلاوے

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ۔ صفحہ ۳۷)

---

[1] بھینسیں چرانے گیا ہوا ماہا (محبوب) رات کو گھر لوٹتا ہے۔ دُوسرے طالبوں کی طرف گیا مُرشد (ماہی چھڑ گیا نال مہیں دے) رات کو اندر دیدار دیتا ہے۔ صُوفی درویش دِن کو جلد از جلد ختم ہونے کے لئے التجا کرتے ہیں۔ کیونکہ رات کو روحانی شغل میں مُرشد کی نُورانی صُورت دکھائی دیتی ہے۔

[2] تِنجن یعنی تریجن۔ عورتوں کی وُہ محفل جس میں وُہ اکٹھی بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہیں۔ مُراد عارفوں کا مِل کر شغل میں بیٹھنا۔ محبُوب کی جُدائی میں کاتنا اچھا نہیں لگتا۔ خیال بار بار اسکی طرف ہی جاتا ہے۔ اور جُدائی کا درد ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ (برہا ڈھول وجاوے)

[3] عابد عاجز ہوکر کہتا ہے کہ اے محبُوب! میری ریاضت (کاتنا)، سو برس کی عبادت (سَے مناں دا کت لیا) کے برابر ہوجائے گا اگر تُو رحم کر کے باطن میں اپنے ساتھ ملا لے۔ کاتنے اور تجلی آنا لینے (شغل میں کامیابی) کے لئے لوہار (مُرشد) ضرُوری ہے۔ اگر وُہ خود آکر گلے سے لگالے تو کاتنے کی ضرُورت ہی کیا ہے؟ روحانی شغل بھی مُرشد کے فضل و کرم سے ممکن ہے، اور مُرشد کا قرُب سینکڑوں سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ عبادت لازم ہے۔ لیکن نہ تو بندگی پر زور ہے اور نہ اس میں کامیابی اپنے اختیار میں ہے۔ روحانی ترقی کی بنیاد خشک شغل نہیں، سچا عشق، سچی تڑپ اور مُرشد کی بخشش ہے۔

ڈھولا آدمی بن آیا

کافی کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ خدا اِس دُنیا میں آدمی کی شکل میں آیا ہے۔ یہاں صاف ظاہر ہے کہ بُلھے شاہ اپنے مُرشد عنایت شاہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کافی کے باقی حِصّے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے۔ وُہ نہ صِرف ہرن میں ہے جو شکار ہے، بلکہ اس چیتے میں بھی ہے جو اس کا شکار کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس شکاری میں بھی ہے جو دونوں کا شکار کرتا ہے۔ وُہ آقا میں بھی ہے اور غلام میں بھی۔ پھر وُہ خود ہی غلام کے طور پر بِک جاتا ہے۔

کبھی وُہ ایک بادشاہ کی صُورت میں ہاتھی پر سوار ہو کر آتا ہے اور کبھی ہاتھ میں کاسہ لئے ایک بھکاری کی شکل میں۔ وُہ جوگی اور عیاش دھوگی، دونوں کی صُورت میں آتا ہے۔ الغرض وُہ کئی طرح کے سوانگ بھرتا ہے۔

گو وُہ ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے، لیکن وُہ صِرف مُرشد میں ظاہر ہے۔ آخری بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ تعلق کائنات کی تخلیق سے بھی دیرینہ ہے۔ دُنیا کے وجُود میں آنے سے پیشتر وُہ اور خدا ایک تھے۔

ڈھولا[1] آدمی بن آیا

آپے آہُو[2] آپے چیتا آپے مارن دھایا
آپے صاحب آپے بردا[3]
آپے مُل وکایا

---

[1] ڈھول = محبُوب

[1] آپ کہتے ہیں کہ رب مُرشد کی شکل میں آتا ہے

[2] آہُو = ہرن

[3] بردا = نوکر

کدی[1] ہاتھی تے اسوار ہویا کدی ٹھوٹھا ڈانگ بھوایا

کدی راول جوگی بھوگی ہو کے

سانگی سانگ بنایا

بازی گر کیہ بازی کھیلی مینوں پُتلی وانگ نچایا

میں[2] اُس پڑ تالی نچناں ہاں

جس گت مت یار لکھایا

ہابیل[3] قابیل آدم دے جائے آدم کِس دا جایا

بُلھیا اتھاں توں بھی اگے آہا

دادا گود کھڈایا

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۶۰)

---

[1] کبھی شہنشاہ بن کر ہاتھی کی سواری کی۔ کبھی کاسہ لاٹھی پر لٹکا کر دربدر بھیک مانگی۔

[2] میں اُس مُرشد کے قربان جاتا ہوں، جس نے مجھے اُس محبوب کا راز بتا دیا۔

[3] ہابیل قابیل حضرت آدمؑ کے بیٹے مانے جاتے ہیں۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں، کہ جب آدمؑ ہی نہیں بنا تھا، مطلب یہ کہ جب کائنات کی پیدائش ہی ابھی نہ ہوئی تھی، میں تب بھی رُوح کی صورت میں قائم تھا کہتے ہیں کہ آدم کائنات کا بزرگ (دادا) ہے۔ لیکن میں آدمؑ کا بھی بزرگ ہوں۔ اور بھی بہت سے اولیا اور فقراء نے دعوےٰ کیا ہے کہ وُہ کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی قائم تھے۔

رانجھا جوگیڑا بن آیا

جیسے رانجھا جوگی کے بھیس میں ہیر کے سسرال میں اُسے ملنے گیا۔ اسی طرح خدا عنایت شاہ کی شکل میں بُلھے شاہ کی نجات کیلئے اس دُنیا میں آیا۔ بُلھے شاہ کے لئے اس کا مُرشد اتنا ہی پُرکشش تھا جتنا ہیر کے لئے رانجھا۔ اور جیسے رانجھا کا عشق ہیر کے لئے اتنا ہی مستحکم تھا جیسا ہیر کا رانجھے کیلئے۔ اسی طرح عنایت شاہ اور بُلھے شاہ کا باہمی عشق بھی اتنا ہی پختہ تھا۔ اس کا مزید مفہوم یہ ہے کہ خدا کا رُوح کیلئے عشق اتنا ہی پُرزور ہے جتنا رُوح کا خُدا کیلئے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود خُدا ہی رُوح کے اندر عشق کا شعلہ پیدا کرتا ہے، جس وقت کہ وہ مُرشد کی خوشنما صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

آخری بند میں کہا گیا ہے، کہ بُلھے شاہ اور عنایت شاہ کا باہم عشق زیادہ دیر پوشیدہ نہیں رہ سکا، جس طرح کہ رانجھا کے چہرے پر جوگی کا نقاب راز نہیں رہ سکا۔ اور آخر کار اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔

رانجھا[1] جوگیڑا بن آیا
واہ سانگی سانگ رچایا

رانجھا جوگی میں جوگیانی
اس دی خاطر بھر ساں پانی
ایویں پچھلی عمر وہانی[3]
ایس ہُن مینوں بھرمایا

ایس[2] جوگی دے نین کٹورے
بازاں وانگوں لیندے ڈورے
مُکھ ڈٹھیاں دُکھ جاون جھورے
ایہناں اکھیاں لعل وکھایا

بُلھا شوہ دی ایہہ گت پائی
پریت پُرانی شور مچائی
ایہہ گل کیکوں چھپے چھپائی
نی تخت ہزاریوں دھایا

ایس جوگی دی کیہہ نشانی
کن وِچ مُندراں گل وِچ گانی
صُورت ایس دی یُوسف ثانی
ایس الفوں احد بنایا

رانجھا جوگیڑا بن آیا
واہ سانگی سانگ رچایا

(فقیر محمد: کلیات کافی ۶۱)

---

[1] رانجھا = خدا۔ [2] جوگی = مُرشد۔ [3] وہانی = گزر گئی

رانجھا رانجھا کردی ہُن مَیں آپے رانجھا ہوئی

یہ کافی بُلھے شاہ کی مقبُول ترین کافیوں میں سے ایک ہے۔ اس کی زبان سادہ مگر جذبات سے پُر ہے۔

منصُور نے "مَیں خُدا ہُوں" (انا الحق) کہا تھا۔ اس کے جانے کے کافی عرصہ بعد لوگوں نے اُس کے دعوے کی سچائی کو قبول کیا۔ یہ پرانے زمانے اور پرانے تمدن کا واقعہ ہے۔ اس کے برعکس ہیر پنجاب کے ایک گاؤں کی ایک سادہ عورت تھی۔ وُہ فلسفہ کی پیچیدگیوں سے بے بہرہ زُہد کی خشک تقریروں کی ویران راہوں سے ناواقف تھی۔ شروع سے ہی اس نے عشق کی راہ اختیار کی، اور فقط "وفا" کا ایک ہی لفظ اُس نے سیکھا جس کی کہ وُہ قائل تھی، اور جس کے باعث وُہ تہمت اور بدنامی کے ڈر سے بے نیاز تھی۔ دیگر دُنیاوی خیالوں اور رسموں رواجوں سے کنارہ کش ہوتے ہُوئے رانجھے کے نام کا وِرد کرتے ہُوئے اور "مَیں رانجھا ہُوں" (انا رانجھا) کہتے ہُوئے اس نے وہی مرتبہ حاصل کر لیا، جو بہت پہلے منصُور کو مِلا تھا۔

رانجھا سے وصال کے حق میں ہیر کہتی ہے، کہ انسان کی ذات وُہی ہے، جو اُس کے دِل میں ہے۔ چُونکہ رانجھا ہی صِرف اس کے دِل میں بستا تھا، اس لئے وُہ رانجھا سے کبھی الگ نہیں تھی۔ اُس کی اپنی ہستی رانجھا کی ہستی میں نابُود ہو چکی تھی۔

جو عشق کی راہ میں زیادہ محتاط ہیں، اُنہیں ہیر کے مطابق معلوم ہونا چاہیئے کہ لعنت اور ملامت عشق کا خاصہ ہیں۔ یعنی راہِ عشق میں یہ عاشق کے ہمیشہ ہمراہ ہیں۔ لیکن عاشقِ صادق کو اِن کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔

چِٹّی چادر لاہ سُٹ کُڑیئے، پہن فقیراں لوئی
چِٹّی چادر داغ لگیسی، لوئی داغ نہ کوئی

یہ کافی فنا اور بقا کے صُوفی فلسفہ کو ایک ساتھ نہایت مؤثر انداز میں ظاہر کرتی ہے اپنی ہستی کو مُرشد کی ہستی میں فنا کر کے ہی طالب بقا کے مرتبہ تک پہنچتا ہے، کیونکہ وُہ

خدا میں دائمی طور پر سما جاتا ہے۔

آخری بند میں ہیر اپنا وطن چھوڑ کر رانجھا کے ملک جانا چاہتی ہے کیونکہ اس کے اپنے ملک میں سب لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ روح اپنے اصلی گھر جانے کی آرزو رکھتی ہے، جہاں خدا رہتا ہے۔ یہ دنیا روح کے لئے اجنبی اور ناخوشگوار ہے۔

"رانجھا رانجھا" کردی ہُن میں آپے رانجھا ہوئی
سدّو مینوں" دھیدو رانجھا"، "ہیر" نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وِچ "میں رانجھے وِچ" غیر خیال نہ کوئی
میں نہیں اوہ آپ ہے، اپنی آپ کرے دلجوئی
جو کجھ ساڈے اندر وسّے ذات اساڈی سوئی
جس دے نال میں نیونھ لگایا اوہو جیسی ہوئی
چِٹی چادر لاہ سٹ کُڑیئے، پہن فقیراں لوئی
چِٹی چادر داغ لگیسی، لوئی داغ نہ کوئی
تخت ہزارے لے چل بلھیا، سیالیں ملے نہ ڈھوئی
"رانجھا رانجھا" کردی ہُن میں آپے رانجھا ہوئی

(نذیر احمد کلام بلھے شاہ: صفحہ ۳۸)

راتیں جاگیں کریں عبادت

اِس چھوٹے سے خوبصورت نغمہ میں بُلھے شاہ انسان کو ملامت کرتے ہُوئے کہتا ہے، کہ خدِمت، وفاداری اَور فرمانبرداری میں کُتّا اُس سے بہتر ہے جو رات کو جاگ کر اپنے مالک اَور اُس کے گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ اپنی اِس اہم خدِمت کے عوض دِن کو وُہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بھی سونے سے گریز نہیں کرتا۔ اگر اُس کو اپنے مالک سے جُوتے بھی پڑیں، تب بھی وُہ اس کا دروازہ نہیں چھوڑتا (خصم اپنے دا در نہ چھڈّدے، بھانویں وَجن جُتّے)

کافی کے آخر میں بُلھے شاہ نصیحت کرتا ہے کہ ہمیں یہ خُوبیاں کُتّے سے سیکھ کر اپنی آخرت کی تیاری کر لینی چاہیئے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو کُتّے بازی لے جائیں گے۔

راتیں جاگیں، کریں عبادت،
راتیں جاگن کُتّے
تیتھوں اُتّے

بھونکنوں بند مُول نہ ہُندے
جا رُوڑی تے سُتّے
تیتھوں اُتّے

خصم اپنے دا در نہ چھڈّ دے
بھانویں وَجن جُتّے
تیتھوں اُتّے
بُلھے شاہ کوئی رخت[1] وِہاج[2] لے

---

[1] رُوحانی دَولت۔

[2] بیوپار کرے۔ اس کافی میں آپ مالک کی رضا، خدمت اَور بندگی میں (باقی صــ۳۲۴ پر دیکھیں)

ہنیں تے بازی لے گئے کُتے
تیتھوں اُتے

(فقیر محمد: کُلیات کافی ۶۳)

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۲۳ سے آگے) رہنے کی بڑائی سمجھا رہے ہیں۔ بندگی کے اصطلاحی معنے تابعداری عبادت اور راضی بر رضا رہنا ہے۔ صوفی ادب میں ایک خادم (ایاز) اور اس کے آقا (سلطان محمود) میں ہوئے سوال و جواب کا مختصر ذکر ملتا ہے:۔

آقا:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

خادم:۔ جس بھی نام سے آپ مجھے پکاریں، وہی میرا نام ہے۔

آقا:۔ تمہاری خوراک کیا ہے؟

خادم:۔ جو کچھ آپ مجھے کھانے کو دیں وہی میری خوراک ہے۔

آقا:۔ تم کیسے کپڑے پہنو گے؟

خادم:۔ جیسے آپ مجھے دیں گے۔

آقا:۔ تم کیا کام کرو گے؟

خادم:۔ جو کام کرنے کے لئے آپ حکم دیں گے۔

آقا:۔ تمہاری خواہش کیا ہے؟

خادم:۔ خادم کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ جو مالک کی رضا ہے وہی خادم کی مرضی ہے۔

روزے حج نمازنی مائے

اِس چھوٹی سی کافی کا مفہوم سادہ اور صاف ہے۔ خدا کا وصال حاصل کرنے کے بعد بلھے شاہ میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ اب اُس کے لئے روزے، حج اور دیگر شرعی اعمال کی کوئی وقعت نہیں رہی، اور نہ ہی اُس کی منطق، نحو اور علم میں کوئی دلچسپی باقی رہی ہے۔ اب اُس کو ہر جگہ اور ہر شے میں خدا کا ظہور نظر آتا ہے، کیونکہ اس کا دیدار اس نے اپنے اندر کرلیا ہے۔

روزے، حج، نماز نی مائے
مینوں پیا نے آن بھلائے

جاں پیا دیاں خبراں پیئاں
منطق[1]، نحو سبھے بھُل گئیاں
اُس انحد دے تار بجائے

روزے، حج، نماز نی مائے
مینوں پیا نے آن بھلائے

جاں پیا میرے گھر آیا
بھلی مینوں شرع وقایہ[2]
ہر مظہر وِچ اوہا دِسدا
اندر باہر جلوہ اس دا
بھلے لوکاں خبر نہ کائے

روزے، حج، نماز نی مائے
مینوں پیا نے آن بھلائے

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ: صفحہ ۳۹)

---

[1] منطق = علمِ دلیل، نحو = جملوں کا علم۔ [2] شرع وقایہ = شرع کی پابندی۔

رہ رہ اوئے عشقا ماریا ای

شکوہ کے پیرایہ میں بلھے شاہ خدا پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اپنے عاشقوں کے ساتھ سنگدلی سے پیش آتا ہے۔ اس کافی میں اُن عاشقوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے، جنہوں نے عشق کے لئے بھاری قیمت ادا کی تھی۔ ان میں سے بہتوں کو اپنی جان تک بھی دینی پڑی جب کبھی عاشق راہِ عشق سے بھٹک گئے، تو اس کی ذمہ داری بھی خدا پر عائد کی گئی۔ مثال کے طور پر اُس نے آدم کو گندم چکھنے سے منع کیا، لیکن پھر خود ہی اُس نے شیطان کو آدم کے بہکانے کے لئے بھیج دیا۔

جو دیگر ہستیاں اِس فہرست میں شامل ہیں ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔
یسوع مسیح، نوح، موسیٰ، اسمٰعیل، یونس، یوسف، سلیمان، ابراہیم، صابر، منصور، راہب، ذکریا، سرمد، شمس اور شاہ شرف۔ روایتی عاشقوں میں لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں، سسی پنوں کے نام گنے گئے ہیں۔ مہابھارت اور رامائن کے برگزیدہ کرداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اُن مغرور بادشاہوں میں سے جو اپنے تکبر کے باعث خدا ہونے کا دعوےٰ کرتے تھے، نمرود، فرعون اور ہرناکش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے وفادار اور ثابت قدم عاشقوں کے ساتھ ساتھ اُن باغیوں کو بھی اذیتیں دیں، شاید وفادار اور ثابت قدم عاشقوں کو آزمانے کے لئے یا پھر اُس سے بغاوت کرنے والوں کو سزا کے طور پر۔

رہ رہ اوئے عشقا ماریا ای[1]، کہو کِس نوں پار اُتاریا ای

---

[1] اس کافی میں رَب اور عشق کو ایک مان کر مخاطب کیا ہے۔ آپ نے ایک اور جگہ کہا ہے "عشق اللہ دی ذات لوکاں دا مہنا"۔ یہاں آپ رَب کو پیار سے طعنے بھی دیتے ہیں، اور ساتھ ہی اس کی بے پروائی کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ رَب عشق کے بہت سے ناٹک کھیلتا ہے ہر ناٹک میں انوکھی ہی جھلک ملتی ہے۔ عشق حقیقی کی بنیاد بھی وُہی ہے، اور عشق مجازی کی بھی۔

آدم کنکوں منع کرایا، آپے مگر شیطان دوڑایا
کڈھ بہشتوں زمین رُلایا، کیڈ پٹار پسار یا ای
عیسیٰؑ نوں بِن باپ جمایا، نوحے پر طوفان منگایا
نال پیئو دے پُتر لڑایا، ڈوب اوہناں نوں ماریا ای
مُوسیٰ نوں کوہ طور چڑھائیو، اسماعیلؑ نوں ذبح کرائیو
یُونس مچھی توں نگلائیو، کیہہ اوہناں رُتبے چاڑھیا ای
خواب زُلیخا نوں دِکھلائیو، یُوسف کھوہ دے وِچ پوائیو
بھائیاں نوں الزام دوائیو، تاں مراتب چاڑھیا ای
بھبھڑ سُلیمان توں جھکائیو، ابراہیم چِکھا وِچ پائیو
صابر دے تن کیڑے پائیو، حسنؑ زہر دے ماریا ای
منصُور نوں چا سُولی دِتا، راہب دا کڈھوایا پِتا
زکریا سر کلوتر کیتا، پھیر اوہناں کُل کی ساریا ای
شاہ سرمد دا گلا کٹائیو، شمس نے جاں سخن آلائیو
قُمْ بِاِذْنِیْ آپ کہائیو، سِر پیروں کھل اتاریا ای
ایس عشق دے بڑے اڈمبر، عشق نہ چھپدا باہر اندر
عشق کیتا شاہ شرف قلندر، یاراں ورہے دریا وِچ ٹھاریا ای
عشق لیلےٰ دے دُھماں پائیاں، تاں مجنوں نے اکھیاں لائیاں
اوہنوں دھاراں[2] عشق چُنگھایاں، سو ہے برس گزاریا ای
عشق ہوری ہیرے دِل دھائے، تاہئیں رانجھے کن پڑوائے
صاحباں نوں جدوں پاہن آئے، سر مرزے دا واریا ای

---

[1] پھیلاؤ [2] دھاراں چُنگھایاں = مزہ چکھایا۔

سسّی تھلاں دے وِچ رُلائی، سوہنی کچے گھڑے روڑھائی
روڑے پیچھے گل گوائی، ٹکڑے کر کر ماریا ای
نوجواں قتل کرائیاں بھائیاں، مشکاں چوہیاں توں کٹوائیاں
ڈِٹھی قدرت تیری سائیاں، سرتیھوں بلہاریا ای
کورو پانڈو کرن لڑائیاں، اٹھاراں کھوہنیاں[1] ندّوں کھپائیاں
مارن بھائی سکیاں بھائیاں، کی اوتھے ہنیاں تاریا ای
نمرود نے بھی خدا سدایا، اُس نے رب نوں تیر چلایا
مچھر نوں نمرود مروایا، قاروں زمیں نگھاریا ای
فرعون نے جدوں خدا اکھایا، نیل ندی دے وچ آیا
اوسے نال اشتنڈ[2] جگایا، خودیوں کر نند ماریا ای
لنکا چڑھ کے ناد بجائیو، لنکا رام کولوں لٹوائیو
ہر ناکش قطعہ بہشت بنائیو۔ اوہ وِچ دروازے ماریا ای
سیتا دہسر[3] لئی بے چاری، ہنومنت[4] نے لنکا ساڑی
راون دی سب ڈھاہ اُتاری، اوڑک راون ماریا ای
گوپیاں نال کیہہ بَج کمایا، مکھن کاہن توں لٹوایا
راجے کنس نوں پکڑ منگایا، لودیوں پکڑ پچھاڑیا ای
آپے چا امام بنایا، اس دے نال یزید لڑایا
چودھیں طبقیں شور مچایا، سرنیزے تے چاڑھیا ای

---

[1] کھوہنی = فوج کی ایک خاص تعداد، جس میں ہاتھی، رتھ، گھوڑوں اور پیادوں کی کُل گنتی ۲,۱۸,۷۰۰ بتائی گئی ہے۔

[2] فساد، چالبازی

[3] دس سروں والا راون۔ [4] ہنومان

مُغلاں زہر پیالے پیتے ، بھُوریاں والے راجے کیتے
سب اشراف پھرن چُپ کیتے ، بھلا اوہناں نُوں جھاڑیا ای
بُلھا شاہ فقیر وچارا ، کر کر چلیا کُوچ نگارا
روشن جگ وِچ نام ہمارا ، نُوروں سِرج اتاریا ای
رَہ رَہ وے عِشقا ماریا ای
کہو کِس نُوں پار اُتاریا ای
(فقیر محمد: کلیات ، کافی ۶۵)

رَین گئی لٹکے سب تارے

اِس نظم میں دُنیا کی بے ثباتی خوبصورت پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ دُنیا کو سرائے کہا گیا ہے، جہاں لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ آواگون کا چکر ایک نا ختم ہونے والا چکر ہے۔ مرنے والے دوسرے کو نقارے کی چوٹ کہتے ہیں کہ اُن کی باری بھی آ رہی ہے، مگر اُن کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ شاید وُہ یہ سوچتے ہیں کہ موت دوسروں کے لئے ہے، ان کیلئے نہیں۔ بُلھے شاہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانی جسم بیش بہا دولت کا مخزن ہے جس میں خداوند کریم بھی شامل ہے، لیکن انسان انتہائی درجے کی جہالت کا شکار ہے۔ وُہ اُس کی تلاش باہر مندروں، مسجدوں میں کر رہا ہے جب کہ وہ اس کے بالکل نزدیک ہے۔ (موتی چونی پارس پاسے، پاس سمندر مر دپیاسے)

آخری بند میں بُلھے شاہ متلاشی کو یاد دلاتا ہے کہ مُرشد کے بغیر انسانی زندگی میں خدُا کے پانے کا سنہری موقع ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

رَین گئی لٹکے سب تارے
اَب تو جاگ مُسافر پیارے

آواگون سرائیں ڈیرے
ساتھ تیار مسافر تیرے

اجے نہ سُنیوں کُوچ نقارے
اَب تو جاگ مسافر پیارے

کر لے اَج کرن دا بیرا
بُہڑ[1] نہ ہوسی آون تیرا

ساتھ تیرا چلو چل پیارے
اب تو جاگ مُسافر پیارے

---

1. پھر۔

آپو اپنے وطن کو دَوڑے
کیا سُتھ[1] دھن کیا نِردھن[2] پیارے
لاہا نام تے لیو سنبھارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

موتی چُونی پارس پاسے
پاس سمندر مرو پیاسے
کھول اکھیں اُٹھ بوہ بھکالے
اب تو جاگ مُسافر پیارے

بُلھا! شوہ دی پیری پڑیئے
غفلت چھوڑ کُجھ حیلہ کریئے
مرگ جتن بِن کھیت اجاڑے
اب تو جاگ مُسافر پیارے

(انور علی رہتکی: قانونِ عشق۔ کافی ۲)

---

[1] امیر [2] غریب۔

ساڈے وَل مُکھڑا موڑ وے پیاریا

ایک دفعہ پھر ہیر اور رانجھے کی تمثیل استعمال کرتے ہوئے سائیں بُلھے شاہ اِس راز کو آشکار کرتے ہیں، کہ خداوند کریم خود انسان کے اندر اپنا عشق پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ تڑپ وُہ خود پیدا کرتا ہے، تو اس کی راحت بھی خود ہی مُہیّا کرے گا۔ عشق خُدا کی دین ہے اور یہ ساری کائنات میں گونج رہا ہے۔

آخری بند میں بُلھے شاہ اعلان کرتا ہے کہ عشق نے اُسے حیاتِ جاودانی عطا کر دی ہے۔ کُل عالم فنا ہو سکتا ہے لیکن وُہ نہیں۔

ساڈے وَل مُکھڑا موڑ، وے پیاریا
ساڈے وَل مُکھڑا موڑ

آپے لائیاں کُنڈیاں تَیں، تے آپے کھچدا ڈور
عرش کُرسی تے بانگاں مِلیاں، مکّے پے گیا شور
ڈولی پا کے لَے چلے کھیڑے، ناں کجھ عُذر نہ زور
جے مائے تینوں کھیڑے پیارے، ڈولی پا دئیں ہور
بُلھا شوہ اساں مرنا ناہیں، مرجاوے کوئی ہور
ساڈے وَل مُکھڑا موڑ، وے پیاریا
ساڈے وَل مُکھڑا موڑ

(رفعتِ محمد: کُلیات، کافی ٦٧)

ا۔ رُوح لافانی ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتی۔ صِرف جسم فنا ہوتا ہے۔

سائیں چھُپ تماشے نوں آیا

اِس کافی میں دُنیا کو ایک میلہ کہا گیا ہے، جس میں خدا مُرشد کی شکل میں آتا ہے۔ بُلھے شاہ لوگوں کو آواز دیتا ہے، کہ مُرشد کی اصلیت کو پہچانو۔ اور اُس کی موجودگی سے مستفید ہونے کی کوشش کرو۔

آخری بند میں وُہ مُریدوں کو پُر زور تنبیہہ کرتا ہے کہ لوگوں کی پروا نہ کرتے ہُوئے اعلانیہ مُرشد کو خدا مانو۔

سائیں چھُپ تماشے نوں آیا
تُسی رَل مِل نام دھیاؤ

لُٹک[1] سجن دی تاہیں چھپدی، ساری خلقت سِکدی تپدی
تُسی دُور نہ ڈھونڈن جاؤ، تُسی رَل مِل نام دھیاؤ
رَل مِل ستیو آتن[2] پاؤ، اِک بنے وِچ جا سماؤ
تا ہے گیت سجن دے گاؤ، تُسی رَل مِل نام دھیاؤ
بُلھا بات انوکھی ایہا، پریت لگی[3] تاں گھونگھٹ کیہا
تُسیں پردہ اکھیں تھیں چاؤ[4]، تُسی رَل مِل نام دھیاؤ
سائیں چھُپ تماشے نوں آیا
تُسی رَل مِل نام دھیاؤ

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۸۶)

---

[1] محبُوب کی محبت چھُپ نہیں سکتی۔ تمام خلقت اس کے لئے تڑپ رہی ہے۔

[2] آتن = ترنجن۔ ایک جگہ پر مِل کر عورتوں کی چرخہ کاتنے کی محفل۔ بنّا = دُولہا، اس کے نام کا وِرد کرو اور اُس محبُوب میں سما جاؤ۔

[3] عشق لگا کر شرم نہ کرو۔ [4] اندرُونی آنکھ کھولو۔

سانوں آمِل یار پیاریا

یہ نظم اُس شدید تڑپ کی ترجمانی کرتی ہے، جو بُلھے شاہ نے اپنے مُرشد کی جدائی میں محسوس کی۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب بہادر شاہ دُرانی نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ تباہی و بربادی کے اس دور میں مُرشد سے بچھڑا ہوا بُلھا اُس سے وصال کے لئے بے قرار ہے۔ آخری بند میں وہ پُر امید ہے، کہ اس کا مُرشد لوٹ آئے گا اور اس کی جُدائی کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی۔

سانوں آمِل یار پیاریا
ڈُوؔر دُور اساتھوں گیئوں، اصلاتے آکے بہہ رہیئوں
کِیہہؔ کسر قصُور وساریا، سانوں آمِل یار پیاریا

میرا اِکّ انوکھا یار ہے، میرا اوسے نال پیار ہے
کدےؔ سمجھیں وَڈ پرواریا، سانوں آمِل یار پیاریا

جدوںؔ اپنی اپنی پے گئی، دِھی ماں نوں لُٹ کے لے گئی
مُنہ ؔ بارھویں صدی لپاریا، سانوں آمِل یار پیاریا

دَرؔ کُھلا حشر عذاب دا، بُرا حال ہویا پنجاب دا
ڈرؔ ہاویئے دوزخ ماریا، سانوں آمِل یار پیاریا

بُلھاؔ شوہ میرے گھر آوسی، میری بلدی بھا بجھاوسی
عنایتؔ دَم دَم نال چتاریا، سانوں آمِل یار پیاریا

(فقیر محمد: کلیاں، کافی ۶۹)

۱؎ تم ہم سے دُور جا کر کیوں چھپ کر بیٹھ گئے ہو؟ ۲؎ ہم میں کیا خرابی یا کمی ہے جو تم نے قصُور شہر کو بھلا دیا ہے۔ ۳؎ مُرشد کو بڑے پریوار والا کہہ رہے ہیں، کیونکہ اُس کے مُرید بہت ہوتے ہیں۔ ۴؎ بارھویں صدی سن ہجری کے مطابق آپ کا اشارہ بہادر شاہ دُرانی کے حملے کی طرف ہے۔ اِس حملے سے یہ حالت ہو گئی، کہ کسی پر بھروسہ نہ رہا۔ بیٹیاں ماؤں کو لُوٹ کر لے گئیں، یعنی نزدیکی رشتہ دار بھی جان کے دُشمن بن گئے۔ ۶؎ ایسی بُری حالت کہ جیسے قیامت کے دُکھوں کا دروازہ کُھل گیا ہو۔ اس دوزخ کے دُکھوں سے جی گھبراتا ہے۔ ۹،۸؎ میرا مُرشد عنایت شاہ اپنے دیدار سے میرے جلتے ہوئے دِل کو ٹھنڈا کرے گا، میں پل پل اُس کو یاد کرتی ہوں۔

سب اِکّو رنگ کپاہیں دا

دُنیا میں نظر آ رہی اشیا اور صُورتوں کی کثرت مصنُوعی ہے۔ اِس کثرت کے پیچھے وحدت پوشیدہ ہے۔ کثرت نظر کا دھوکا ہے، وحدت ایک حقیقت ہے۔ بُلھے شاہ نے اِس سچائی کو سمجھانے کے لئے تین استعارے استعمال کئے ہیں۔ پہلا استعارہ کپاس کا ہے۔ کپڑے اور لباس گُوناگُوں ہیں، مگر یہ سب ایک ہی کپاس کے ریشے سے بنے ہیں۔ دُوسرا استعارہ چاندی کا ہے۔ چاندی سے بنے لاتعداد زیورات مستُورات زیبائش کے لئے پہنتی ہیں۔ زیورات مختلف ہیں، مگر ان کی اصلیت وہی چاندی ہے۔ تیسرے استعارہ میں کہا گیا ہے کہ تمام پیغمبر خدا کی طرف سے آتے ہیں، حالانکہ اُن کی صُورتیں مختلف ہیں۔ یسوع مسیح گڈریا کی شکل میں آئے، حضرت محمدؐ صاحب اُونٹوں کے رکھوالے بن کر آئے اور بھگوان کرشن نے گوالے کی شکل اختیار کی۔ سب پیغمبروں کی ہی نہیں، تمام انسانوں کی شکلیں بھی مختلف ہیں، مگر سب کے اندر ایک ہی حقیقت پوشیدہ ہے سب کے سب ایک ہی نُور کی کرنیں ہیں۔

سبؔ[1] اکّو رنگ کپاہیں دا

تانی[2] تانا پیٹا نلیاں، پیٹھ نڑا نے چھباں چھلیاں

آپو[3] اپنے نام جتاون، وکھو وکھی جاہیں دا

چونسی[4] پہنسی کھدر دھوتر، ململ خاصہ اکّا سُوتر

پُونی[5] وچوں باہر آوے، بھگوا بھیس گوسائیں دا

---

[1] ایک کپاس کئی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ اِسی طرح ایک خُدا کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

[2-3] تانے پیٹے اور نلیاں وغیرہ سب اپنے الگ الگ نام رکھوا کر غرُور کرتے ہیں۔

[4] کئی طرح کے کپڑے ایک ہی سُوت سے بُنے جاتے ہیں۔

[5] سادُھو کا بھگوا لباس بھی کپاس کی اُسی پُونی سے کاتے گئے سُوت سے بنا ہے۔

کڑیاں ہنتھیں چھاپاں چھلّے، آپوا پنے نام سوّ لے
ستھا ہکّا چاندی آکھو، کنگن چوڑا بانہیں دا

بھیڈاں بکریاں چارن والا، اُٹھ مجھیاں دا کرے سنبھالا
رُوڑی اُتّے گدّوں چارے، اوہ بھی واگی گائیں دا

بلّھا شوہ دی ذات کی پُچھنَیں، شاکر ہو رضائیں دا
جے توں لوڑیں باغ بہاراں، چاکر رہُ ارائیں دا
سب اکّو رنگ کپاہیں دا

(فقیر محمد کلیات، کافی ۷۰)

لے کئی قسم کے زیور ایک ہی چاندی سے بنتے ہیں۔ ےہ ایک ہی چرواہا کئی طرح کے مویشی چراتا ہے۔
شہ رَب کی ذات نہ پُوچھو۔ اس کی رضا میں راضی (شاکر) رہو۔ ۹ہ اگر بہاریں لُوٹنا چاہتے ہو، تو
ارائیں مُراد عنایت شاہ کے خادم بن جاؤ۔

سَجناں دے وِچھوڑے کولوں

اِس کافی میں شاعر نے عشق میں زخم خوردہ دوشیزہ کی حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ یہ حالتُ اس عاشق کی ہے جو اپنے مُرشِد یا خدا سے الگ ہو چکا ہے، اور اس کے وصال کے لئے تڑپ رہا ہے۔ آخری بند میں خدا کی طرف سے ملنے والے مُسرت آمیز پیغام کا ذکر ہے، جس میں عاشق کو اِن عذابوں کی دُنیا سے واپس بلایا گیا ہے۔

سَجناں دے وِچھوڑے کولوں
تن دا لہو چھانی دا

دُکھاں سُولاں کیتا الکیا، نہ کوئی سوہرا ناں کوئی پیکا
درد وِہُونی پئی در تیرے، تُوں ہیں درد ونجھائی دا[1]
کڈھ کلیجہ کرنی ہاں بیرے، ایہہ بھی نہیں ہے لائق تیرے
ہور توفیق نہیں وچ میرے، پیئو کٹورا پانی دا
ہُن کیوں روندے نین نراسے، آپے اوڑک بھا ہی بھا سے
ہُن تاں چھٹن اَوکھا ہویا، چارہ نہیں مکانی دا
مُلھا شوہ پیا ہُن گجے، عشق دمامے سرتے وَجے
چار دیہاڑے گوئل[2] واسا، اوڑک کوچ بھکانی[3] دا
سَجناں دے وچھوڑے کولوں
تن دا لہو چھانی دا

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۷۱)

---

[1] دُکھوں میں پیلی جا رہی کا تُو ہی سہارا ہے۔

[2] گوئل = گوالا۔ جس طرح سُوکھا پڑنے پر گوالا کچھ دنوں کے لئے دوسرے علاقے میں مویشی لے جاتا ہے اُسی طرح انسان چندروز کے لئے دُنیا میں آتا ہے۔

[3] بھکانی دا = کہا جاتا ہے۔

سدا میں سوہریاں گھر جانا

اِس نغمہ میں خدا کو دولھا اور مقامِ حق کو دُولھے کا گھر کہا گیا ہے۔ بُلھے شاہ نے اُس حالت کی خوش اسلوبی سے نقش آرائی کی ہے، جو ایک بے سلیقہ دُلھن کی شادی کے وقت ہوتی ہے۔ اُس نے باپ کے گھر میں رہتے ہوئے اپنی شادی کی موزوں تیاری نہیں کی۔ اِس لئے اب وُہ اپنی ساس اور نندوں کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے۔ اِس تمثیل میں بُلھے شاہ اُس شخص کی حالت بیان کرتا ہے جو اِس دُنیا کو چھوڑنے والا ہے اور جس نے اپنی آخرت کے لئے کوئی روحانی تیاری نہیں کی۔

آخری بند میں وُہ خدا سے دُعا کرتا ہے کہ وُہ (خدا) اُس پر رحمت کرے اور اُس کے گناہوں کو نظرانداز کر دے۔ اگر خدا انصاف پر اُتر آئے تو اس کیلئے کوئی جگہ نہیں (عدل کرے تاں جا نہ کائی، فضلوں بخرا پاوے)۔

سدا میں سوہریاں گھر جانا، نی رِل لئو سہیلڑیو
تُساں وی ہوسی اللہ بھانا، نی رِل لئو سہیلڑیو

رنگ برنگی سُول[1] اُپٹھے، چمبڑ جاون مینوں
دُکھ اگلے میں نال لے جاواں، پچھلے سونپاں کنہوں

اِک وچھوڑاں سئیاں[2] دا، جیوں ڈاروں کُونج وچھنی[3]
ماپیاں مینوں ایہہ کجھ دِتا، اِک چولی اِک چُنی

---

[1] سُول: کانٹے: پچھلے اعمال بھول گئے نہیں جاتے آگے اور اعمال کا بوجھ اکٹھا ہو جاتا ہے
[2] سئیاں: سہیلیاں
[3] آ گئی۔

داج[1] ایہناں دا ویکھ کے ہن میں، ہنجو بھر بھر رُنی[2]
سس ننا ناں دیون طعنے، مُشکل بھاری پُنی

ٹلھا شوہ ستار[3] سنی دا، اِک ویلا ٹل جاوے
عدل[4] کرے تے جا نہ کائی، فضلوں بخرا پاوے

سدا ئیں سوہریاں گھر جانا
نی مل لئو سہیلڑیو

فقیر محمد کلیات
کافی ۲۷

---

[1] اتنا تھوڑا جہیز دیکھ کر میں زار زار رو رہی ہوں۔ [2] آ گئی۔ [3] ستار: پردہ پوش۔ ڈھانپنے والا۔ اگر وُہ پردہ پوش رحم کرے۔ تو مشکل وقت نِکل جائے گا۔ [4] اگر رب انصاف پر اُتر آئے تو کوئی ٹھکانہ نہیں، کیونکہ میرے اعمال سیاہ ہیں۔ صرف اُس کی رحمت سے ہی مجھے کچھ خیرات (بخرہ) مِل سکتی ہے۔

سَیّئو نی رَل دیئو وَدھائی

ایک مرتبہ پھر بُلھے شاہ ہِیر اور رانجھے کی تشبیہہ دے کر اپنے مُرشد عنایت شاہ سے ملنے کی خوشی اور شکرانہ کا اظہار کرتے ہیں۔ (سَیّئو رَل رِل دیئو وَدھائی۔ مَیں وَر پایا رانجھا ماہی) مُرشد اِس دُنیا میں ارائیں کی شکل میں آیا ہے۔ اور لوگ اُس میں چھپی ہُوئی الٰہی حقیقت کو نہیں دیکھتے۔ ؎

ہتھ کھونڈی سر کمبل دھریا، چاکاں والی شکل بنائی
مکھٹ گوال دے اندر رُلدا، جنگل جُوہاں وِچ کس مُل دا
ہے کوئی اللہ دے وَل بُھلدا؟ اصل حقیقت خبر نہ کائی

آخری بند میں عشق میں پیش آنے والی مصیبتوں کا ذکر ہے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ اِس سَودے میں نفع نقصان کا کوئی سوال نہیں، بلکہ مصیبتوں کی گٹھڑی اُسے سر پر اٹھانی پڑی۔ ؎

نہ کجھ لاہا ٹوٹا لیتا۔ دُکھ دَرداں دی گٹھڑی چائی

کافی کے شروع میں مُرشد کے ملنے پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اِس کے برعکس آخری سطروں میں اُن سخت دُشواریوں کا بیان ہے جن کا مُرشد تک پہنچنے کے لئے سامنا کرنا پڑا۔

سَیّئو نی رَل دیئو وَدھائی
مَیں وَر[1] پایا رانجھا ماہی

اَج تاں روز مبارک چڑھیا
رانجھا ساڈے ویہڑے وَڑیا
ہتھ کھونڈی سر کمبل دھریا
چاکاں[2] والی شکل بنائی

---

[1] وَر = شوہر، دُولہا

[2] چاک = چاکر، نوکر، بھینسیں چرانے والوں کی سی شکل بنائی ہے۔

مکھ[1] گوواں دے اندر رُلدا
جنگل جوہاں وِچ کِیں مُلدا
ہے[2] کوئی اللہ دے وَل بھُلدا؟
اصل حقیقت خبر نہ کائی

بلھے شاہ اِک[5-6] سودا کیتا
پیتا زہر پیالہ پیتا
نہ کُجھ لاہا ٹوٹا لیتا
دُکھ دَرداں دی گَھٹڑی چائی

سَیئو نی رَل دیئو وَدھائی
مَیں وَر پایا رانجھا ماہی
(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ صفحہ ۴۳/۴۴)

---

[1] وہ شہنشاہ ہے لیکن اس وقت اس کی شان (مکھ) گئوؤں اور جنگل بیابانوں میں خراب ہو رہی ہے۔

[2] اس میں اللہ کا عکس جھلکتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت کا پورا پتہ کسی کو نہیں ہے۔ [5-6] عشق کا سودا کرنا اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینے کی مانند ہے۔ اس میں نفع نقصان کا سوال نہیں، بلکہ یہ تو سر پر دکھوں تکلیفوں کی گٹھڑی اٹھانے والی بات ہے۔

سے ونجارے آئے نی مائے

اِس کافی میں استعارۃً اولیاء اللہ کو لعلوں کے سوداگر کہا گیا ہے۔ وُہ یہاں دُنیا میں بیش بہا ہیرے جواہرات بیچنے کے لئے آتے ہیں، مگر بہت کم خریدار اُن کو خریدنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اِن ہیروں کی قیمت 'سر' یا زندگی ہے۔ رمزیہ طور پر اس کا مفہوم یہ ہے، کہ جو لوگ جیتے جی مرنے کے لئے تیار ہیں، وُہی یہ رُوحانی دولت حاصل کرنے کے حقدار ہیں۔ جیتے جی مرنے سے مُراد رُوح کو جسم کے نو دروازوں سے سمیٹ کر آنکھوں کے مرکز پر یکسُو کرنا ہے۔ جو شخص سُوئی کی چُبھن برداشت نہیں کر سکتا، وُہ رُوح کو مکمّل طور پر جسم سے کیسے نکال سکتا ہے (ڈھہ سُوئی دا کدے نہ کھادا، اوہ بچّھن سر بارے)، نظم کا مفہُوم یہ ہے، کہ لوگ خُدا سے وصال تو کرنا چاہتے ہیں، مگر اِس وصال کی قیمت ادا کرنے کیلئے تیار نہیں۔

سے ونجارے آئے نی مائے، سے ونجارے آئے[1]
لالاں دا اوہ ونج کریندے، ہوکا آکھ سُنائے

سُنیا ہوکا، مَیں دِل گُذری[2] مَیں بھی لال لیا واں
اِک نہ اِک کنّاں وِچ پاکے، لوکاں نُوں دِکھلاواں[3]

---

[1] سے ونجارے: وُہ سوداگر۔ ونجارے نام کے ہیرے جواہرات کا بیوپار کرنیوالے اولیا اور کامل مُرشِد ہیں۔ ان کی آواز سُن کر انسان کے دِل میں لعل خریدنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے، لیکن وُہ دنیاوی خیالات کے تحت لعل خریدنا چاہتا ہے (لوکاں نوں وکھلاواں)۔ جب ونجارے مول بتاتے ہیں، تو لوگ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ قیمت کیا ہے؟ (جے تُوں آئی ہیں لعل خریدن، دھڑ توں سیس لہائیں)۔ قیمت 'سر' یعنی نفس کو ترک کرنا پڑتا ہے اور نفسانی خیالات کو چھوڑ کر مُرشد کی ہدایت کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔

[2] مَیں دِل گُذری: میرے دِل میں آئی۔

[3] کانوں میں پہن کر لوگوں کو دکھاؤں یعنی ہم لوگ کلمہ کے شغل کا دکھاوا کرتے ہیں۔

کلام: کافیاں

کچی[1] کچ، ویہاج نہ جاناں، لال ویہاجن چلی
پلے[2] خرچ نہ، ساکھ نہ کائی، دیکھو ہارن چلی

جاں میں مل اوتہاں توں پچھیا، مل کرن اوہ بھارے
ڈمھ سوئی دا کدے نہ کھاہدا، اوہ پچھن سر بارے

جیہڑیاں[3] گئیاں لال ویہاجن، اوہناں سیس لہائے
سے ونجارے آئے نی مائے، سے ونجارے آئے

(نذیر احمد: کلام بلھے شاہ: صفحہ ۴۲)

---

[1] دنیاوی خیالات کے کچے لوگ مایا (کانچ) کی خواہش رکھتے ہیں۔ نام کا مول نہیں جانتے۔ [2] میرے پاس کوئی پونجی نہیں جس سے میں مہنگے بھاؤ والے لعل خرید سکوں۔ ساکھ نہ کائی = کوئی اہمیت نہیں۔
[3] لعل ان ہی کو ملے جنہوں نے ہنس ہنس کر سر قربان کر دیا۔

عشق اساں نال کیہی کیتی

یہ کافی اُن دُکھوں کا بیان کرتی ہے۔ جو عاشق اپنے معشوق کے ہجر میں اٹھاتا ہے۔ عاشق نہ صرف اپنے معشوق کے فراق میں دُکھی ہے، بلکہ اُسے دُنیا کے طعنے بھی سُننے پڑتے ہیں۔ بُلھے شاہ اس کافی میں غالباً اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جب وُہ اپنے مُرشد شاہ عنایت سے بچھڑا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں وہ لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنا ہوا تھا، کیونکہ عنایت شاہ ایک نیچی ذات سے تعلق رکھتا تھا اور ارائیں کا ادنےٰ پیشہ اختیار کئے ہُوئے تھا۔ اِس کے برعکس بُلھے شاہ سیّد ذات سے تھا، جو کہ حضرت محمدؐ صاحب کی ذات تھی۔

تیسرے بند میں بُلھے شاہ کو یہ احساس ہے کہ وُہ ابھی عشق میں کچا ہے، کیونکہ وُہ آنسوؤں کے ذریعہ اپنا راز فاش کر دیتا ہے۔ ایک دانا عاشق عشق کے خزانے کو بہت سنبھال کر رکھتا ہے، اور اس کا راز کسی پر کھلنے نہیں دیتا۔ اُس کے لبوں پر مُہرِ خموشی رہتی ہے، اور وُہ اپنے معشوق کی جفا کی کبھی شکایت نہیں کرتا۔

آخری بند میں وُہ خدا سے دُعا کرتا ہے کہ وُہ اپنے مہر و کرم سے اُسے اپنے معشوق سے ملا دے۔

عِشق اساں نال کیہی کِیتی ، لوک مریندے طعنے
دِل دی ویدن[1] کوئی نہ جانے اندر دیس بگانے
جس نوں چاٹ امر[2] دی ہووے ، سوئی امر پچھانے
ایسی عِشق دی اوکھی گھاٹی ، جو چڑھیا سو جانے
عِشق اساں نال کیہی کِیتی ، لوک مریندے طعنے

آتش عِشق فراق[3] تیرے نے ، پل وِچ ساڑ وکھائیاں
ایس عِشق دے ساڑے کولوں ، جگ وِچ دیاں دُہائیاں

[1] ویدن = درد۔ [2] امر = رضا۔ [3] آتشِ عشق = پیار کی آگ : فراق = جُدائی۔

جِس تن لاگے سو تن جَلنے، دُوجا نہ کوئی جانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

مَیں انجانی نیونہہ کیہہ جاناں، جانے سُگھڑ سیانی
ایس ماہی دے صدقے جاواں، جِس دا کوئی نہ ثانی
رُوپ سَرُوپ انُوپ ہے اس دا، شالا جوانی مانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

ہجر تیرے نے جَھلّی کر کے، کملی نام سدایا
صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ ہو کے، اپنا وقت لنگھایا
کر ہُن نظر کرم دی سائیاں، نہ کر زور دھگانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

ہَس بلاواں تیرا جانی، یاد کراں ہر ویلے
پَل پَل دے وِچ ہجر دی پیڑوں، عِشق مریندا بیلے
رو رو یاد کراں دِن راتیں، پچھلے وقت وہانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

عِشق قصائی جیہی کیتی، ہرگز خبر نہ کائی
عِشق جوانی لائی چھاتی، بھیت نہ جھاتی پائی
ماپیاں کولوں چُھپ چُھپ رَوواں، کر کر لکھ بہانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

فضل تیرا درکار اساں نوں، ہر ویلے ہر حیلے
پاک رسولؐ محمد سرور، میرے خاص وسیلے
مُلھّا شوہ جے مِلے پیارا، لکھ کراں شُکرانے
عِشق اساں نال کیہی کیتی، لوک مریندے طعنے

(عبدالمجید بھٹی: کافیاں بُلھے شاہ، صفحہ ۱۵۳)

عشق حقیقی نے مُٹھی کُڑے

اِس کافی کا مضمون عشق اور عقل میں امتیاز کرنا ہے۔ یہ وہ دو راستے ہیں جن کے ذریعے متلاشی خدا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ عشق کے ذریعے متلاشی خدا کو براہِ راست پالیتا ہے۔ اور وہ سرور بھی حاصل کرتا ہے جو اس کے وصال سے ملتا ہے۔ اِس کے برعکس عقل اور منطق اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی حضوری سے محروم رکھتے ہیں۔ ان میں براہِ راست مشاہدہ کی شدت غائب ہے (مَیں پڑھ پڑھ علم بگھچی کُڑے)

راہِ عشق میں شرعی رسم و رواج کار آمد ثابت نہیں ہوتے۔ یہ کبھی خدا تک نہیں لے جا سکتے۔ (نماز روزہ اونہاں کی کرنا، جنھاں پریم صراحی لُٹی کُڑے)

آخری بند میں مُرشد کی موجودگی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جس سے زندگی کی اذیتوں سے نجات ملتی ہے (مُلّھا شوہ دی مجلس بہہ کے سب کرنی میری چھُٹی کُڑے)

عشق حقیقی نے مُٹھی کُڑے

مینوں دسّو پیا دا دیس

ماپیاں دے گھر بال ایانی، پیت لگا کے لُٹی[1] کُڑے

منطق[2] معنے کنز[3] قدوری[4]، مَیں پڑھ پڑھ علم بگھچی[5] کُڑے

نماز روزہ اونہاں کیہہ کرنا، جنہاں پریم صراحی لُٹی کُڑے

مُلّھا شوہ دی مجلس بہہ کے، سب کرنی میری چھُٹی کُڑے

مینوں دسّو پیا دا دیس

نی مینوں دسّو پیا دا دیس

(فقیر محمد: کلیات،

کافی ۷۷)

---

[1] لُوٹ لیا۔ [2] منطق = دلیل [3] کنز = گرامر۔ [4] قدوری = لیاقت۔ [5] خوار ہوئی۔

عِشق دی نوئیوں نویں بہار

عِشق ہمیشہ نیا اور تازہ رہتا ہے۔ اِس کے ظہور کی بر موقع اپنی ہی ایک شان ہے۔ یہ رسموں رواجوں کا دشمن ہے۔ عِشق جب کسی عابد میں رُونما ہوتا ہے، تو وُہ عبادت گاہوں جیسے کہ مسجد، مندر میں جانا ترک کر دیتا ہے۔ اس کی عبادت گاہ اُس کا اپنا جسم بن جاتا ہے، جس کے اندر وُہ خُدا کا ظہور دیکھتا ہے اور نغمۂ الٰہی سے سرشار ہوتا ہے۔

اُس کے دِل سے 'میرے' 'تیرے' کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا دِل بے داغ ہو جاتا ہے۔ وُہ ہر ایک کے اندر خُدا کو دیکھتا ہے۔

گمراہ مُتلاشی خدا کو باہر مندروں، مسجدوں میں تلاش کرتا ہے، جب کہ وُہ ہر دم اُس کے اندر مقیم ہے۔ (بُھلی ہیر ڈھونڈیندی بیلے، رانجھا یار بُکل وِچ کھیلے) خُدا کا مُشاہدہ نہ صِرف الٰہی نغمہ کی صُورت میں ہوتا ہے، بلکہ الٰہی نُور کی شکل میں بھی ہوتا ہے (جس پایا تِس نُور انوار)

چوتھے پانچویں اور چھٹے بند میں شرعی روایات کی سخت مذمت کی گئی ہے (بید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے، سجدے کر دیاں گھس گئے متھے۔ ناں رَب تیرتھ ناں رَب مکّے.... پھوک مصلّے بھن سٹ لوٹا، نہ پھڑ تسبیح عاصا سوٹا۔ عُمر گوائی مَوج وِچ مستی۔ اندر بھریا نال پلیتی)

آخری بند میں بُلّھے شاہ پھر کہتا ہے کہ عِشق کی مستی میں بیرُونی سجدے فراموش ہو جاتے ہیں، اور قوتِ عِشق اس کو حق کے کلمات کہنے پر مجبُور کر دیتی ہے (بُلّھا ہُندا چُپ بہتیرا عشق کریندا مارو مار)

عِشق دی نوئیوں نویں بہار

جاں میں سبق عِشق دا پڑھیا، مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے[1] جا ٹھاکرُ دے وَڑیا، جتھے وَجدے ناد ہزار

عِشق دی نوئیوں نویں بہار

1۔ جب میں مسجد سے ناکام لوٹا، تو اپنے محبُوب کو اپنے اندر پایا (ڈیرے جا ٹھاکر دے وَڑیا) جہاں ہزاروں دلکش نغمات گونج رہے ہیں۔

جاں میں رمز عشق دی پائی، مینا طوطا مار گوائی[۱]
اندر باہر ہوئی صفائی، جت ول ویکھاں یار دیار
عشق دی نوئیوں نویں بہار

ہیر را نجھے دے ہو گئے میلے، بھلی ہیر ڈھوڈ ہندی بیلے[۲]
رانجھا یار بکل وچ کھیلے، مینوں سدھ رہی نہ سار
عشق دی نوئیوں نویں بہار

بید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے، سجدے کر دیاں گھس گئے متھے
ناں رب تیرتھ ناں رب مکے، جس پایا تس[۳] نور انوار
عشق دی نوئیوں نویں بہار

پھوک مصلیٰ بھن سٹ لوٹا، نہ پھڑ تسبیح عاصا سوٹا
عاشق کہندے دے دے ہوکا، ترک حلالوں[۴] کھاہ مردار
عشق دی نوئیوں نویں بہار

عمر گوائی وچ مسیتی، اندر بھریا نال پلیتی[۵]
کدے نماز توحید[۶] نہ کیتی، ہن کیہہ کرنا ایں شور پکار
عشق دی نوئیوں نویں بہار

عشق بھلایا سجدہ تیرا، ہن کیوں اینویں پاویں جھیڑا
بلھا ہندا چپ بہتیرا، عشق کریندا مارو مار

(نقش، کلیات، کافی ۶۷)

---

۱ عشق الٰہی میں میرا تیرا، یعنی دوئی کے طوطا مینا کو مار دیا۔ ۲ جب ہیر (روح) کا رانجھا (خدا) سے وصال ہو گیا، تو اسے احساس ہوا کہ وہ لاعلمی کے باعث اسے باہر ڈھونڈ رہی تھی ۳ جس نے بھی اسے پایا ہے، نور کی صورت میں پایا ہے۔ ۴ حلال = جس کو شریعت واجب کہتی ہے۔ مردار = جسے شرعی طور پر ناواجب قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی شرع کا راستہ چھوڑ کر عشق کا راستہ پکڑ لے۔ ۵ پلیتی = غلاظت یعنی عیب ۶ نماز توحید = یکسوئی لانے والی نماز۔

علموں بس کریں او یار

وُہ علم جو خدا تک نہیں پہنچاتا بے کار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وُہ کئی بار خدا کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ دُنیاوی علم حاصل کرنے کی بجائے انسان کو چاہیئے کہ وُہ اپنی توجہ کو خدا کی وحدیت حاصل کرنے میں لگائے (اکّو الف تیرے درکار)۔

دُوسرے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ بے شمار کتابیں ——جن میں مذہبی کُتب بھی شامل ہیں — پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ مُرشد کی ہدایت کے مطابق جو بھی پڑھا جائے اُس پر عمل کیا جائے۔

تیسرے بند میں اُن عُلماء کی طرزِ زندگی کا ذکر ہے جو اپنے آپ کو عالم کہلوانے میں فخر محسُوس کرتے ہیں، لیکن جو مکمل طور روحانی دولت سے بے بہرہ ہیں۔ اِس دُنیا سے جاتے وقت اُن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنا وقت فضُول کھو دیا۔ مگر افسوس! یہ احساس بہت دیر میں جاگتا ہے۔

چوتھے، پانچویں اَور چھٹے بند میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کِس طرح واعظ مذہب کے نام پر بھولے بھالے لوگوں کو ورغلاتے ہیں۔ اُن کے وعظ اَور عمل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ اُن کے اعمال کے پیچھے جو مقصد کارگر ہے، وُہ ہے ذاتی مفاد اَور اپنی عظمت کا سِکّہ جمانا۔

کئی بار دُنیاوی علم کا حاصل کرنا علم نجوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِس علم کا شائق نہ صرف منطقۃ البرُوج[1] کے حساب کتاب میں پھنس جاتا ہے، بلکہ جادُو ٹونے کا عمل بھی شروع کر دیتا ہے۔ اِس علم کے باقی نقصاندہ نتائج یہ ہیں کہ ایسا عالم اخلاقی اَور رُوحانی قدروں سے محروم رہتا ہے۔ (پھڑے سعد نے چھڈے چور...... دھیلا تے کے چھُری چلاویں)

اِن کے علاوہ اِس علم سے جو پیچیدگیاں لاحق ہوتی ہیں اُن میں شکوک وشبہات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام علم راہی کے لئے روحانی ترقی میں سدِ راہ ہیں۔ جب تک مُتلاشی خدا سے الگ ہے، اس کی زندگی خستہ اَور قابلِ رحم ہے۔

---

[1] آسمان پر ایک بہت بڑا دائرہ ہے جس پر بارہ بُرج آسمانی واقع ہیں۔ جسے ہندی میں راس منڈل کہتے ہیں

بارھویں بند میں شیطان کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں آدم اور حوّا کو شجرِ لافانی (Tree of Immortality) کا پھل کھانے پر اکسایا گیا۔ (قرآن XX، ۱۱۶-۱۲۱)
علاوہ ازیں اپنے علم کے غرور میں آدمؑ نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا، کہ وہ انسان کے آگے جھکے۔ (قرآن XV ۳۰۳)

آخری بند میں بُلّھے شاہ اپنے مُرشد کے تئیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، جو عشق کے پُرخوف و خطر راستے پر مُشکلات سے بچاتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔

علموں بس کریں او یار!

علم نہ آوے وِچ شمار، اِکّو الف تیرے درکار
جاندی عُمر نہیں اعتبار، علموں بس کریں او یار

پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر، قُرآن کتاباں[1] چار چوپھیر
گِردے چانن وِچ انھیر، باجھوں رہبر[2] خبر نہ سار

پڑھ پڑھ شیخ[3] مشائخ ہویا، بھر بھر پیٹ نیند بھر سویا
جاندی وار نین بھر رویا، ڈُباوِچ[4] اُرار نہ پار

پڑھ پڑھ علم ہویا نُورانا[5]، بے علماں نُوں لُٹ لُٹ کھانا
اِیہہ کی کیتا یار بہانا، کریں ناہیں کدے اِنکار

پڑھ پڑھ نفل[6] نماز گزاریں، اُچیاں بانگاں چانگھاں ماریں
منبر چڑھ کے وعظ پکاریں، تینوں کیتا حرص خوار

[1] کتاباں: زبُور، توریت، انجیل اور قُرآن کو کُتب یا کتابیں کہا جاتا ہے۔ یہاں مُراد مذہبی کُتب سے ہے۔
[2] مُرشد کے بغیر سچ کا علم نہیں ہو سکتا۔ [3] شیخ کی جمع [4] جس کو سچ کا پتہ ہی نہ ہو، اُس کی تو بات ہی الگ ہے۔ لیکن جو سچ سے متعلق سب کچھ پڑھ پڑھا کر بھی اُس کے ساتھ ملاپ نہ کرے، وہ اِس کی نہ یہ دُنیا رہی نہ دوسری دُنیا۔ [5] نُورانا: حیران [6] نفل: بندگی۔ چانگھاں: چیخیں۔ آپ اُونچی اونچی اذان دینے کو چیخیں مارنا کہتے ہیں۔ منبر: مسجد میں وعظ کرنے کی جگہ۔

پڑھ پڑھ مُلاں ہوئے قاضی، اللہ علماں باجھوں راضی
ہووے حرص دنوں دن تازی، نفع نیت وِچ گزار

پڑھ پڑھ مسئلے روز سناویں، کھانا شک شبہ دا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کماویں، اندر کھوٹ باہر سچیار

پڑھے[1] پڑھ علم نجوم بچارے، گِندا رہیا سیں بُرج ستارے
پڑھے[2] ۶۰ یمتاں منتر جھاڑے، ابجد گنے تعویذ شمار

علموں پئے قضئیے ہور، اکھیں والے انھے کور
پھڑے سعد تے چھڈے چور، دوہیں جہانیں ہویا خوار

علموں[3] پئے ہزاراں پھستے، راہی اٹک رہے وچ رستے
ماریا ہجر ہوئے دل خستے، پیا وچھوڑے دا سر بھار

علموں میاں جی کہاویں، تنبا چُک چُک منڈی جاویں
دھیلا[4] لے کے چھری چلاویں، نال قصاباں بہت پیار

بہتا علم عزازیل نے پڑھیا، جھگا جھاہا اُس دا سڑیا
گل وِچ طوق لعنت دا پڑیا، آخر گیا اوہ بازی ہار

جد میں سبق عشق دا پڑھیا، دریا ویکھ وحدت دا وڑیا
گھمن گھیرے دے وچ اڑیا، شاہ عنایت کیتا پار

---

[1] پڑھنِشی = نجومی ستاروں کی کئی طرح سے گنتی کرتے ہیں۔ [2] ۶۰ یمت = دُنیاوی سُکھ کے لئے عبادت کرنا۔ ابجد = حروفِ ہجی ا۔ ب۔ پ وغیرہ کے حساب سے جوتش لگانا۔ تعویذ = ٹوٹکا، جنتر = آپ کئی طرح کے جادو ٹونے تنتر، منتر، جوتش وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ رب سے وصال کا ذریعہ نہیں ہیں۔ [3] علم کی اُلجھنوں میں پڑ کر کئی عابدوں کا رُوحانی سفر رُک گیا۔
[4] مولوی دھیلا لے کر بکرا ذبح کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

*بُلھا[1] رافضی ہے نہ سُنّی، عالم فاضل نہ عالم جینی[2]
اِکو پڑھیا علم لدُنّی[3]، وحدت الف[4] میم درکار
علموں بس کریں او یار

انور علی رہتکی،
"قانونِ عشق"، صفحہ ۲۷۷-۲۸۰-کافی نمبر ۸۰

۱؎ مُسلمانوں کا ایک فرقہ۔ ۲؎ وقت کے حساب سے نجوم لگانے والا۔ ۳؎ عرفانِ حق کا علم۔
۴؎ وحدت میں میم سے مطلب احد سے احمد بنا ہے۔ اس کے رمز یہ معنی ہیں کہ خدا کو پانے کے لئے مُرشد کا ہونا ضرورِی ہے۔
* یہ بند فقیر محمد کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

کت کُڑے نہ وَت کُڑے

یہ نظم انسان کے لئے ایک تنبیہہ بھی ہے اور یاد دہانی بھی۔ تنبیہہ اس بات کی ہے کہ زندگی کا مقصد حاصل کرنے کیلئے وقت بہت کم ہے، اور یاد دہانی اس بات کی ہے کہ اِس قلیل وقت کو فضول دھندوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ چرخے کا استعارہ جو اِس کافی میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی جسم کے لئے ہے۔ اور چرخہ کاتنے سے مُراد وُہ عبادت ہے، جس میں رُوح کی تار کو جسم سے نکال کر آنکھ کے مرکز پر لایا جاتا ہے۔ شادی کے دِن سے مُراد موت کا وقت ہے، جب کہ رُوح کو خُدا کے حضوُر میں پیش ہونا پڑے گا۔ لڑکی کا مائیکا یہ عالمِ فانی ہے، جہاں اس کا قیام مختصر ہے۔ جہیز کا اشارہ روحانی دَولت کی طرف ہے، جو عبادت کے ذریعہ اکٹھی کی جاتی ہے۔ رُوحانی شغل کے بغیر آخرت کے روز عذاب جھیلنے پڑیں گے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں، کہ روحانی دَولت کے بغیر دُنیاوی دولت، رُتبہ اور اقتدار وغیرہ کسی کام کے نہیں۔

کتے[1] کُڑے ناوَت کُڑے ۔ چھلی لاہ بھڑولے گھت کُڑے
جے پُونی پُونی کتیں گی ۔ تاں ننگی مُول نہ وَتیں گی
سَو ہریاں[2] دے جے کتیں گی ۔ تاں کاگ مارے گا جھٹ کُڑے

---

1 رُوح کو جوان لڑکی، دُنیا کو مائیکا، خُدا کی عبادت اور نیک اعمال کو کاتنا و جہیز تیار کرنا کہا گیا ہے۔ چھلی لاہ کے بھڑولے وِچ پاؤنا = عبادت کا خزانہ جمع کرنا ہے۔ بُوند بُوند سے تالاب بھر جاتا ہے۔ ذِکر جو میں لگایا گیا پَل پَل حساب میں جمع ہوتا ہے، اور آخری وقت تک ریاضت کا ایک بڑا خزانہ اکٹھا ہو جاتا ہے، جو عاقبت میں کام آتا ہے۔ عاقبت سسرال کے گھر کو بھی کہا گیا ہے۔ 2 زیادہ تر درس "ستے درہیاں دا جے کتیں گی" دیا گیا ہے، جو کافی کے بنیادی معنوں کے متناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ایک طرف پُونی پُونی کاتنے کی ہدایت کرنا اور دوسری طرف سَو سال کے کاتے کو شیطان (کوّے) کی زد کے اندر کہنا کافی کے مزاج کے بالکل متضاد ہے۔ "سَو ہریاں دے جے کتیں گی" کا مضمون یہاں کافی کے مفہوم کے مطابق ہے۔

وِچ غفلت جے تیں دِن جالے، کتّ کے کُجھ نہ لیئو سنبھالے
باجھوں گُن شَوہ آپنے نالے، تیری[1] کیونکر ہوسی گت کُڑے

مائی[2] پیو تیرے گنڈھیں پائیاں، اَجے نہ تینُوں سُرتاں آئیاں
دِن[3] تھوڑے تے چا مکائیاں، نہ آسیں پیکے وَت کُڑے

جے[4] داج وہُونی جاویں گی، تاں کسے بھلی نہ بھاویں گی
اوتھے شَوہ نُوں کویں رِجھاویں گی، کُجھ لے فقراں دی مَت کُڑے

تیرے نال دِیاں داج رنگائے نی، اوہناں سُوہے ساوُو پائے نی
تُوں پیر اُلٹے کیوں چائے نی، جا اوتھے لگی تت کُڑے

بُلھا شَوہ گھر آپنے آوے، چوڑا بیڑا سب سُہاوے
گُن[5] ہوسی تاں گلے لگاوے، نہیں روسیں نیلیں رَت کُڑے

کت کُڑے نہ وَت کُڑے
چھلّی لاہ بھڑولے گھت کُڑے

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۸۱)

۱ے تیری نجات کیونکر ہو گی۔

۲ے گنڈھیں پائیاں = ماں باپ (قدرت) نے تیری شادی (موت) کا وقت مقرر کر دیا ہے۔

۳ے جو تھوڑا بہت وقت تیرے پاس تھا، وہ تم نے چاؤ (شوق) میں ختم کر دیا۔ کاتنے (عبادت) کی طرف دھیان نہ دیا۔

۴ے تم جہیز کے بغیر خالی ہاتھ جاؤ گی تو کسی کو اچھی نہیں لگو گی۔

۵ے اگر گُنوں یعنی اوصاف (نیک اعمال، جس میں عبادتِ الٰہی کو زیادہ دخل ہے) کا جہیز اکٹھا نہیں کر دگی، تو محبوب (اللہ تعالٰی) کا وصال حاصل نہیں ہو گا۔ اور تو خون کے آنسو روئے گی۔

کدی آپنی آکھ بلاؤ گے

یہ نظم بُلھے شاہ کی اپنے محبوبِ حقیقی سے وصال کی شدید آرزو کی عکاسی کرتی ہے۔ محبوب کے وصال میں نفس سدِ راہ ہے۔ اس کے وصال کے لئے عشق اور وَجد مددگار ثابت ہوتے ہیں نہ کہ عقل و علم۔

چوتھے بند میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وصال کا وسیلہ مُرشدِ کامل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مُریدوں کے لئے مُرشدِ مجسم خُدا ہوتا ہے (جد انحدبن دو نین دھرے، اگے سربن دھڑکے لا کھ پڑے)۔

پانچویں بند میں عشق کے نشیب و فراز کو خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کبھی خوشی ہے کبھی غم۔ خوبی یہ ہے کہ عاشق کو شدید دُکھ کے مرحلے سے گُزرنا پڑتا ہے، مگر وُہ پھر بھی عشق کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عشق کا ایسا طلسمی اثر ہوتا ہے کہ دُکھ بھی جانفزا بن جاتا ہے (ا یہہ جادُو ہے کہ لُوٹا اے، اِس روگ کا بھوگ بناؤ گے)۔

چھٹے بند کے آخری مصرعوں میں افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ دُنیا فقراء کو جب وُہ زندہ ہوتے ہیں، اذیتیں پہنچاتی ہے۔ اور جب اُن کی جان لے لیتی ہے تو اُن کی موت کے بعد اُن کی تعریف کے ڈھول پیٹنے شروع کر دیتی ہے۔ (جب دار اُوپر سر وارے گا، تب پیچھے ڈھول بجاؤ گے)

ساتویں بند میں خُوبصورت تشبیہات کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ عشق شرعی رسموں رواجوں سے بالکل مبّرا ہے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں، کہ میں نے جسم کو کباب، آنسوؤں کو شراب، ہڈیوں اور رگوں کو رباب بنا لیا ہے۔ اِس مت کو کس مذہب کا نام دو گے؟

میں اپنا مَن کباب کیا، آنکھوں کا عرق شراب کیا
رگ تاراں ہڈ رباب کیا، کیا مَت کا نام بلاؤ گے؟

نویں بند میں اُس صُوفیانہ وَجد کا ذکر کیا گیا ہے جو محبوبِ حقیقی کے دیدار سے طاری ہوتا ہے۔ اِس میں بُلھے شاہ کا اپنے مُرشد کے لئے خراجِ عقیدت بھی شامل ہے، جو مجسم شکلِ خُدا ہے۔ (دِن روز عنایت آیا ہے، ایویں اپنا آپ جتاؤ گے)۔

آخری بند میں ایک رُوحانی رمز پوشیدہ ہے۔ یہاں آنکھوں کو سمجھانے کی بات کہی گئی ہے۔

جس کا مطلب رُوح کو آنکھوں سے اُوپر اُٹھانے کا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے، کہ جب تک رُوح مُرشد میں جذب نہیں ہوتی، وُہ خدا کا دیدار نہیں کر سکتی۔ اِس طرح اِس کافی میں فنافی الشیخ و فنافی اللہ کے مضمون خوش اسلوبی سے نبھائے گئے ہیں۔

بلھا شوہ نُوں ویکھن جاؤ گے، اِنہاں اکھیاں نُوں سمجھاؤ گے
دیدار تداں ہی پاؤ گے، بن شاہ عنایت گھر آؤ گے

کدی اپنی آکھ بلاؤ گے
میں بے گُن کیا گُن کیا ہے، تن[۳] پیا ہے من پیا ہے
اوہ[۳] پیا سو مورا جیا ہے، پیا پیا سے رَل مِل جاؤ گے
میں[۳] فانی آپ کو دُور کراں، تیں باقی آپ حضور کراں
جے[۴] اظہر وانگ منصور کراں، کھڑ سُولی پکڑ چڑھاؤ گے
میں[۵] جاگی سب جگ سویا ہے، کھُلی پلک تاں اُٹھ کے رویا ہے
جیز[۶] مستی کام نہ ہویا ہے، کدی مست الست بناؤ گے

ا-۳ میرا تن من محبوب کا ہو گیا ہے۔ وُہ محبوب میری رُوح کا سہارا بن گیا ہے۔ جب اپنا آپ (خودی) ختم ہو گیا تو پاک رُوح محبُوب کے آگے پیش کر دی۔

۴ اگر منصور کی طرح یہ راز ظاہر کر دُوں کہ رُوح اور خدا کی ذات ایک ہے تو مجھے بھی سُولی پر چڑھا دیں گے۔

۵ سائیں جی کہتے ہیں، کہ دُنیا کی طرف جاگ رہے لوگ در اصل سوئے ہُوئے ہیں، اور روحانی شغل کے ذریعے دُنیا کی طرف سے سوئے ہُوئے لوگ حقیقی طور پر بیدار ہیں۔ دُنیا کے لئے جاگ رہے لیکن اندر کی طرف بے خبر لوگ جب وقتِ آخر اندر کی طرف جا گتے ہیں، تو پچھتاتے ہیں کہ زندگی کے قیمتی وقت کو فضُول ضائع کر دیا۔

۶ جب تک رُوح وجد میں نہیں آجاتی، اس کا خدا سے وصال نہیں ہو سکتا۔

حدّ[1] انحد بن دو نین دھرے، اگے سِرن دھڑ کے لاکھ پڑے
اُچھل رنگن دے دریا چڑھے، میرے لہو دی ندی وگاؤ گے

کیسے عاشق نہ سُکھ سونا اے، اساں رو رو کے مکھ دھونا اے
ایہہ[3] جادو ہے کہ ٹونا اے، اِس روگ کا بھوگ بناؤ گے

کہو[4] کیا سر عشق بچارے گا، پھر کیا تیسی نروارے گا
جب[5] دار او پر سروارے گا، تب پیچھے ڈھول بجاؤ گے

مَیں[6] اپنا مَن کباب کیا، آنکھوں کا عرق شراب کیا
رگ[7] تاراں تڈ رباب کیا، کیا مَت کا نام بلاؤ گے

تنک[8] رنجی کو کیا کیجئے گا، مَن بھانا سودا لیجئے گا
ایہہ دین دُنی کس دیجئے گا، مجھے اپنا درس بتاؤ گے

میں نوں آن نظر نے نایا ہے، دو نیناں برکھا لایا ہے
بن روز عنایت آیا ہے، ایہوں اپنا آپ جناؤ گے

مُلہا[9] شوہ نوں ویکھن جاؤ گے، اِنھاں اکھیاں نوں سمجھاؤ گے
دیدار تداں ہی پاؤ گے، بن شاہ عنایت گھر آؤ گے

کدی اپنی آکھ بلاؤ گے (فقیر محمد: کلیات، کافی ۸۵)

---

[1] جب اپنے اندر انحد شبد کی روشنی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہاں کئی عابد جو خدا کی وجود سے اوپر اُٹھ چکے ہیں۔ اس الہیٰ تجلی پر قربان ہو پڑے ہیں۔ [2] وہاں مستی کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ وہاں پہنچ کر میری خودی فنا ہو جائے گی۔ اور میری ذات قائم رہے گی۔ [3] یہ کیفیت اتنی خوشگوار ہے کہ یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ اصل ہے یا جادو۔ سچے عاشقوں کے لئے غم فرقت لذیذ خوراک بن جاتا ہے۔ [4] عشق سر قربان کرنے کی پروا نہیں کرتا۔ [5] عاشق کو منصور کی طرح پھانسی پر لٹکا کر بعد میں مشہور کر دیا جائے گا۔ [6-7] محبوب کی خاطر دل کو کباب اور آنسوؤں کو شراب بنا لیا ہے۔ جسم کی رگ رگ تار کا اور ہڈیاں رباب کا کام دے رہی ہیں۔ اس مذہب کو کیا نام دیا جائے؟ [8] تنک رنجی = شکایت۔ اب شکایت اور گلہ چھوڑ دے۔ آپ کا دل پسند سودا حاضر ہے اسے قبول کیجئے۔ [9] ظاہری آنکھیں بند کر کے باطنی آنکھیں کھول کر مرشد کی نورانی صورت میں جذب ہو کر اسی کی صورت ہو جاتے ہیں۔ [10] بلھا اگر تو اس محبوب حقیقی کا دیدار چاہتا ہے تو اپنی اندر والی آنکھ (نقطۂ سویدا) کھول۔ غیبی آنکھ کے کھلنے پر ہی تو مرشد کی صورت اختیار کرے گا۔

کدی آمِل برہوں سَتائی نُوں

اِس کافی میں بھی محبُوب سے جُدائی کی حالت کا بیان کیا گیا ہے۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں کہ عشق میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جو کوئی عشق خریدنا چاہتا ہے اُسے اپنا سر بطور پیشگی (سائی) دینا پڑتا ہے آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ رُوحانی شغل کرنے والے اِس دُنیا سے پار ہو گئے لیکن میری نجات اس کے فضل پر ہے۔ شاعر آخری بند میں خُدا سے پُرزور التجا کرتا ہے، کہ اُسے اپنے ساتھ مِلا لے، کیونکہ وُہ دُنیا کے رِشتے اور سہارے چھوڑ چکا ہے۔

کدی آ مِل برہوں ستائی نُوں
عشق[1] لگے تاں ہے ہے کُوکیں، توں کیہ جانے پیڑ پرائی نُوں
جے[2] کوئی عشق وہاجیا لوڑے، سِر دیوے پہلے سائی نُوں
عملاں[3] والیاں لنگھ گئیاں، ساڈیاں لجاں ماہی نُوں
غم[4] دے وَہن ستم دِیاں کانگاں، کِسے فقر کپڑ وِچ پائی نُوں
ماں پیو چھڈ سیّاں میں ٹھلیاں، بلہاری رام دُہائی نُوں
کدی آ مِل برہوں ستائی نُوں (فقیر محمد: کُلیات۔ کافی ۸۳)

---

[1] تُو بھی اگر عشق میں مُبتلا ہو کر دردِ فرقت میں ہائے ہائے کرے تبھی تجھے میرے دردِ فراق کا احساس ہو سکتا ہے۔

[2] اگر کوئی عشق خریدنا چاہتا ہے تو پہلے اُسے اپنا سر بطور پیشگی دینا پڑے گا، یعنی عشق کی قیمت موت ہے۔ [3] عاجز ہو کر کہتے ہیں کہ عبادت کرنے والی رُوحیں تو پار ہو گئیں، لیکن مجھ عاجز مسکین کی عزّت محبُوب کے ہاتھ ہے۔ [4] کانگاں: لہریں۔ فقر کپڑ: خوفناک گرداب (بھنور) یعنی عشق کے خوفناک گرداب کی گہرائی وُہی سمجھ سکتا ہے، جو اس میں گھِر چکا ہو۔ اِسی خیال کو خواجہ حافظ یُوں بیان کرتے ہیں ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چُنیں حائل
کُجا دانند حالِ ما سُبکسارانِ ساحل ہا

کدی آمِل یار پیاریا

ایسا لگتا ہے کہ یہ نظم اُس وقت لکھی گئی، جب بُلھے شاہ اپنے مُرشد عنایت شاہ سے الگ ہو گئے تھے، اور اُن کے ہجر میں بے چین و بے قرار تھے۔ غم کی حالت میں شاعر کو کوئل کے شیریں نغمے بھی اُداسی سے پُر لگتے ہیں۔ وہ بے صبری سے اُس وقت کا انتظار کر رہا ہے، جب اُس کا محبوب واپس آ کر اس کے دِل کی بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کرے گا۔

کدی آ مِل یار پیاریا
تیریاں واٹاں[1] توں سِر واریا

چڑھ باغیں کوئل کُوکدی
نِت سوز[2] الم دے پھُوکدی
مینوں[3] تتڑی کوں[4] شام وِساریا

کدی آ مِل یار پیاریا

بُلھا شوہ کدی گھر آوسی
میری بلدی بھا[5] بجھاوسی
اوہدی واٹاں نوں سِر واریا

کدی آ مِل یار پیاریا
تیریاں واٹاں توں سِر واریا

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۸۶)

---

[1] واٹاں توں = راہوں پر۔

[2] سوز = دُکھ، درد۔ الم = غم

[3] جس کے دِل کو آگ لگی ہوئی ہے۔ [4] کوں: کو۔ شام = کاہن۔ مُراد محبوب سے ہے۔

[5] بھاہ = آگ۔

کدی موڑ مُہاراں ڈھولیا

اِس نظم میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب بُلّھے شاہ کا مُرشد اُس سے ناراض ہو گیا تھا۔ وُہ مُرشد سے التجا کرتا ہے کہ اُس سے اگر کوئی خطا ہو گئی ہو تو اُسے مُعاف کرے۔ وُہ کہتا ہے کہ مَیں اُس کی آمد کیلئے پُوری اُمید لگائے بیٹھا تھا، مگر محبُوب کے نہ آنے سے میرے ارمان دِل کے دِل میں ہی رہ گئے۔ وُہ اُمید ظاہر کرتا ہے کہ کبھی نہ کبھی محبُوب اُس کی طرف مُنہ موڑے گا، اور اُس کے دِل کی آگ بجھائے گا۔

کدی[1] موڑ مُہاراں ڈھولیا
تیریاں واٹاں توں سر گھولیا

مَیں تھاں تی دھوتی رہ گئی
کوئی گنڈھ سجن دِل بہہ گئی
کوئی[2] سخن اوّلا بولیا

کدی موڑ مُہاراں ڈھولیا

بُلّھا شوہ کدی گھر آوسی
میری بلدی بھا بجھاوسی
جیہدے[3] دُکھاں نے مُنہ کھولیا

کدی موڑ مُہاراں ڈھولیا

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۸۴)

---

[1] تم واپس گھر آجاؤ، تمہاری راہوں پر میں اپنا سر قُربان کرتی ہُوں۔ ڈھولا = محبُوب۔

[2] سخن = بات - اوّلا = غلط - مجھ سے محبُوب کو کوئی نازیبا بات کہی گئی ہے، جس سے اُس کے دل میں گانٹھ پڑ گئی ہے۔

[3] دُکھاں نے مُنہ کھولیا = اس کی جدائی کا دُکھ مُنہ پھاڑے مجھے کھانے کے لئے آتا ہے۔

کر کتن وَل دھیان کُڑے

بُلھے شاہ کی بہت سی کافیوں میں انسانی قالب کے لئے سب سے اہم علامت چرخے کی استعمال کی گئی ہے۔ یہاں چرخہ کاتنے کا مفہوم روحانی شغل سے ہے، جس کے ذریعہ رُوح جسم سے نکال کر آنکھ کے مرکز پر اکٹھی کی جاتی ہے، اور صرف اِسی طریق سے خدا کا مُشاہدہ ہو سکتا ہے۔

چرخے کی تمثیل دیتے ہُوئے بُلھے شاہ ایک دوشیزہ کی مثال دیتے ہیں، جس میں اُس کی والدہ اُس کو تنبیہہ کرتی ہے کہ اُس نے اپنے جہیز کے لئے کوئی مناسب تیاری نہیں کی۔ چُونکہ اس کو یہ چرخہ مفت مِل گیا ہے، اس لئے اس نے اس کی مناسب قدر نہیں کی۔ (چرخہ مُفت تیرے ہتھ آیا، پَلیوں نہیں کُجھ کھول گوایا، تہیئوں قدر محنت دا پایا)

اس کی والدہ اُسے نصیحت کرتی ہے، کہ وُہ اپنا قیمتی وقت کھیل کُود میں برباد نہ کرے، بلکہ شوہر (خُداوند کریم) کے گھر جانے کی تیاری کرے، جہاں اُس نے ہمیشہ رہنا ہے۔ اس کا ماپیکے (دُنیا) میں قیام صرف چند روز کے لئے ہے۔ نصیحت جاری رکھتے ہُوئے اُس کی والدہ آگے کہتی ہے کہ اگر وُہ خود تمام سُوت نہیں کات سکتی، تو وُہ اپنے مُرشِد سے ہدایت حاصل کرلے (کت نے نی کُجھ کتا نے نی)۔ بُلھے شاہ اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ منزل پر پہنچنے کے لئے سخت محنت اشد ضرُوری ہے۔ (دِیوا اپنے پاس جگاویں، کت کت سُوت بھڑولی پاویں، اکھتیں وِچوں رات لنگھاویں)

آخری بند میں بُلھے شاہ اپنے مُرشِد کا شُکرانہ ادا کرتے ہُوئے یہ امید ظاہر کرتا ہے کہ تمام نقائص کے باوجُود اس کا مُرشِد اس کو اس بحرِ فانی سے پار لگا دے گا۔

کر کتن وَل دھیان کُڑے[1]

نِت مَتیں[2] دیندی ماں دھیا، کیوں پھرنی ایں انویں آدھیا
نی شرم حیا نہ گوا دھیا، توں کدی تاں سمجھ ندان[3] کُڑے

---

[1] مالک کی بندگی، عبادت کی طرف دھیان کرو۔

[2] مَتیں = نصیحت ۔ [3] ناسمجھ۔

چرخہ مُفت تیرے ہتھ آیا، ملیوں نہیوں کُجھ کھول گوایا
نہیئوں قدر محنت دا پایا، جد ہو یا کم آسان کُڑے

چرخہ بنیا خاطر تیری، کھیڈن دی کر حرص تھوڑی
ہونا نہیئوں ہور وڈیری، مت کر کوئی اگیان کُڑے

چرخہ تیرا رنگ رنگیلا، ریس کریندا سب قبیلہ
چلدے چارے کرے حیلہ، ہو گھر دے وچ آوادان کُڑے

اس چرخے دی قیمت بھاری، توں کیہہ جانے قدر گواری
اُچی نظر پھیریں ہنکاری، وچ اپنے شان گمان کُڑے

میں کوکاں کر کھلیاں باہیں، نہ ہو غافل سمجھ کدائیں
ایسا چرخہ گھڑنا ناہیں، پھیر کسے ترکھان کُڑے

ایہہ چرخہ توں کیوں گوایا، کیوں توں کیہہ دے وچ رلایا
جد دا ہتھ تیرے ایہہ آیا، توں کدے نہ ڈاہیا آن کُڑے

نت منتیں دیاں ویلی نوں، اس بھولی کملی جھلی نوں
جد پوے گا وخت اکلی نوں، تد ہائے ہائے کرسی جان کُڑے

مڈھوں دی توں رجک وہونی، گوہڑیاں نہ توں کتی پونی
ہن کیوں پھرنی ایں نموں جھونی، کس دا کریں گمان کُڑے

نہ نکلا داس کراویں توں، نہ بائڑ مال پواویں توں
کیوں گھڑی مُڑی چرخہ چاویں نوں، توں کرنی ایں اپنا زیان کُڑے

---

۱ نھوڑی ۲ آباد ۳ گنوار ۴ میں بازو اونچے کر کے دہائی دیتی ہوں۔ ۵ تم کبھی تو میری طرف توجہ کرو، بے پروائی سے کام نہ لو۔ ۶ بے سلیقہ۔ ۷ کملی جھلی = پاگل۔ ۸ پونیوں کی ٹوکری میں سے، یعنی تم نے کبھی بھی عبادت کی دولت اکٹھی نہ کی ۹ نموں جھونی = اداس، پریشان ۹ بائڑ = چرخے کے تختوں کو جوڑنے والی رسی جس کے اوپر مال گھومتی ہے۔ ۱۰ نقصان۔

ڈِنگا نکلا راس کرائے، نال سَتنا بی بائڑ پُوائے
جیئوں کر وَگے تویں وگائے۔ مَت کر کوئی اگیان کُڑے
آج گھر وِچ نویں کیا دکھے، تُوں جھب جھب ولیناڈاہ کُڑے
رُوں ویل پنجاون جاہ کُڑے، مُڑ کل نہ تیرا جان کُڑے
جدوں رُوں پنجالیا ویں گی۔ سَتیاں وِچ پُونیاں پاویں گی
مُڑ آپے ای پئی بھاویں گی، وِچ سارے جگ جہان کُڑے
تیرے نال دِیاں سب ستیاں نی۔ کت پُونیاں سبھناں لیئیاں نی
تینوں بیٹھی نوں پچھے پئیاں نی۔ کیوں بیٹھی ایں ہُن حیران کُڑے
دِیوا[1] اپنے پاس جگا دیں، کت کت سوت بھڑولی پاویں
اکھیں[2] وِچوں رات لنگھاویں، اَودکھی کر کے جان کُڑے
راج پیکیا دِن چار کُڑے، نہ کھیڈ و کھیڈ گزار کُڑے
نہ ہو ویہلی کر کار کُڑے، گھر بار نہ کر ویران کُڑے
تُوں سَتیاں رین گزار نہیں، مُڑ آؤناں دُوجی وار نہیں
پھر بہنا ایس بھنڈار نہیں، وِچ اکو جیڈے ہان کُڑے
تُوں سدا نہ پیکے رہنا ایں، نہ پاس اَنیڑی دے بہنا ایں
بھا انت وچھوڑا سہنا ایں، وس پئیں گی سَسّ ننان کُڑے
کت سے نی کجھ کتاے نی۔ ہُن تانی تند اوناسے نی
تُوں اپنا داج رنگائے نی۔ تُوں تد ہوویں پردھان کُڑے

ا۔۲۔ جب تک سانسوں کا خزانہ قائم ہے یعنی جب تک سانس آرہا ہے، تب تک مُرشد کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق زندگی کی رات میں عرفان کا دیا جلا کر خدا کی بندگی کا سُوت کات لینا چاہیئے۔ آخری وقت جب موت کے فرشتے آکر سرہانے کھڑے ہو جاتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ۳۔ عورتوں کی وہ محفل جس میں سہیلیاں مِل کر چرخہ کاتتی ہیں۔

جد گھر بیگانے جاویں گی، مڑ وت نہ اوتھوں آویں گی
او تھے جا کے پچھوتاویں گی، کجھ اگدوں[1] کر سمیان کڑے
اَج اڈا تیرا کم کُڑے۔ کیوں ہوئی ایں بے غم کُڑے
کیہہ[2] کر لینا اُس دم کُڑے۔ جد گھر آئے مہمان کُڑے
جد سب سَیّاں ٹُر جاؤن گیاں۔ پھر اوتھوں مُول نہ آؤن گیاں
آ چرخے مُول نہ ڈاہون گیاں، تیرا ترنجن پیا ویران کُڑے
کرمان نہ حُسن جوانی دا۔ پَردیس[3] نہ رہن سیلانی دا
کوئی دُنیا جُھوٹھی فانی دا۔ نہ رہسی نام نشان کُڑے
اک[4] اوکھا ویلا آوے گا۔ سب ساک سین بھج جاوے گا
کر مَدّت[5] پار لنگھاوے گا۔ اوہ بُلھے دا سُلطان کُڑے
کر کتن وَل دھیان کُڑے

(فقیر محمد: کلیات۔ کافی ۸۷)

---

[1] اگدوں = پہلے سے، سمیان = سامان [2] اُس وقت کچھ بھی نہ ہو سکے گا، جب مَیّت کے فرشتے آ جائیں گے۔

[3] سیلانی = مُسافر۔ یہ دلیس رُوح کا اصلی مقام نہیں ہے۔ انسان یہاں مسافر یا سوداگر کی حیثیت سے خدا کی عبادت کا بیوپار کرنے کے لئے آیا ہے۔

[4] وقتِ آخر عزیز و اقربا مددگار ثابت نہیں ہوتے۔

[5] کہیں کہیں مَدّت کی جگہ مِنّت لکھا بھی ملتا ہے۔ مَدّت = مَدد

کون آیا پہن لباس کُڑے

اِس نظمے میں رانجھے کو خُدا کی اَور ہیر کو رُوح کی صُورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جب سے رُوح اپنے منبع سے الگ ہُوئی ہے، وُہ واپس جانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ دُنیا کے تمام آرام و آسائش میسّر ہوتے ہُوئے بھی انسان اپنے آپ کو اکیلا محسُوس کرتا ہے، اَور یہ خلش اُسے ہمیشہ ستاتی رہتی ہے۔ تنہائی کا یہ احساس تب تک ختم نہیں ہوگا، جب تک رُوح واپس جا کر خُدا سے وصال نہیں کر لیتی۔

ایسی بات نہیں، کہ خُدا انسان کے دُکھ سے بے پرواہ ہے۔ اُسے خُود رُوح سے عشق ہے، جو اس کا ہی ایک جُزو ہے۔ جب تک خُدا اپنی مخلُوق کی صُورت میں ظہُور میں نہیں آیا تھا، تب تک تمام رُوحیں اُسی کا حصّہ تھیں۔ جب اُنہیں علیحدہ کیا گیا تو خُدا نے وعدہ کیا کہ وہ اُن تمام رُوحوں کو، جو اُس سے ملنے کی خواہشمند ہوں گی، واپس بُلا کر اپنے آپ میں ملا لے گا۔ (وِچھڑیا ہویا پہلی راتوں آیا کرن تلاش کُڑے)

کون آیا پہن لباس کُڑے، تُسّی پُچھو نال اِخلاص کُڑے۔

ہتھ کھُونڈی موڈھے کمبل کالا، اَکھیاں دے وِچ وسّے اُجالا
چاک نہیں کوئی ہے متوالا، پُچھو بِٹھا کے پاس کُڑے

چاک کر چاک نہ اِس نُوں آکھو، ایہہ نہ خالی گُجھڑی گھاتوں
وِچھڑیا ہویا پہلی راتوں، آیا کرن تلاش کُڑے

نہ ایہہ چاک کر چاک کہیں دا، نہ اِس ذرّہ شوق مہیں دا
نہ مُشتاق ہے دُدّھ دہیں دا، نہ اُس بُھکھ پیاس کُڑے

مُلتاں شوہ لک بیٹھا اوہلے، دَستے بھیت نہ مُکھ سے بولے
بابل ور کھیڑیاں توں ٹولے، وَر ماہنڈھا[۱] ماہنڈھے پاس کُڑے

کون آیا پہن لباس کُڑے، تُسّی پُچھو نال اخلاص کُڑے

(فقیر محمد، کُلیات، کافی ۸۸)

---

۱ ماہنڈھا = میرا

کوئی پُچھو دِلبر کیہہ کردا؟

خُدا ہمارے اندر ہے اور وُہ ہر جگہ، ہر شخص میں موجود ہے۔ یہ وُہ لطیف راز ہے، جس کا بُلھے شاہ نے اپنی کافی میں انکشاف کیا ہے۔ بہرحال وُہ اس راز کو کھولنے میں ہچکچاتے ہیں، کیونکہ اس سے دُنیا اور شرعی انسانوں کی زندگی میں کئی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

وُہ صرف مسجد میں ہی نہیں، بلکہ مندر میں بھی موجود ہے (وِچ مسیت نماز گُزارے، بُت خانے جا وڑدا) درحقیقت وُہ ہر انسان کے اندر مُرشد کی شکل میں موجود ہے۔ وُہ فقط عاشقوں کے دِل میں ہی نہیں رہتا، بلکہ اپنے دُشمنوں کے دِل میں بھی بستا ہے۔ وُہ دو بننے اور اپنے آپ سے لڑنے میں خوشی محسوس کرتا ہے (مُوسیٰ تے فرعون بنا کے دو ہو کے کیوں لڑدا)۔

آخری بند میں بُلھے شاہ اِس سچائی کو دُہراتے ہیں کہ عشق میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے — (بُلھا شوہ دا عشق بگھیلا، رت پیندا گوشت چردا)

کوئی پُچھو دِلبر کیہہ کردا؟[1] ایہہ جو کردا سو کردا!
وِچ[2] مسیت نماز گُزارے۔ بُت خانے جا وڑدا
آپ اِکّو کئی لکھ گھراں دے۔ مالک ہے گھر گھر دا
اِکسے گھر وِچ وسدے رسدے۔ نہیں رہندا وِچ پردا
جت ول ویکھاں ات ول اوہو۔ ہر دی سنگت کردا
مُوسیٰ[3] تے فرعون بنا کے، دو ہو کے کیوں لڑدا؟

---

[1] کافی کے پہلے شعر میں شاعر سوال کرتا ہوا پوچھتا ہے کہ "کوئی بتائے کہ محبوب (خدا) کیا کیا چونچلے کرتا ہے"؟ پھر جواب دیتا ہے کہ وُہ جو کچھ کرتا ہے اپنی مرضی سے کرتا ہے۔
[2] وُہ مسجد اور بُت خانے دونوں میں موجود ہے [3] حالانکہ وُہ یگانہ ہے لیکن ہر انسان کے اندر اسکے مالک کی صُورت میں موجود ہے۔ [4] حضرت مُوسیٰ میں بھی وُہی تھا اور اسکے ساتھ لڑنے والے فرعون میں بھی وُہی تھا۔ یہ شعر ڈاکٹر فقیر محمد کی کلیات سے

وَحدت دے دریا دے اندر، سَب جَگت دِسّے تَردا
بُلھّیا! شوہ دا عِشق بگھیلا، رَتّ پِیندا گوشت چَردا
کوئی پُچھّو "دِلبر کیہہ کردا"
" ایہہ جو کردا سو کردا" !
(نذیر احمد: کلام بُلھّے شاہ: صفحہ ۵۹)

لہ محبوب کا عِشق بھیڑیئے کی طرح خُون پینے والا اور گوشت کھانے والا ہے۔

کھیڈٹے وِچ ویہڑے گھُمّی گھُم

یہ نظم عارفانہ اسرار سے پُر ہے۔ آنگن کی کھڑکی سے مُراد آنکھ کا مرکز یعنی تیسری آنکھ یا نُقطہٗ سویدا ہے۔ اِس مقام پر شاغل کو خدا کا دیدار ہوتا ہے۔ آنگن سے مُراد جسم ہے، جس کے نَو دروازے (حواس) ہیں۔ دسواں دروازہ تیسری آنکھ ہے جو پوشیدہ ہے۔ یہی وُہ نُقطہ ہے جہاں سے اصل رُوحانی سفر شروع ہوتا ہے۔ چرخے کا کاتنا خدا کے نام کا ذکر کرنا ہے۔ ذکر سے ہی رُوح جسم سے سمٹ کر آنکھوں کے پیچھے یکسُو ہوتی ہے، اور آخر کار خُدا سے وصال کر لیتی ہے۔ خدا کے وصال کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ نفس ہے۔ جسے یہاں ہاتھی (مکنا ہاتھی)[1] کہا گیا ہے، جو یکسُو اور ساکن ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ (ایس ویہڑے وِچ مکنا ہاتھی، سنگل نال کھہڑے
بُلّھے شاہ فقیر سائیں دا جاگدیاں کوں چھیڑے)

کھیڈٹے وِچ ویہڑے گھُمّی گھُم

ایس ویہڑے وِچ آلا سوہندا آلے دے وِچ تاکی
تاکی دے وِچ چھیج وچھاواں نال پیا سنگ راتی
ایس ویہڑے دے نَوں دروازے دسواں گُپت رکھاتی
اوس گلی دی میں سار نہ جاناں جہاں آوے پیا جاتی
ایس ویہڑے وِچ چرخہ سوہندا آلے دے وِچ تاکی
اپنے پیا نُوں یاد کر لیاں چرخے دے ہر پھیرے
ایس ویہڑے وِچ مکنّا ہاتھی سنگل نال کھہڑے
بُلّھے شاہ فقیر سائیں دا جاگدیاں کوں چھیڑے
کھیڈٹے وِچ ویہڑے گھُمّی گھُم

(نقیر محمد کلیات - کافی ۸۹)

[1] مست ہاتھی۔

کیہنوں لامکانی دسدے او

کہا گیا ہے کہ خدا وقت اور مقام کی حدود سے پرے ہے۔ بلھے شاہ اس کافی میں بتاتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر جاندار ہستی اور ہر شے میں اسی کا جوہر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام کائنات اس کے حکم سے وجود میں آئی ہے، اور پھر اس نے اپنے آپ کو عشق کی صورت میں اپنی مخلوق میں سمو دیا ہے۔ کچھ اور کافیوں کی طرح بلھے شاہ کی اس کافی میں بھی ہمہ اوست کا رنگ نمایاں ہے۔ خدا خود ہی بولنے والا اور خود ہی سننے والا ہے۔ وہ خود ہی قاتل، خود ہی مقتول اور خود ہی تماشائی ہے ؎

تیری وحدت تُوئیں بچاویں، اناالحق دی تار ہلاویں
سُولی تے منصور چڑھاویں، اوتھے کول کھلوکے ہسدے ہو

وہ یوسف کی شکل اختیار کر کے زلیخا کے خواب میں آتا ہے، تاکہ اس کے دل کا چین لوٹ لے۔ وہ پارسا اور گنہگار دونوں میں موجود ہے۔

آخری بند میں حسبِ معمول وہ اپنے مرشد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس کا نام اس کے مرشد سے منسوب کیا جائے، کیونکہ اس کا مرشدِ پارس ہے اور وہ خود لوہا ہے۔

کیہنوں[1] لامکانی دسدے او
تُسی ہر رنگ دے وِچ وسدے او

کُن[2] فیکون نیں آپ کہایا، تِس باجھوں ہور کیہڑا آیا
عشقوں سب[3] ظہور بنایا، عاشق ہو کے وسدے او

پُچھو آدم کس نے آندا اے، کِتھوں آیا کِتھے جاندا اے
اوتھے کس دا تیتوں لانجا[4] اے، اوتھے کھا دانہ[5] اُٹھ نسدے او

---

[1] لامکان ہستی یعنی خدا جو گوناگوں کائنات میں جلوہ گر ہے۔ وہ غیر مجسم، لاتعلق اور قادرِ مطلق ہے۔
[2] کُن = ہو جا۔ فیکون = ہو گیا۔ [3] کائنات کی تخلیق ہوئی۔ [4] شرم [5] اسلامی روایت کے مطابق آدم کو بہشت سے اسلئے نکالا گیا تھا، کیونکہ اس نے الٰہی حکم کے خلاف گندم کا دانا کھا لیا تھا۔

آپے سُنیں تے آپ سُناویں، آپے گاویں آپ بجاویں
ہتھوں توں سرود سُناویں، کتے جاہل ہو کے نسدے او

تیری[2] وحدت تُوئیں بچاویں، انا الحق دی نار ملاویں
سُولی تے منصور چڑھاویں، اوتھے کول کھلو کے ہسدے او

جوں[3] سکندر طرف نوشاباں، ہو رسُول دے آیا کتاباں
یُوسف ہو کے اندر خواباں، زُلیخا دا دِل کھسدے او

کتے رُومی ہو کتے زنگی[4] او، کتے لوٹی پوش فرنگی او
کتے مے خانے وِچ بھنگی او، کتے مہر[5] مہری بن وسدے او

بُلھا شوہ عنایت عارف ہے، اوہ دِل میرے دا وارث ہے
میں لوہا تے اوہ پارس اے، تسیں اوسے دے سنگ گھسدے او
کیہنوں لامکانی دسدے او،
تسی ہر رنگ دے وِچ وسدے او۔ (فقیر محمد: کلیات، کافی ۹۰)

---

[1] تُو ہی سُرود بجانے والا ماہر اور پھر تُو خود ہی اِس سنگیت سے دُور بھاگنے والا ہے۔
[2] اپنی یگانگی کے راز کو تُو ہی ہضم کر سکتا ہے۔ تو ہی منصور سے انا الحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگوانے والا ہے اور پھر تُو خود ہی اس کو سُولی پر چڑھانے والا اور خود ہی تماشائی بن کر اس پر ہنسنے والا ہے۔
[3] تُو ہی سکندر کی شکل میں نوشاباں کو لینے گیا تھا۔ تُو ہی وقتاً فوقتاً چار متبرک کتابیں لانے والا پیغمبر بنا، تُو ہی زلیخا کے خواب میں یُوسف کی صُورت میں آیا۔
[4] زنگی = حبشی۔ [5] مہر مہری = مرد، عورت۔

کیوں عشق اساں تے آیا اے

یہ بلھے شاہ کی اُن کافیوں میں سے ایک ہے جن میں خدا کے عاشقوں پر ظلم وستم کا بیان ہے۔ اس میں ابراہیمؑ، زکریاؑ، یوسفؑ، شیخ صنعان، شمس تبریز اور منصور کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ فہرست دینے کے بعد وُہ پُوچھتے ہیں کہ کیا اب میری باری ہے؟ (کر ہتھ ہُن میں وَل دھایا اے)
آخری بند میں عاشق کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وُہ اپنا جسم ایک بھٹی کی طرح بنائے، اور مَن کو اہرن کرے، جس کے اُوپر عشق کے ہتھوڑے کی ضرب لگانے سے معشوق کا دل پگھل جائے۔

کیوں عشق اساں تے آیا اے
تُوں آیاں ہے میں پایا اے

ابراہیم چا چِکھا سُٹا یُو، زکریئے سر کلوتر دھرائیو
یُوسف ہٹو ہٹ وکا یُو، کہو سانُوں کیہہ لیایا اے

شیخ صنعانوں خُوک[1] چرائیو، شمس دی کھل اُلٹ لہائیو
سُولی تے منصور چڑھائیو، کر ہتھ ہُن میں وَل دھایا اے

جس گھر وِچ نیرا پھیر ہویا، سو جل بل کوئلہ ڈھیر ہویا
حدرا کھ اُڈی تدسیر ہویا، کہو کِس گل دا سد ھرایا اے

بُلھا شوہ دے کارن کریئے، تن بھٹھی مَن اہرن کریئے
پریم ہتھوڑا مارن کریئے، دِل لوہا اگ پگایا اے

کیوں عشق اساں تے آیا اے
تُوں آیاں اے میں پایا اے

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۹۲)

---

[1] خوک = سؤر

کیہہ کردا بے پرواہی جے

خدا ہر شخص میں اور ہر جگہ سمایا ہوا ہے۔ ابتدا میں خدا ہی واحد ہستی تھی۔ پھر اُس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کے ہر جزو میں سما گیا۔ اس نے یہ عجیب و غریب کھیل کھیلا ہے اپنی تمام کائنات میں انسان کو سب سے افضل درجہ عطا کیا ہے۔ گوناگوں مخلوق میں فقط انسانی صورت میں ہی خدا کو پایا جا سکتا ہے، یا یوں کہیئے کہ پوشیدہ حقیقت کو آشکار کیا جا سکتا ہے۔

چوتھے بند میں بلھے شاہ کہتے ہیں۔ کہ خدا انسانی قالب میں رہتا ہے، لیکن انسان جہالت کے زیر اثر اُسے باہر مندروں، مسجدوں، صحراؤں اور بیابانوں میں تلاش کرتا ہے (رہیا سما وچ ہر ہر گھر دے، بھلی پھرے لوکائی جے)۔

وہ عاشق اور معشوق دونوں میں بستا ہے۔ اور عشق کے ذریعہ ہی اُس کو پایا جا سکتا ہے۔ اُسے عقل و منطق کے بل بوتے پر حاصل نہیں کیا جا سکتا (آپے ہیں توں ساجن سئیاں، عقل دلیلاں سب اُٹھ گئیاں)

کیہہ کردا بے پرواہی جے

کُن[1] کیہا فیکون کہایا، باطن ظاہر دے ول آیا
بے چونی دا[2] چون بنایا، سکھڑی کھیڈ مچائی جے

سِرِّ[3] مخفی دا جس دم بولا، گھنگھٹ اپنے مُنہ سے کھولا
ہُن کیوں کردا ساتھوں اوہلا، سب وچ حقیقت آئی جے

---

[1] اِس بے پرواہ نے خود کائنات کے ظہور کا حکم (کُن) دیا۔ خود ہی اُس کی تعمیل کی (فیکون) اور خود ہی باطن سے ظہور میں آ گیا۔ [2] اس نے لاصورتی سے صورت اختیار کی۔ [3] سرِ مخفی = چھپا ہوا بھید۔ گھونگٹ = حجاب، پردہ۔ وہ حجاب کی حالت سے آشکار ہو گیا: یعنی وہ محبوب پوشیدہ حالت سے ظاہری حالت میں آ گیا۔ اُس کی حقیقت ہر ایک میں سمائی ہوئی ہے۔

کرّمنا[1] بنی آدم کیہا، کوئی نہ کیتا تیرے جیہا
شان بزرگی دے سنگ ایہا، ڈھپھڑی خوب وجائی جے

آپے بے پرواہیاں کردے، اپنے آپ سے آپے ڈردے
رہیا سما وچ ہر ہر گھر دے، ٹھلی پھرے لوکائی جے

چیٹک[2] لا دیوانہ ہویا، لیلیٰ بن کے مجنوں موہیا
آپے رویا آپے دھویا، کیہی کیتی آشنائی جے

آپے ہیں توں ساجن سئیاں، عقل دلیلاں سب اُٹھ گئیاں
بُلھا[3] شاہ نے خوشیاں لئیاں، ہُن کردا کیوں جدائی جے

کیہہ کردا بے پرواہی جے

(فقیر محمد: کلیات۔ کافی ۹۴)

---

[1] اس نے آدمؑ سے کہا کہ کوئی بھی تیرے جیسا نہیں بنایا۔ آدمؑ کو عظمت عطا کی۔
[2] چیٹک = شوق۔ پیار۔ آشنائی = دوستی، محبّت۔
[3] وصل کی خوشی دے کر اب جدائی کا غم کیوں دینا ہے؟

کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا

خدا ہر جاندار اور غیر جاندار شے میں موجود ہے لیکن پوشیدہ طور پر۔ وہ انسان کا دوست بن کر پیغمبر یا مرشد کی صورت میں آتا ہے، اور عشق کے ذریعے انسان سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

بلھے شاہ کی بہت سی کافیوں میں ہمہ اوست کا فلسفی انداز دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کافی میں یہ خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ دوسرے بند میں بلھے شاہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ کہ جب تم خود ہی ہر جگہ موجود ہو، تو پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ تم لاتعلق ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خداوند کریم جب مرشد کی شکل میں آتا ہے تو انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے:

تسیں آپے آپ ہی سارے ہو، کیوں کہندے اسیں نیارے ہو
آئے اپنے آپ نظارے ہو، وچ برزخ رکھیا خاکی دا

پانچویں بند میں بلھے شاہ کہتے ہیں کہ جس نے مئے عشق کا جام پی لیا وہ بےخود ہو گیا۔ ایسا شخص مستی کے عالم میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

آخری بند میں عشق کی قیمت کا ذکر ہے، جو عاشق کو راہ عشق میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک آتش کی مانند ہے جو سب کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

بلھے شاہ تن بھاہ دی بھٹھی کر، اگ بال ہڈاں تن متی کر
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا[1]، ایہہ پردہ کس نوں راکھی دا۔
کارن پیت میت بن آیا[2]، میم دا گھنگھٹ مکھ پر پایا
احد تے احمد نام دھرایا[3]، سر چھتر جھلے لولاکی دا

---

[1] کائنات کی کثرت کے در پردہ ایک ہی قادر جلوہ گر ہے۔

[2] محبت کرنے کے لئے خود عاشق بن جاتا ہے۔

[3] احد = خدا۔ احمد = حضرت محمدؐ۔ لولاک = کون و مکاں (دونوں جہان)، یعنی مادّی و روحانی طبقات۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا انسان کو نجات دینے کیلئے مرشد کی صورت میں آتا ہے۔

تسیں[1] آپے آپ ہی سارے ہو، کیوں کہندے اسیں نیارے ہو
آئے[2] اپنے آپ نظارے ہو، وچ برزخ رکھیا خاکی دا

تُدھ باجھوں دوسرا کیہڑا ہے، کیوں پایا الٹا جھیڑا ہے
ایہہ ڈِٹھا بڑا اندھیرا ہے، ہُن آپ نوں آپے آکھی دا

کِتے رومی ہو کِتے شامی ہو، کِتے صاحب کِتے غلامی ہو
تُسیں آپے آپ نمامی ہو، کہوں کھوٹا کھرا سولاکھی دا

جِس تن وچ عشق دا جوش ہویا، اوہ بے خود ہو بے ہوش ہویا
اُوہ[3] کیوں کر رہ خاموش ہویا، جس پیالہ پیتا ساقی دا

تُسیں آپ اسانوں دِہائے جی، کد رہندے چھپے چُھپائے جی
تُسیں[4] شاہ عنایت بن آئے جی، ہُن لا لا نین جھاکی دا

(بنظر یہ: کلیات، کافی ۹۵)

بُلھا[5] شاہ تن بھاد دی بھٹھی کر، اگ بال ہڈاں تن ماٹی کر
ایہہ شوق محبت باٹی کر، ایہہ مدھو آراس بدھ چاکھی دا
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا، ایہہ پردہ کِس توں راکھی دا۔

[1-2] ہر جگہ سما جانے کے بعد لاتعلق کیوں کہلاتے ہو؟ برزخ = پردہ۔
[3] اُلفت کا جام پینے والا خاموش نہیں رہ سکتا۔
[4] مُرشد کی شکل اختیار کرکے میری طرف دیکھ رہے ہو۔
[5] مئے عشق کا جام پینے کا یہی طریقہ ہے۔

کیہہ بے دَرداں سَنگ یاری

اِس کافی میں محبوب سے جُدائی کے ناقابلِ برداشت دَرد کی ایک مؤثر تصویر کھینچی گئی ہے۔ محبوب کی اچانک روانگی سے عاشق کے دِل میں جو چُبھن پیدا ہوتی ہے، اُسے کمال خُوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ (رووِن اکھیاں زار و زاری ..... ہجر سے سانگ سینے وِچ گڈ کے جسموں جِند نوں لے گئے کڈھ کے)

بُلھے شاہ کا اپنے محبوب سے بے وفائی کا شکوہ ہے کہ محبوب کو اس کے درد و الم کی کوئی پروا نہیں اور جو وعدہ اس نے کیا تھا نبھایا نہیں۔ اِس لئے بُلھے شاہ افسوس ظاہر کرتا ہے کہ وُہ بدقسمتی سے عشق میں مُبتلا ہو گیا (مَیں بُھلی بُھل نین لگائے، کِہے مِلے سانوں ٹھگ بپاری)۔

آخری بند میں بھی اندازِ شکوہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور معمول کے خلاف محبوب سے ملاپ کی امید کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔

کیہہ بے دَرداں سنگ یاری رووِن اکھیاں زار و زاری

سانوں گئے بے دَردی چھڈ کے، ہجر[1] سے سانگ سینے وِچ گڈ کے
جسموں جِند نوں لے گئے کڈھ کے، ایہہ گل کر گئے ہیئنسیاری[2]

بے دَرداں دا کیہہ بھروسا، خوف نہیں دِل اندر ماسا
چڑیاں موت گواراں ہاسا، مگروں ہس ہس تاڑی ماری

آون کہہ گئے پھیر نہ آئے، آون دے سب قول بُھلائے
مَیں بُھلی بُھل نین لگائے، کِہے مِلے سانوں ٹھگ بپاری

بُلھے شاہ اک سودا کیتا، کیتا زہر پیالہ پیتا
نہ کجھ نفع نہ ٹوٹا لیتا، درد دُکھاں دی گٹھڑی بھاری

کیہہ بیدرداں سنگ یاری، رووِن اکھیاں زار و زاری
(فقیر محمد: کلیات، کافی ۹۶)

---

[1] ہجر کی کٹار - [2] ظالم

کیہہ جاناں میں کوئی وے اڑیا

رُوح کی اپنی کوئی ذات نہیں ہے۔ رُوح کی وہی ذات ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات عشق ہے۔ جو بھی کوئی عشق کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا روپ ہو جاتا ہے آگے چل کر بلھے شاہ کہتے ہیں کہ دُنیاوی طرز والی سفید اوڑھنی اُتار کر عابدوں والی کمبلی اوڑھ لینی چاہیئے، تاکہ رُوح پر کثافت (مایا) کا داغ نہ لگے جس نے اللہ تعالیٰ (الف) کو پہچان لیا، دُنیا (ب) کو پرکھ لیا، اُسے حقیقی علم (زنلاوت) مل گیا، جسے پاکر وہ شاکر، صابر اور صادق بن گیا۔ برخلاف اس کے جس نے خودی کا راگ الاپا وہ مارا گیا (کوکو اندر موئی) محبوب وہ قصائی ہے جو خودی کے بکرے کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ کہ میرے مُرشد شاہ عنایت نے مجھ پر کرم کر کے مجھے عشقِ الہیٰ کی مے سے سرشار کر دیا ہے۔ باطن میں میرا اللہ تعالیٰ سے وصال ہو گیا ہے، اور کہیں دُور جا کر اُسے ڈھونڈنے کی مجھے زحمت نہیں اُٹھانی پڑی۔

رکیہہ جاناں میں کوئی، وے اڑیا

کیہہ جاناں میں کوئی

جو کوئی اندر بولے چالے، ذات اساڈی سوئی[۱]

جس دے نال میں نیہوں لگایا، اوہو جیہی ہوئی[۲]

چٹی چادر لاہ سٹ کڑیئے، پہن فقیراں دی لوئی[۳]

چٹی چادر نوں داغ لگے گا، لوئی نوں داغ نہ کوئی[۴]

---

[۱] رُوح کی ذات (جوہر) وہی ہے جو خدا کی ہے۔

[۲] رُوح خدا سے عشق کر کے اس کی صُورت اختیار کر گئی۔

[۳] دُنیاوی طرزِ زندگی ترک کر کے عاشقوں والی زندگی اختیار کر لی۔

[۴] دُنیادار مایا کی زد میں ہوتا ہے اور فقیر اس سے آزاد۔

الف پچھاتا ب پچھاتی، ت تلاوت ہوئی
س پچھاتا ش پچھاتا، صادق صابر ہوئی
کُوکُو کردی قمری آہی، گل وچ طوق پیوئی
بس نہ کردی کُوکُو کولوں، کُوکُو اندر موئی
جو کجھ کرسی اللہ بھاناں، کیا کجھ کرسی کوئی
جو کجھ لیکھ متھے دا لکھیا، میں اس تے شاکر ہوئی
عاشق بکری معشوق قصائی، میں میں کردی کوہی
جیوں جیوں میں میں بہتا کردی، تیوں تیوں موئی موئی
بُلھا شوہ عنایت کرکے، شوق شراب دِتوئی
بھلا ہویا اسیں دُوروں چھُٹے، نیڑے آن لدھوئی
کیہہ جاناں میں کوئی،
وے اڑیا
کیہہ جاناں میں کوئی

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۹۸)

۱-۲ الف = اللہ تعالیٰ کی علامت ہے۔
"ب" کا مطلب دوسرا۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ "ب" ہے جس میں تمام کائنات شامل ہے۔ تلاوت = عرفان ۔ صادق = صدق والا۔ صابر = صبر کرنے والا۔
۳-۴ قمری = فاختہ جیسا پرندہ۔ طوق = زنجیر۔ مطلب: خودی کا دکھاوا کرنے والے دُکھ اُٹھاتے ہیں۔
۵ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے بندے کے بس میں کچھ نہیں۔
۶ شوقِ شراب = مئے عشقِ الٰہی۔

گل رَولے لوکاں پائی اے

خُدا کی ہستی کا علم اپنے اندر خُدا کا مُشاہدہ کرنے سے ہوتا ہے شرعی رسم و رواج منظم اور ادارائی مذہب کے گرد پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس کی رُوح کو ختم کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سچے مذہب سے دُور ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کے لئے مذہب اور شرع ہم معنی ہیں۔ چونکہ ہر مذہب کی شریعت دُوسرے مذہب کی شریعت سے مختلف ہوتی ہے، اس لئے انسانوں میں باہمی تفرقے، فرقہ بندی اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے، جس کے باعث آپسی جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بُلھے شاہ کہتے ہیں، کہ مذہبی تفرقات مُلا اور پنڈت وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دِلوں میں کئی قسم کے وہم بھرم ڈال دیتے ہیں۔ یہ سب وُہ اپنی روزی اور خودغرضی کے لئے کرتے ہیں۔

اِس کے برعکس رُوحانی مشاہدہ انسان کو خُدا کے نزدیک لاتا ہے۔ چُونکہ سبھی انسانوں میں یہ مشاہدہ یکساں ہوتا ہے، اس لئے یہ انسان کو انسان کے نزدیک لاتا ہے۔ جب ایک ہی خُدائی حقیقت ہر ایک انسان میں نظر آتی ہے تو نفرت اور نفاق کی کوئی گنجائش نہیں رہتی (شاہ رگ تھیں ربّ دِسدا نیڑے، لوکاں پائے لمّے جھیڑے)۔ جو لوگ باہر مندروں، مسجدوں میں خُدا کی تلاش کرتے ہیں، وُہ اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔

گل رَولے لوکاں پائی اے
گل رولے لوکاں پائی اے

سچ آکھ مناں کیوں ڈرنا ایں، اِس سچ پچھے تُوں ترناں ایں
سچ سدا آبادی کرناں ایں، سچ وست اچنبھا آئی اے

بہمن آن جہان ڈرائے، پِتّر پیڑ دِتّی بھرم دوڑائے[1]
آپے دَس کے جتن کرائے، پُوجا شروع کرائی اے

---

[1] بزرگ جو مر چکے ہوں۔

پتر تساں دے اُپر پیڑا، گڑ چاول منگا وُ لیڑا[1]
جنجھ پاؤ لاہو بیڑا[2]۔ چُلی[3] نزت پوائی اے

پیڑ نہیں اینویں نکلن لگی، روک روپیہ بھانڈے[4] دگی
ہووے[5] لاکھی درست نہ لگی، بلھا ایہہ بات بنائی اے

پرتھم جنڈی[6] مات بنائی۔ جس نوں پوجے سرب لوکائی
پاچھی وڈھ کے جنج چڑھائی۔ ڈولی ٹھم ٹھم آئی اے

بُھل خدا نوں جان خدائی[7]۔ بتاں اگے سیس نوائی
جیہڑے گھڑ کے آپ بنائی۔ شرم[8] رتا نہ آئی اے

دیکھو تلسی مات بنائی، سالگ رامی سنگ پرنائی[9]
ہس ہس ڈولی جا چڑھائی۔ سالا سوہرا بنے جوائی اے

دھیاں بھیناں سب ویاہون، پر دے اپنے آپ کجاون
بلھا شاہ کیہہ آکھن آون، نہ مانا کِسے ویاہی اے

شاہ رگ تھیں رب وسدا نیڑے، لوکاں پائے لمیں جھیڑے
واں کے جھگڑے کون نبیڑے، بھج بھج عمر گوائی اے

---

[1] کپڑا۔ لتا۔ [2] لاہو بیڑا = چوغے کا بٹن کھولو۔ [3] چُلی پوانا = کسی چیز کے ترک کرنے کا عہد کروانا۔
[4] گائے [5] گہرے بھورے رنگ کی، نہ کہ ہلکے رنگ کی [6] جنڈی ایک درخت ہے۔ جسے ہندو پوجتے ہیں۔
شادی کے وقت اسکی ایک ٹہنی دولھے سے کٹوانے ہیں۔ [7] تخلیق۔ [8] ذرا بھر [9] بیاہی۔

برچھے باغ وِچ نہیں جدائی، بندہ رب تیویں بن آئی
پچھلے[1] سونے تے کھڑ آئی۔ دُبدھا آن مٹائی اے

بُلھا آپے بُھل بھلایا اے، آپے چلیاں[2] وِچ دبایا اے
آپے ہوکا دے سُنایا اے، مجھ میں بھیت نہ کائی اے

گرم سرد جیں نوں ہو پالا، حرکت کیتا چہرہ کالا
تِس نوں آکھن جی سُکھالا، اس دی کرو دوائی اے

اکھیاں پکیاں آکھن آئیاں، السی سُکھ کے آؤنی مائیاں
آپے بُھل گیئاں ہُن سائیاں، ہُن نیر ہتھ پاس سُدھائی اے

پوست آکھے مِلے افیم، بندہ بھالے قادر کریم
نہ کوئی دِسے گیان حکیم، عقل تساڈی جائی اے

جو کوئی دِسدا ہیو پیارا، بُلھا آپے دیکھن ہارا
آپے بید قرآن پکارا، جو سُفنے وست بھلائی اے
گل روے لوکاں پائی اے
گل روے لوکاں پائی اے

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۰۰)

---

[1] پچھلے جنموں کے تاثرات کی مصیبتوں کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ [2] چالیس دن کی ریاضت

گُور جو چاہے سو کردا اے

یہ کافی مُرشد کی تعریف میں لکھی گئی ہے جو قادرِ مُطلق ہے۔ دراصل وُہ خود خُدا ہے جو انسان کی صُورت میں دُنیا میں آیا ہے (بہن لباس بندہ بن بہندا ... گُور اللہ آپ کہیندا اے)۔ وُہ اُنسان کی صُورت میں ہی دُنیا کی نجات کا وسیلہ بنتا ہے۔

پہلے بند میں بُلھے شاہ اُن حواس کا ذکر کرتے ہیں جن سے انسان کو رُوحانی ضرر پہنچتا ہے، اور جن کا اُسے علم نہیں، (میرے گھر وچ چوری ہوئی سُتی رہی نہ جاگیا کوئی) اِس بات کا علم مجھے مُرشد کی رحمت سے ہُوا (میں گور بھیڑیا سوجھی ہوئی)۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مُرید کو کلمہ سے روشناس کراتا ہے جس کے ذریعے وُہ پانچوں چوروں پر قابو پالیتا ہے۔

دُوسرے اور تیسرے بند میں کائنات کی تخلیق کے کرشمہ کا بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں حقیقت ایک مخفی خزانہ تھی اور عالمِ حیرت میں تھی۔ اُس وحدت نے اپنے حُکم سے پھر کثرت پیدا کی تھا اور اس کثرت کے ہر ایک جزو میں وُہ پوشیدہ طور پر سما گئی۔ یہ ساری حقیقت مُرشد نے عشق کے ذریعہ ظاہر کی گُور جو چاہے سو کردا اے

میرے[1] گھر وِچ چوری ہوئی، سُتی رہی نہ جاگیا کوئی
میں[2] گور بھیڑیا سوجھی ہوئی، جو مال گیا سو نردا اے

پہلے[3] مخفی آپ خزانہ سی، اوتھے حیرت حیرت خانہ سی
پھر[4] وحدت دے وِچ آناسی، کُل جُز دا مجمل پردا اے

۱-۲ مُرشد ملا تو معلوم ہوا، کہ میرے اندر پانچ عیب دلٹیرے۔ ڈاکو ہیں، جو مجھے لُوٹ لیے ہیں، اور میں بے خبر ہوں۔

۳-۴ مخفی = پوشیدہ - کُل = خُدا - جزو = حصّہ یعنی رُوح - مجمل = وُہ آیت جس کی وضاحت کی ضرورت ہو۔

کُن[1] فیکون آوازا دیندا، وحدت وِچوں کثرت لیندا
پہن[2] لباس بندہ بن بہندا، کر بندگی مسجد وڑدا اے

روز[3] میثاق الست سُناوے، قالُو بلیٰ اَشہد نچاوے
پھر کجھ اپنا آپ چھپاوے، اوہ گِن گِن وستاں دھردا اے

گور، اللہ آپ کہیندا اے، گور علی نبی[4] ہو بہندا اے
گھر بیڑے دِل وِچ رہیندا اے، اوہ خالی بھانڈے بھردا اے

بُلّھا شوہ نوں گھر وِچ پایا، جِس سانگی سانگ بنایا
لوکاں کولوں بھیت چھپایا، اوہ درس[5] پرم دا پڑھدا اے

گُور جو چاہے سو کردا اے
(نقیر محمد: کلیات، کافی ۹۹)

---

[1] کُن (ہو جا)، فیکون (ہو گیا)، وحدت = ایک ہونا، یکتائی۔ یک رنگ کثرت = بہتات
[2] خدا انسانی جِسم اختیار کر کے مُرشد کی صُورت میں آتا ہے۔
[3] روزِ میثاق = اقرار والا دِن۔ الست = قُرآن شریف کی آیت ہے، "الست بربکم" رب نے رُوحوں سے پُوچھا "کیا مَیں تمہارا رب نہیں ہُوں"؟ اشہد = گواہی، رُوحوں نے گواہی دی "قالُو بلیٰ اَشہد" ہاں! تُو ہی ہمارا رب ہے۔ اِس مِصرع کا مفہوم یہ ہے کہ مُرشد نہیں چاہتا کہ وُہ بتائے، کہ وُہ ہی خُدا ہے۔ (پھر کجھ اپنا آپ چھپاوے)
[4] علی نبی = سنت، پیغمبر۔ [5] درس = سبق۔ پرم = پریم

گھونگٹ اوہلے نہ لک سجنا

دیدار کی ایک جھلک کے بعد محبوب کا چہرے کو نقاب میں چھپا لینا عاشق کو تذبذب میں ڈالتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ حقیقت مرید پر ہر وقت آشکار نہیں رہتی۔ اس کا پردہ کبھی کبھار ہی اُٹھتا ہے۔ ہجر کے لمحات میں عاشق کی آرزو معشوق کے دیدار کے لئے اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ یہی اس نظم کا مضمون ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں معشوق سے مُراد مُرشد ہے۔ لیکن اِسے خدا سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

آخری بند آدمی کے حقیقی گھر سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس دُنیا میں وُہ ایک اجنبی کی مانند ہے، مگر اُس کے اندر ایک فطری رُجحان اپنے گھر کو لوٹنے کیلئے برقرار ہے (اک دَم ہجر نہیں میں سہندی بُلبل ہیں گلزار دی ہاں)

گھونگٹ اوہلے نہ لک سجنا
میں مُشتاق دیدار دی ہاں

تیرے باجھ دیوانی ہوئی۔ ٹوکاں کر دے لوک سبھوئی
جیکر یار کریں دلجوئی تاں فریاد پُکار دی ہاں
گھونگٹ اوہلے نہ لک سجنا
میں مُشتاق دیدار دی ہاں

مُفت وکاندی جاندی باندی، مِل ماہی جند اینویں جاندی
اک دم ہجر نہیں میں سہندی، بُلبل ہیں گلزار دی ہاں
گھونگٹ اوہلے نہ لک سجنا
میں مشتاق دیدار دی ہاں

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ: صفحہ ۶۸)

۱ خواہشمند ۲ حوصلہ افزائی ۳ کنیز، نوکرانی ۴ باغ

گھونگٹ چُک لے سجّنا وے

یہ خُوبصورت کافی خدا اور مُرشد دونوں پر پُوری اُترتی ہے۔ اس کی مزید اہمیت اس بات میں ہے، کہ مُرشد خدا کی مجسّم صُورت ہے۔ بُلھے شاہ کا اپنے مُرشد کے لئے عِشق اور شکرانہ ایک طرح سے خدا کے لئے بھی ہے، کیونکہ مُرشِد کے چہرے کے پیچھے خدا کا چہرہ پوشیدہ ہے۔ بُلھے شاہ اپنے مُرشِد سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس راز کو افشا کرے، اور دُنیا کو بتا دے کہ وہ اصل میں کون ہے کافی کے چند مصرعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مُرشِد کا اپنے مرید کے عشق کے جواب میں کوئی اشارہ نہیں ملتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ عنایت شاہ بُلھے شاہ کے عشق کے تئیں بے پرواہ تھے۔ اس کافی کا مُدعا صِرف بُلھے شاہ کے عشق کی شدّت کو ظاہر کرنا ہے، جو شِکوہ کی زبان میں بیان کی گئی ہے۔

گھونگٹ چُک لے سجنا وے
ہُن شرماں کاہنوں رکھیاں نے

زُلف کُنڈل نے گھیرا پایا، بِشیئر[1] ہو کے ڈنگ چلایا
ویکھ اساں وَل ترس نہ آیا، کر کے خونی اکھیاں وے
دو نَیناں دا تیر چلایا، مَیں عاجز[2] دے سینے لایا
گھائل کر کے مُکھ چھپایا، چوریاں ایہہ کِن دسیاں نے
برہوں کٹاری تُوں کس ماری، تد مَیں ہوئیاں بے دِل بھاری
مُڑ نہ لئی تُوں سار ہماری، پتیاں تیریاں کچیاں وے
گھونگٹ چُک لے سجنا وے
ہُن شرماں کاہنوں رکھیاں وے

(عبدالمجید بھٹی: کافیاں بُلھے شاہ
صفحہ ۲۲۲)

---

[1] سانپ [2] غریب، بے بس۔

گھڑیالی دئیو نکال نی

یہ کافی بُلھے شاہ کی اُن چند کافیوں میں سے ہے جو وصال کے وجد و سُرور کے رنگ میں رنگی ہُوئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کافی اُس وقت لکھی گئی، جب شاعر کو پہلا عارفانہ مُشاہدہ ہُوا۔ اس کی آرزو ہے کہ شبِ وصال کی صُبح کبھی نہ ہو۔

دُوسرے بند میں الہٰی نغمہ (انحد واجا) کا ذکر کرتے ہیں، جو بارگاہِ خدا سے اُتر رہا ہے۔ یہ اتنا دلکش و دلفریب ہے، کہ نماز اَور روزے فراموش ہو جاتے ہیں۔

چوتھے بند میں کہا گیا ہے کہ وصال کی وجدانی کیفیت میں، گرد و نواح کی ہی نہیں بلکہ خُود اپنی بھی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ اوّل سے آخر تک اس کافی میں ایک نئی نویلی دُلھن کی اپنے شوہر سے وصال کی مُسرت کا بیان ہے۔ دُلہن چاہتی ہے کہ رات کا گُزرنا بند ہو جائے، اور دِن کے آگے ایک دیوار کھڑی کر دی جائے۔ یہ تمثیل جتنی مؤثر ہے اُتنی ہی نادر اَور اچھُوتی بھی ہے۔

یہ کافی ایک گہرے سکُون اَور کمالِ مستی کا ماحول پیدا کرتی ہے۔ یہ سمادھی کی حالت کی ایک زندہ تصویر کھینچتی ہے۔ جس میں عارف اپنے مُرشد کی نُورانی صُورت کا دیدار کرتا ہے، اور الہٰی کلمہ کے دِلکش نغمہ سے مسرُور ہو جاتا ہے۔

گھڑیالی[1] دیو نکال نی
اَج پی گھر آیا لال نی

گھڑی گھڑی گھڑیال بجاوے، رین وصل دی پیا گھٹاوے
میرے مَن دی بات جے پاوے، ہتھوں چا سٹے گھڑیال نی
انحد واجا وَجے سہانا، مُطرب سُگھڑ اتان ترانا
نماز روزہ بُھل گیا دوگانا[2]، مدھ پیالہ دین کلال[3] نی

---

[1] گھڑیالی = گھڑیال بجانے والا۔
[2] ایک قسم کی نماز جس میں دو بار جسم جھکایا جاتا ہے [3] کلال: ساقی (یہاں مُرشد سے مُراد ہے)

مُکھ ویکھن دا عجب نظارا، دُکھ دِلے دا اُٹھ گیا سارا
رَین وَڈّی کیا کرے پسارا، دِن اگتے دھرو دیوال نی

مَینُوں آپنی خبر نہ کائی، کیا جاناں مَیں کِت وِیاہی
ایہہ گل کیونکر چُھپے چُھپائی، ہُن ہویا فضل کمال نی

ٹُونے کامن کرے بہتیرے، سحرے آئے وَڈّے وڈیرے
ہُن گھر آیا جانی میرے، رہاں لکھ ورہے ایہدے نال نی

بُلّھا شوہ دی سیج پیاری، نی مَیں تارن ہارے تاری
کِویں کِویں ہُن آئی واری، ہُن وِچھڑن ہویا مُحال نی

گھڑیالی دیئو نکال نی
ہُن پی گھر آیا لال نی

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۰۴)

لے دیوار
سِلے جادُوگر۔

ماٹی کُدم کریندی یار

اِنسان کا جِسم اور اُس کا تمام مال و متاع مٹی سے بنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سب فانی ہیں۔ انسان کی زندگی کے کُل واقعات محض ایک خیالی ہستی رکھتے ہیں۔ اُن کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ ہی یہ دائمی ہیں۔

جب انسان کے پاس زیادہ دولت آجاتی ہے، تو وہ نادانی کے زیرِ اثر مغرور اور خود پسند ہو جاتا ہے (جس ماٹی پر بہتی ماٹی، تس ماٹی ہنکار)۔

آخری بند میں بُلھے شاہ ہمیں پھر یاد دلاتے ہیں کہ دُنیا کے رنگ تماشوں میں ہم موت کی آمد کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو کسی بھی حالت میں ٹل نہیں سکتی (ہس کھیڈ مُڑ ماٹی ہوئی، ماٹی پاؤں پسار)۔

ماٹی کُدم کریندی یار

ماٹی جوڑا، ماٹی گھوڑا، ماٹی دا اسوار
ماٹی ماٹی نوں دوڑائے، ماٹی دا کھڑکار

ماٹی ماٹی نوں مارن لگی، ماٹی دے ہتھیار
جس ماٹی پر بہتی ماٹی، تس ماٹی ہنکار

ماٹی باغ بغیچہ ماٹی، ماٹی دی گلزار
ماٹی ماٹی نوں ویکھن آئی، ماٹی دی اے بہار

ہس کھیڈ مُڑ ماٹی ہوئی، ماٹی پاؤں پسار
بُلھا ایہہ بوجھارت بوجھیں، لاہ سِروں بھوئیں مار
ماٹی کُدم کریندی یار

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۰۸)

لے مٹی کا پُتلا (انسان)، رات دِن دوڑ دُھوپ میں لگا ہوا ہے۔

ماہی وے تیں ملیاں سب دُکھ ہوون دُور

خدا سے وصال کے بعد سب غم دُور ہو جاتے ہیں۔ حسبِ معمول ہیر اور رانجھا کی مثال دے کر بلھے شاہ کہتا ہے کہ دُنیا عشق کی اصل اہمیت سے بے خبر ہے۔ دُنیا کے لئے رانجھا ایک چرواہا ہے، لیکن ہیر کی نظر میں وُہ خداوندِ کریم ہے۔ دُنیا عنایت شاہ کو محض ایک ارائیں سمجھتی ہے، لیکن بلھے شاہ کے لئے وُہ قادرِ کُل ہے۔

کافی کے آخری بند میں کہا گیا ہے کہ خدا نہ نزدیک ہے اور نہ ہی دُور۔ وُہ نزدیک اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی دیکھ نہیں پاتا۔ اور دُور اس لئے نہیں کہ وُہ ہمارے اپنے اندر ہی رہتا ہے۔

ماہی وے تیں ملیاں، سب دُکھ ہوون دُور
لوکاں دے بھانے چاک چکیٹیا، ساڈا رَبّ غفور[1]
جیندے ملن دی خاطر چشماں، بہندیاں سی نت جھور[2]
اُٹھ گئی ہجر جُدائی جگروں، ظاہر وسدا نُور
بُلھا رمز سمجھ دی پائیا، نہ نیڑے نہ دُور
ماہی وے تیں ملیاں، سب دُکھ ہوون دُور

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۰۶)

---

[1] چاک = نوکر۔ چکیٹیا = ادنےٰ نوکر۔ غفور = بخشنے والا۔ لوگ رانجھے کو چاک چکیٹیا کہتے ہیں۔ لیکن میرے لئے وُہ بخشندہ خدا کی صورت ہے۔
[2] جس کے ملنے کے لئے آنکھیں برس رہی تھیں اور بے قرار تھیں۔

مائے نہ مُرڑدا عِشق دیوانہ

ایک کہاوت ہے "جہاں عشق ہے وہاں قانون نہیں"۔ اِس کافی کا نفسِ مضمون اِن دونوں میں تضاد ظاہر کرتا ہے۔ اگر عشق سچا اور گہرا ہے تو قانون کو ہار ماننی پڑے گی۔ سچے عاشق کو لوگوں کی لعنت ملامت اور تمسخر برداشت کرنے پڑینگے، (مارن بولی تے بولی نہ بولاں سُناں نہ کن لا کے) محبوب کیسا تھ وصال کے بعد مومن اور کافر کا امتیاز مٹ جاتا ہے (مومن کافر مینوں دونویں نہ دِسدے وحدت دے وِچ آ کے)۔

عیبوں میں غلطاں ہو کر ہم نے شیطان کو اپنا خاوند بنایا ہوا ہے۔ ہمیں اُس سے علیحدہ ہونا ہے، اور خدا سے رشتہ جوڑنا ہے (میں وڈ بھاگی ماریا خاوند ہتھیں زہر پلا کے)، سچے عِشق میں جھوٹی شرم اور ملامت کا ڈر جاتا رہتا ہے (وصل کراں میں نال سجن دے شرم حیا گوا کے وِچ چمن میں پلنگ وچھایا یار ستی گل لا کے)

مائے نہ مُرڑدا عِشق دیوانہ، شوہ نال پریتاں لا کے
عِشق شرع دی لگ گئی بازی، کھیڈاں میں داؤ لگا کے

مارن بولی تے بولی، نہ بولاں سُناں نہ کن لا کے
ویہڑے وِچ شیطان[1] تھینیدا، اُس نوں رکھ سمجھا کے

توڑ شرع نوں جت لئی بازی، پھر دی نک[2] وڈھا کے
میں انجانی کھیڈ[3] وگُتیاں، کھیڈاں میں آکے[4] با کے

---

[1] شیطان تھینیدا نفس شرارتیں کرتا ہے۔ [2] نک وڈھا کے = بے عزتی کروا کے۔
[3] کھیل میں لگ کر ذلیل ہوئی [4] آکے با کے = بچوں کا ایک کھیل۔

کلام: کافیاں

ابہہ کھیڑاں ہُن لگدیاں جھیڑاں[١]، گھر پیا دے آ کے
سیّاں نال میں پاواں گِدھا، دِلبر نُوں لُک چھا کے

پچھو نی ابہہ کیوں شرماندا، جاندا نہ بھیت بتا کے
کافر کافر آکھن مینوں، سارے لوک سُنا کے

مومن کافر مینوں دونویں نہ دِسدے، وحدت دے وِچ آ کے
چولی چُنّی نے پھوکیا جھگا، دھونی شِرک[٢] جلا کے

واریا کُفر وڈا میں دِل تھیں، تلی تے سیس ٹکا کے
میں[٣] وڈبھاگی ماریا خاوند، ہتھیں زہر پلا کے

وصل کراں میں نال سجن دے، شرم حیا گوا کے
وِچ چمن میں پلنگ وچھایا، یار سُتی گل لا کے

سر[٤] دیہی نال مِل گئی سر دیہی، تھیا شوہ نوں پا کے
مائے نہ مُڑدا عشق دیوانہ، شوہ نال پریتاں لا کے

(فقیر محمد: کلیات، کافی ١٠٧)

---

١ مخول۔ ٢ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کی عبادت کرنا شرک ہے۔
٣ میں خوش قسمت تھی، کہ میں نے اپنے نفس (خاوند) کو کلمہ کے ذریعہ مارا (ماریا خاوند ہتھیں زہر پلا کے)۔
٤ مکمل طور پر اللہ میں جذب ہو گیا ہوں۔

مِتر پیارے کارن نی مَیں لوک الاہمے سہنی آں

اِس کافی میں بھی باقی کافیوں کی طرح ہیر اور رانجھے کا نام لبطور استعارہ کے آیا ہے۔ یہاں رانجھا سے مُراد خُدا یا مُرشد ہے اور ہیر مُتلاشی رُوح یا مُرید کی علامت ہے۔

تصور کی شدت اور یکسُوئیت میں عاشق کو کبھی کبھی یُوں محسُوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا محبوب اُس کے پاس ہی کھڑا ہو (لگا نیونہہ میرا جس سیتی۔ ویکھ سرہانے پلنگ دی جیتی) اور جس طرح ہیر دُنیا کے طنز و مزاح سے بے نیاز تھی، اُسی طرح عاشقوں کو دُنیا اور سماج کے لوگوں کے ذریعے کی گئی اُن کی بے عزتی اور تمسخر کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

آخری بند میں حسبِ معمول بُلھے شاہ امید ظاہر کرتا ہے کہ اُس کا محبوب اُسے دیدار دے گا، اور اُس کی جُدائی کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی۔

مِتر پیارے کارن نی مَیں لوک الاہمے سہنی آں

لگا[1] نیونہہ میرا جس سیتی، ویکھ سرہانے پلنگ دے جیتی
عالم[2] کیوں سمجھاوے ریتی، مَیں ڈٹھے باجھ نہ رہنی آں
تُسیں[3] سمجھاؤ ویرو بھوری، رانجھن مَیتھوں رہندا چوری
جَینہدے[4] عشق گھتی گل ڈوری، مَیں نال آرام نہ بہنی آں
برہوں آ وڑیا وِچ ویہڑے، روز ہزار دیوے تن گھیرے
ڈارُو[5] درد نہ باجھوں تیرے، مَیں سجناں باجھ مرینی آں
بُلھے[6] شوہ گھر رانجھن آوے۔ مَن نتی نوں لے گل لاوے
نال[7] خوشی دے رین وہاوے، نال سجن دے رہنی آں

(ماخذ: کافیاں بُلھے شاہ، صفحہ ۳۷۲)

۱۔ جس کے ساتھ میرا پیار ہے اُس کو پلنگ کے سرہانے (پاس) کھڑا دیکھ کر جیتی ہُوں ۲۔ ریتی = رسم و رواج دُنیا مجھے رسم و رواج سمجھاتی ہے؛ لیکن مَیں محبوب سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ۳۔ آپ لوگ رانجھے کو ذرا سمجھاؤ کہ مجھ سے دُور کیوں رہتا ہے؟ ۴۔ ۵۔ مَیں جس کے عشق میں مُبتلا ہُوں وُہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ جُدائی کے درد کا ایک ہی علاج ہے اور وُہ ہے محبوب کا دیدار۔ ۶۔ ۷۔ نتی: دُکھی، بیچاری۔ رین: رات۔ وہاوے: بسر ہو۔

مُرلی باج اُٹھی اَن گھاتاں

اِس کافی سے مولانا روم کی مثنوی کے ابتدائی شعر کی یاد آتی ہے جس میں اُنہوں نے کہا ہے۔
"بشنو از نے چوں حکایت میکند، وز جدائیہا شکایت میکند" یعنی بانسری کی کہانی سُن کہ وُہ کیا کہتی ہے۔ وُہ اپنی جُدائی کی شکایت کر رہی ہے۔ بانسری کی آواز ایک بلند روحانی طبقہ کی موسیقی سے تعلق رکھتی ہے۔ اِس کا دلفریب نغمہ آخری منزل کی لاثانی موسیقی کی خبر دیتا ہے۔
چنچل من بانسری کی دِلکش آواز سُن کر غیر متحرک ہو جاتا ہے (مُن مَیں چنچل مرگ پھہایا) اِس سے پہلے وُہ کسی عبادت میں مشغول تھا، اور اُس کو راہ پر لانے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تھی۔
آخری بند میں سرور کے کمال تک پہنچنے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ (دُلبھا شَوہ مَیں ہَن پر لائی)۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُن لوگوں پر ترس کھایا گیا ہے، جو خدا کو باہر ڈھونڈتے ہیں (کھوجی کِت وَل دست برا تاں)

مُرلی باج اُٹھی اَن گھاتاں[1]
سُن کے بُھل گئی سب باتاں

لگ گئے[2] انحد بان نیارے، سَب دُنیا کُوڑ پسارے
سائیں[3] ویکھن مُکھ و نجارے، مینُوں بُھل گئیاں سب باتاں

---

[1] اَن گھاتاں = اچانک، میرے اندر انحد شبد کی مُرلی بج اُٹھی ہے۔ اِس مُرلی کی تان سُن کر مُجھے سب کچھ بھُول گیا ہے۔
[2] انحد شبد کے ایسے انوکھے تیر کلیجے میں لگے ہیں، کہ دُنیا کے بکھیڑے بے معنی معلُوم ہونے لگے ہیں۔
[3] ہم تو صرف محبُوب کا دیدار چاہتے ہیں۔

بن[1] بیں چنچل مِرگ پھاہایا، اوسے میئوں بھڑ بہایا
صرف[2] دوگانہ عشق پڑھایا، رہ گئیاں ترَے چار رکعتاں

بلّھے[3] شاہ بیں ہُن بَرلائی. جد کی مُرلی کاہن بجائی
باوری[4] ہو تُساں وَل دھائی . کھوجی کت وَل دست براماں

مُرلی باج اُٹھی اَن گھاتاں
سُن کے بُھل گئی سَب باتاں

(انورعلی رہتکی: قانونِ عشق صفحہ ۱۳۳، کافی ۱۰۱)

---

[1] (اتحدشبد سُن کر) نفس کا ہرن بس میں آگیا ہے۔ رکعت = نماز میں جُھکنا۔
[2] اس نے مجھے عشق کا گیت پڑھایا ہے، جو کہ میں نے سارا پڑھ لیا ہے۔ صرف تھوڑا ہی باقی ہے (رہ گئیاں ترے چار رکعتاں) [3] اے بلّھے شاہ، جب سے مَیں نے محبوب کی بانسری سُنی ہے مَیں نشے میں چُور ہوں۔
[4] عالمِ وحشت میں محبوب کے نعمتوں بھرے ہاتھ اور خوشیوں بھری راہ تلاش کر رہی ہوں۔
فقیر محمدؐ کی کافی میں، جو بند نیچے لکھا جا رہا ہے، درج ہے، اس کا مطلب ہے: باطن میں محبوب ظاہر ہوگیا ہے، دُنیا کے تمام جھگڑے ختم ہو گئے ہیں. جو انسان کلمہ ہیں جذب ہو جاتا ہے اس میں پیغمبر الٰہی صفات بھر دیتے ہیں۔

بوُہے آن کھلوتا یار، بابل ہجّ ہیا تکرار
کلمے نال جے ریہے دہار، ہنی محمد بھرے شفاتاں

مُنہ آئی بات نہ رہندی اے

یہ بُلھے شاہ کی سب سے اہم کافیوں میں سے ایک ہے۔ سچ کا اعلان کرنا اور اس پر دلیری سے ثابت قدم رہنا اِس کافی کا مرکزی موضوع ہے۔ ڈر اور مصلحت کے باعث سچ کی راہ میں جو مشکلات درپیش ہیں، ان کا بیان کم ہی کسی اور صُوفی شاعر نے اتنے پُرزور الفاظ میں کیا ہو گا (سچ آکھاں بھانبڑ مچدا اے)۔ ڈر اور مصلحت کی جھجک یُوں بیان کی گئی ہے "جھج جھج کے جیبھا کہندی اے"۔

یہ اور بات ہے کہ وُہ حقیقت جس پر بُلھے شاہ زور دیتا ہے، ایک کھلی سچائی ہے کہ خالق اور اس کی مخلوق ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں (تُلبھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں، بِن شوہ تھیں دُوجا ککھ نہیں) وُہ ہر انسان کے اندر رہتا ہے اور وہیں سے مل سکتا ہے (اندر وڑ کے ویکھو کیہڑا اے)۔ اِس بنیادی روحانی حقیقت کے علاوہ بُلھے شاہ دلیری سے اخلاقی اصُول کی تلقین کرتا ہے، کہ سب رکاوٹیں ہوتے ہُوئے بھی انسان کو سچ بولنے سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ اِس دُنیا کا خاصہ جہالت کا اندھیرا ہے، اور بُلھے شاہ اس کو پھسلنے والا آنگن (تِلکن بازی ویہڑا) کہتا ہے۔ اس کی دلفریب اشتغال انگیز خواہشات خدا کی راہ میں متواتر خطرہ بنی رہتی ہیں۔ اپنی دُوسری بہت سی کافیوں کی طرح اس کافی میں بھی بُلھے شاہ خُدا کو ہر جگہ اور ہر شے میں حاضر ناظر دیکھتا ہے۔

کِتے ناز ادا دکھلائی دا، کِتے ہو رسُول ملائی دا
کِتے عاشق بن بن آئی دا، کِتے جان جدائی سہندی اے
مُنہ[1] آئی بات نہ رہندی اے

---

[1] جس کے دِل میں عشق اور وحدت کا زور ہو، وُہ من کی بات روک نہیں سکتا۔

جھوٹھ[1] آکھاں تے کجھ بچدا اے، سچ آکھاں بھانبڑ مچدا اے
جی دوہاں گلاں توں جچدا اے، جچ جچ کے جیبھا کہندی اے

اک لازم بات ادب دی اے، سانوں بات معلومی سب دی اے
ہر[2] ہر وچ صورت رب دی اے، کتے ظاہر کتے چھپیندی اے

جس[3] پایا بھیت قلندر دا، راہ کھوجیا اپنے اندر دا
اوہ واسی ہے سکھ مندر دا، جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی اے

ایتھے دنیا وچ ہنیرا اے، ایتھے تلکن بازی ویہڑا اے
اندر وڑ کے ویکھو[4] کیہڑا اے، باہر خلقت پئی ڈھونڈیندی اے

ایتھے[5] لیکھاں پاؤں لیارا ہے، اِس دا وکھرا بھید نیارا ہے
اک صورت دا چمکارا ہے، جیوں چنگ دارُو وچ پیندی اے

---

۱ جھوٹ کہوں تو کچھ بات آن کی رہ جاتی ہے۔ سچ کہوں تو دُنیا میں آگ لگ جاتی ہے۔ دِل دونوں باتوں سے ڈرتا ہے۔ لیکن ڈرتے ڈرتے بھی سچ مُنہ سے نِکل ہی رہا ہے۔

۲ سچ یہ کہ ہر وجود میں رب کی ذات سمائی ہوئی ہے، کہیں پوشیدہ طور پر کہیں ظاہری طور پر۔

۳ قلندر: عام اصطلاح میں ریچھ اور بندر نچانے والا۔ فقیروں کی اصطلاح میں دین و دُنیا سے آزاد آدمی۔ مطلب یہ کہ مَن کو قابو کرنے والے فقیروں کی رمز سمجھنے والے ہی اپنے اندر حقیقت کی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کو سکھ مندر یعنی دائمی اور لافانی سرور کا عالم نصیب ہو جاتا ہے، جو نفع نقصان، اُتار چڑھاؤ سے پرے ہے۔

۴ جو لوگ باہر تلاش کرتے ہیں وہ دیوانہ وار گھوم رہے ہیں اور منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔ اصلیت کی جانکاری اندر تلاش کرنے والوں کو ہی ہوتی ہے۔ خلقت: جنونی، خبطی۔ باہر ڈھونڈنے والے خبطی کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ۵ لیکھاں پاؤں لیارا اے: رب نے دُنیا کا کھیل بنایا ہے جس طرح بارُود میں چنگاری لگائی جائے تو دھماکہ بھی ہوتا ہے اور آگ بھی نکلتی ہے، اُسی طرح یہ دُنیا الٰہی صورت کی ایک جھلک ہے۔

کِتے ناز ادا دکھلائی دا ۔ کِتے ہو رسول[1] مِلائی دا
کِتے عاشق بن بن آئی دا ۔ کِتے جان جدائی سہندی اے

جدوں ظاہر ہوئے نور ہوریں ۔ جل گئے پہاڑ کوہِ طور ہوریں
تدوں دار چڑھے منصور ہوریں ۔ اوتھے شیخی[2] نہ مَیڈھی تیڈھی اے

جے[3] ظاہر کراں اسرار تائیں ۔ سب بھل جاون تکرار تائیں
پھر مارن بلھے یار تائیں ۔ ایتھے مخفی گل سوہندی اے

اساں[4] پڑھیا علم تحقیقی اے ۔ اوتھے اکو حرف حقیقی اے
ہور جھگڑا سب ودھیکی اے ۔ اینویں رولا پا بہندی اے

بلھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں ۔ بن شوہ تھیں دوجا کُکھ نہیں
پر ویکھن والی اکھ نہیں ۔ تاہیں جان پئی دکھ سہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

انور روشنی: قانونِ عشق
صفحہ ۲۴۶ - کافی نمبر ۷

---

[1] کہیں تم ناز و نیاز کا اظہار کرتے ہو، کہیں رسول بن کر تم رُوح کو رب کے ساتھ ملاتے ہو۔ کہیں خود اپنا عاشق بن کر آ جاتے ہو، اور کہیں خود اپنے ہجر میں تڑپتے ہو۔ یہاں آپ ہمہ اوست کی حالت بیان کر رہے ہیں۔

[2] مبری یا تیری شیخی نہیں چل سکتی۔

[3] اسرار = بھید، راز - تکرار = جھگڑا - مخفی = پوشیدہ، چھپی ہوئی۔

[4] حرفِ حقیقی = سچ، کلمہ یا شبد - علم تحقیقی = کھوج کے ذریعہ حاصل کی ہوئی واقفیت تک پہنچا ہوں کہ وحدت سچائی ہے اور دوئی کا جھگڑا فضول ہے۔

میرا رانجھا ہُن کوئی ہور

رانجھا کا استعارہ اِس کافی میں خدا کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ اُس کے حکم کا نتیجہ ہے کہ خدائی نُور اور کلام عنایت شاہ پر نازل ہُوا۔ (تخت منوّر بانگاں ملیاں، تاں سُنیاں تخت لاہور) اِس نظم میں بُلھے شاہ یہ راز افشا کرتا ہے کہ مُتلاشی کے دل میں خدا کے لئے عشق خدا کی طرف سے ہی آتا ہے (رانجھا تخت ہزارے دا سائیں، ہُن اوتھوں ہویا چور)، یہ خدا ہی ہے جو اپنے مُتلاشی کی تلاش میں اپنا منوّر تخت چھوڑ کر اس دُنیا میں آدمی کے بھیس میں مُرشد بن کر آتا ہے۔

آخری دو مصرعوں میں کہا گیا ہے کہ عشق الٰہی انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

بُلھا شاہ اساں مرنا ناہیں۔ قبر پائے کوئی ہور

میرا رانجھا ہُن کوئی ہور

تخت منوّر بانگاں ملیاں
تاں سُنیاں تخت لاہور
عِشقے مارے ایتویں پھردے
جِویں جنگل وِچ ڈھور
رانجھا تخت ہزارے دا سائیں
ہُن اوتھوں ہویا چور
بُلھا شاہ اساں مرنا ناہیں
قبر پائے کوئی ہور

میرا رانجھا ہُن کوئی ہور

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۱۹)

میری بُکّل دے وِچ چور

خُدا اندر ہے اور لوگ جہالت میں اُسے باہر ڈھونڈتے ہیں۔ وُہ اپنے آپ کو اُن مذہبی فرقوں سے منسوب کرتے ہیں، جن میں وُہ اتفاقاً پیدا ہوئے ہیں۔ اِس طرح وُہ اپنے آپ کو شرعی تنگ نظریوں اور رسُومات میں قید کر لیتے ہیں (رکتے رام داس کِتے فتح محمدؐ ایہو قدیمی شور) مختلف مذہبی فرقوں کے رسم ورواج اپنے اپنے ہیں، اور ان فرقوں کے لوگ ان چھوٹے سطحی اختلافات پر جھگڑا مول لے لیتے ہیں۔

مُسلمان سَڑنے توں ڈردے ، ہندُو ڈر دے گور
دونویں ایسے دے وِچ مَردے، ایہو دوہاں دی کھور

جَب وُہ خُدا کو اپنے اندر پا لیتے ہیں تو اُن کے بچکانہ جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن کو ایک ہی خُدا کا ظہور سب میں نظر آتا ہے۔

پانچویں بند سے یہ ظاہر ہے، کہ بُلھے شاہ کا مُرشد قادری جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس جماعت کا پہلا مُرشد بغداد سے آیا تھا:۔

پِیر پیراں بغداد اساڈا ، مُرشد تخت لاہور۔

مَیری بُکّل دے وِچ چور
نی، میری بُکّل دے وِچ چور
کِہنُوں کُوک سُناواں ، نی، میری بُکّل دے وِچ چور
چُوری چوری نِکل گیا . جَگ وِچ پے گیا شور
مُسلمان سَڑنے توں ڈردے، ہندو ڈردے گور
دونویں ایسے دے وِچ مَردے، ایہو دوہاں دی کھور

---

۱ وُہ محبُوب میرے اندر رہتا ہے۔ ۲ وُہ محبُوب دنیا میں کئی رنگ اختیار کرتا ہے، جس کی وجہ سے کئی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ ۳-۴ گور = قبر۔ کھور = دُشمنی۔ ہندُو اور مُسلمان اس بات پر جھگڑتے ہیں کہ مُردے کو جلانا چاہیئے یا دفن کرنا چاہیئے۔

کِتےؔ رام داس کتے فتح محمد، ایہو قدیمی شور
مِٹ گیا دُوہاں دا جھگڑا، نِکل پیا کُجھ ہور

عرشؔ منور بانگاں مِلیاں، سُنیاں تخت لاہور
شاہ عنایت کُنڈیاں پائیاں، لُک چُھپ کِھچدا ڈور

جسؔ ڈھونڈیا تِس نے پایا، نہ جُھر جُھر ہویا مور
پیر پیراں بغداد اساڈا، مُرشد تخت لاہور

ایہو تُسیں وی آکھو سارے، آپ گُڈّی آپ ڈور
مَیں دَستاں تُسی پکڑ لیاؤ، بُلھے شاہ دا چور

میری بُکّل دے وِچ چور
نی، میری بُکّل دے وِچ چور (فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۱۸)

لہ قدیمی شور = پرانا جھگڑا۔ کوئی ہندوؤں والا نام رکھتا ہے، کوئی مُسلمانوں والا۔ یہ جھگڑا ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ لہ جب اصلیت کا پتہ لگا۔ یعنی خدا کو اپنے اندر موجود پایا تو دُوئی کا جھگڑا فضول نِکلا۔ سہ عرش منور = ربّی نور والا تخت، بانگاں = شبد، صوت، آواز، کلمہ یا کلام کی دُھن۔ خدا کی آواز نورانی تخت سے اُتری اور اُسے شاہ عنایت نے لاہور میں سُنا۔ ۴ہ جُھر جُھر ہو یا مور = مور کی طرح غمگین ہوا۔ جس نے محبوب کی تلاش کی اُس نے اُسے پا لیا اور اُسے نا امید نہیں ہونا پڑا۔

میرے ماہی کیوں چر لایا اے

اس کافی کا بنیادی خیال بُلھے شاہ کا دِل پسند موضوع 'عشق کی گراں قیمت' ہے۔ عشق کا درد بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے (جس تن لاگے سو تن جانے) شکوے کے انداز میں بُلھے شاہ اپنے آپ کو پُوچھتا ہے کہ کیا اُس نے عشق میں کوئی نفع حاصل کیا؟ (اندر جھڑکاں باہر طعنے، ئیوں لا ایہہ سُکھ پایا اے)۔ دُوسرا بند بھی اِسی پیرایہ میں چلتا ہے:-

نیناں کار رووَن دی پکڑی، اک مرناں دوجا جگ دی پھکڑی
برہوں جند اوّلی جکڑی، نی میں رورو حال ونجایا اے

تیسرا بند روحانی عرُوج پر لے جاتا ہے۔ جس میں بُلھے شاہ اپنی کامیابی کا منصُور کی کامیابی سے مقابلہ کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ اُس نے حقیقت کا وُہی پیالہ پیا ہے جو منصُور نے بھر کر پیا تھا۔

میں پیالہ تحقیق لیتا اے، جو بھر کے منصُور پیتا اے

یہ اندازِ بیان چوتھے اور پانچویں بندوں میں بھی جاری ہے، جس میں ہجر کے دُکھ کا وصال کی خوشی میں بدل جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کافی کا آخری بند بُلھے شاہ نے مرشد کے خراجِ تحسین میں لکھا ہے، کہ یہ اس کا مُرشد ہی تھا جس کے ذریعہ اس کا خُدا سے وصال ہُوا۔

میرے ماہی کیوں چر لایا اے

کہہ بُلھا ہُن پریم کہانی، جس تن لگے سو تن جانے
اندر جھڑکاں باہر طعنے، ئیوں لا ایہہ سُکھ پایا اے

نیناں کار[1] رووَن دی پکڑی، اک مرنا دوجا جگ دی پھکڑی[2]
برہوں جند اوّلی جکڑی، نی میں رورو حال ونجایا اے

---

[1] کام، عادت [2] ٹھٹھا

ایں پیالہ تحقیق[1] لیتا اے، جو بھر کے منصور پیتا اے
دیدار معراج[2] پیالیتا اے، ایں کھوہ ہتیں وضو[3] سجایا اے

عشق مُلاں نے بانگ دیوائی، شوہ آون دی گل سُنائی
کر نیت سجدے وَل آئی، نی ایں مُنہ محراب[4] لگایا اے

بُلھا شوہ گھر لپٹ[5] لگائیں، رستے موں سب بن تن آئیں
میں ویکھاں اعنایت سائیں، جِس مینوں شوہ ملایا اے

میرے ماہی کیوں چِرلایا اے
(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۱۴)

---

[1] تحقیق = حقیقت، اصلیت۔ [2] معراج = وُہ وقت جبکہ حضرتِ محمد صاحب نے خُدائی نور کا روبرو جلوہ دیکھا۔ [3] وضو = نماز پڑھنے کے لئے ہاتھ مُنہ دھونا۔ [4] محراب = وُہ طاق جو بشکل کمان مسجد کے اندر بطرفِ قبلہ بناتے ہیں۔ جہاں سے امام اپنا خُطبہ پڑھتے ہیں۔
[5] لپٹ پیار

میرے گھر آیا پیا ہمرا

عشق کے موضوع پر لکھی بہت سی دُوسری کافیوں کے برعکس یہ کافی عشق کی شکایت میں نہیں بلکہ مُرشد کے شکرانہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ ہجر کے درد کے ساتھ نہیں بلکہ وصل اور انحد کی بانسری کی مُقدس موسیقی کی لذت سے وابستہ ہے۔ یہ تحفہ اُسے اپنے مُرشد عنایت شاہ سے مِلا ہے جس کے لئے وُہ کافی کے پہلے بند میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

واہ واہ وحدت کیتا شور
انحد بانسری دی گھنگھور
اساں ہُن پایا تخت لاہور

اِس خدائی وصال سے جو سرُور پیدا ہوتا ہے وُہ مُسرّت آمیز ہے۔

جل گئے میرے کھوٹ نکھوٹ

....

لگ گیا مست پیالہ ہات

....

ہُن سانوں سب جگ دِسدا لال

وصال کی آرزُو اب ایک خیالی امید ہی نہیں رہی، بلکہ حقیقت میں بدل گئی ہے۔

ہُن سانوں نہیں آس دی پھاس
بلھا شوہ آیا میرے پاس
سائیں پُجائی ساڈی آس

میرے گھر آیا پیا ہمرا

[1] واہ واہ وحدت کیتا شور، انحد بانسری دی گھنگھور
[2] اساں ہُن پایا تخت لاہور
[3] جل گئے میرے کھوٹ نکھوٹ، لگ گئی پریم سچے دی چوٹ
ہُن سانوں اوس خصم دی اوٹ
[4] ہُن کیا کینے سال وصال، لگ گیا مست پیالہ ہات
ہُن میری بُھل گئی ذات صفات
[5] ہُن کیا کینے بیس پچاس، پیتم پائی اساں ول جھات
ہُن سانوں سب جگ سدا لال
ہُن سانوں نہیں آس دی پھاس، بُلھا شوہ آیا ہمرے پاس
[6] سائیں پجائی ساڈی آس

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۱۶)

---

۱ میرے اندر انحد شبد کی بانسری کی آواز بڑے زور سے سُنائی دے رہی ہے۔

۲ بُلھے شاہ کے مُرشد حضرت عنایت شاہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ اشارہ مُرشد کی نُورانی صُورت کی طرف ہے، جس کا مشاہدہ بُلھے شاہ کو اپنے اندر انحد شبد کے سُننے کے وقت ہُوا۔

۳ میرے سیاہ اعمال جل کر ختم ہو گئے۔ باطن میں سچا عشق بیدار ہو گیا۔ اور محبوبِ حقیقی کا سہارا مِل گیا۔

۴ مجھے مستی کا پیالہ مِل گیا ہے۔ وصال کے انتظار کی ضرورت نہیں رہی۔ میری الگ ہستی اور الگ ذات وصفات ختم ہو گئی ہیں، اور میں محبوب میں جذب ہو کر اس کی صُورت ہو گئی ہُوں۔

۵ فراق کی تمام گنتیاں ختم ہو گئی ہیں۔ محبوب نے ہماری طرف نگاہ کی ہے۔ اُس محبوب کا ہی عکس دکھائی دینے لگ گیا ہے۔

۶ مالک نے میری حسرت پُوری کر دی ہے۔

میرے نوشوہ دا کِت مول

خدا کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہُوا (میرے نوشوہ دا کِت مول) بُلھے شاہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم اِس زندگی میں اُسے پانے کے لئے مناسب قدم نہیں اٹھاتے، بلکہ ہم اپنا وقت اور طاقت بیکار رسموں رواجوں یا کتابی علم حاصل کرنے میں کھو دیتے ہیں (اگلے وَل دی خبر نہ کوئی رہے کتاباں بھول)۔

تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں زمانہ کے بگڑے ہُوئے حالات کی نقش آرائی کی گئی ہے۔ اچھے لوگ مصیبت کا شکار ہوتے ہیں اور بُرے پھلتے پھُولتے ہیں۔

سچیاں نُوں پَے وَجن پَوے، جھوٹھیاں کرن کلول
چنگ چنگیرے پرے پریرے، اسیں آئیاں سی اَن بھول

اِن حالات میں بُلھے شاہ سچ بولنے سے ہچکچاتا ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کی بات سُننے کو تیار نہیں (بُلھا شاہ بولاں گا، ہُن کون سُنے میرے بول)۔

میرے نوشوہ دا کِت مول

اگلے وَل دی خبر نہ کوئی۔ رہے کتاباں بھول
سچیاں نُوں پَیے وَجن پَوے۔ جھوٹھیاں کرن کلول
چنگ چنگیرے پرے پریرے، اسیں آئیاں سی اَن بھول
بُلھا شاہ جے بولاں گا ہُن۔ کون سُنے میرے بول
میرے نوشوہ دا کِت مول

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۱۷)

---

۱ نوشوہ = خاوند، محبوب، کِت مول = کیا قیمت ہے؟ یعنی انمول ہے۔
۲ مذہبی کتابوں سے محبوب کے گھر کا پتہ نہیں لگتا۔
۳ پَوے = جُوتے۔ دُنیا میں سچوں کو دھکے ملتے ہیں، اور جھوٹے عیش کر رہے ہیں۔
۴ اَن بھول = معصوم۔ ۵ کوئی بھی سچی بات سُننے کو تیار نہیں ہو گا۔

مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آکر پھیرا

بُلھے شاہ کی یہ سِہ حرفی عزیز کافی اپنے مُرشد کے عشق اور وصال کی آرزو سے بھرپور ہے۔ وُہ بڑی بیتابی سے اُس کے آنے کی امید کر رہا ہے، اور التجا کرتا ہے کہ وُہ آنے میں مزید تاخیر نہ کرے۔ چُونکہ وُہ اپنے محبُوب کی جُدائی اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا، اِس لئے وُہ کسی پیامبر کی تلاش میں ہے، جو اُس کی قابلِ رحم حالت بیان کر کے اُسے جلدی آنے پر مجبور کرے۔

لوگ مکّہ کی زیارت کے لئے جاتے ہیں، لیکن بُلھے شاہ کہتا ہے کہ اُس کا مکّہ اُس کا مُرشد عنایت شاہ ہے۔ وُہ عشق کے ظلم وستم پر آہ وزاری کرتا ہے، کیونکہ اُس کے محبُوب نے اُسے نظرانداز کر دیا ہے۔ اُس کو یہ سوچ کر کچھ تسلّی ہوتی ہے، کہ اِس مصیبت میں وُہ اکیلا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے کئی اور دوست بھی اسی مرض میں مُبتلا ہیں (سر سر بھانبڑ بھڑکیا سب تیاریاں گئیاں)۔ سخت تلاش کے باوجود لوگ اِس دُنیا سے اُسے پائے بغیر خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں۔ وُہ چند لوگ جو خُدا کو پا لیتے ہیں وُہ یہ زندگی بھی خوشی خوشی بسر کر جاتے ہیں۔ (جیہڑیاں ساہورے منّیاں سوئی پیکے ہوون)

مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

مَیں جو تینُوں آکھیا کوئی گھل سُنیہڑا، چشماں سیج[1] وچھایاں دل کِنیا ڈیرا
لٹک چلیندا[2] آوندا شاہ عنایت میرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

اوہ اجیہا کون ہے جا آکھے جیہڑا، مَیں وِچ کیہہ تقصیر ہے مَیں بردا تیرا
تَیں باجھوں میرا کون ہے دِل ڈھاؤ نہ میرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

ڈھونڈ شہر سب بھالیا قاصد گھلاں کیہڑا، چڑھیاں ڈولی پریم دی دِل دھڑکے میرا
آ ذ عنایت قادری جی چاہے میرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

---

[1] تیرے لئے آنکھوں کی سیج بچھائی ہے۔
[2] لٹک چلیندا: مست چال سے آتا ہے۔

پہلی پوڑی پریم دی پُل صراطے[۳] ڈیرا، حاجی[۴] مکّے حج کرن مَیں مکھ وکھاں تیرا
آؤ[۵] عنایت قادری ہتھ پکڑیں میرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا
جل بل آہیں ماریاں دِل پتھر تیرا، پا کے کُنڈی پریم دی دِل کھچیو میرا
مَیں[۶] وِچ کوئی نہ آپیا وِچ پردا تیرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا
دست[۷] کنگن باہیں چوڑیاں گل نونگ چولا، رانجھن[۸] مینوں کر گیا کوئی راول رَولا
آن نویں دُکھ پے گئے سُولاں[۹] دا گھیرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا
مَیں جاتا دُکھ مینوں آ ہا دُکھ پیے گھر گیاں، سر سر بھانبڑ بھڑکیا سب تپدیاں گیاں
ہُن آن بنی سر اپنے چُک گیا سب جھیڑا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا
جیہڑیاں سا ہورے متیاں سوئی پکیے ہوون. شوہ جنہاں تے مائل[۱۰] ہے چڑھ سیجے سوون
جس گھر کو نت نہ بولیا سوئی خالی ڈیرا، مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا
بُلھا شوہ دے واسطے دِل بھڑکن بھاہیں. اوکھا پینڈا پریم دا دِل گھڈا تاہیں

دِل وِچ دَھکّے[۱۱] جھیڑدے سر دھائیں میرا
مَیں اُڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

(نور علی وُستکی: قانونِ عشق صفحہ ۱۲۷ کافی ۱۶)

---

[۳] پُل صراط: مسلمانوں کے عقیدے میں دوزخ کے اوپر کا وہ پُل جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے. خدا کی بندگی کرنے والے نیک لوگ بآسانی اس کے اوپر سے گزر کر روحانی طبقات میں چلے جاتے ہیں. اور بُرے آدمی کٹ کر دوزخ میں گر پڑتے ہیں. بُلھے شاہ سمجھاتے ہیں کہ رب کے سچے عاشقوں کی پہلی روحانی منزل پُلِ صراط کو پار کرنے کے برابر ہے.

[۴] میرا حج میرے مُرشد کا دیدار ہے [۵] بُلھے شاہ اپنے مُرشد سے مدد کے لئے التجا کرتا ہے.

[۶] جو پردہ تم نے تانا ہوا ہے، اُس کے علاوہ مجھے تُم سے دُور رکھنے والی کوئی چیز نہیں.

[۷] مَیں نئی نویلی دلہن زیور اور پوشاک پہن کر تیار بیٹھی تھی، لیکن میرا محبوب مجھے دھوکا دے گیا.

[۹] سُولاں: کانٹے، مُراد دُنیا کے دُکھ [۱۰] مائل: جُھکا ہوا، متوجہ، مہربان.

[۱۱] دھکّے جھیڑدے: وہ دھکّے یا صدمے جو محبوب سے کسی بات پر جھگڑا ہو جانے پر لگتے ہیں

مَیں چوڑ ہیڑی آں سَچّے صَاحب دی سرکاروں

اِس کافی میں خاکروبہ(مہترانی) کا اِستعارہ بڑی خُوبی سے استعمال کیا گیا ہے۔ خاکروبہ سے مُراد وُہ رُوح ہے جو اپنے آپ کو حواس اَور نفسانی خواہشات سے پاک کرتی ہے۔ بُلھے شاہ اپنے آپ کو خُدا کی خاکروبہ کہتاہے، کیونکہ وُہ خواہشاتِ نفسانی کی غلاظت کو مُرشد کے تصور اَور روحانی شغل سے صاف کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے لئے چھاج اَور جھاڑو کا کام کرتے ہیں۔ اس کی یہ خدمت جبری نہیں، بلکہ اپنی مرضی اَور خوشی سے ہے۔ اس کو یہ ڈر رہتا ہے اُس کا مالک اُسے اِس خدمت سے فارغ نہ کردے (دنیں رات مَیں ایہو منگدی، دُور نہ کر درباروں)۔

مَیں[1] چوڑ ہیڑی آں سَچّے صاحب دی سرکاروں

دھیاں[2] کی چھجلی گیان کا جھاڑو۔ کام کرود ھنت جھاڑوں
مَیں چوڑ ہیڑی آں سَچّے صاحب دی سرکاروں
قاضی[3] جانے حاکم جانے فارغ[4] خطی بے گاروں
دِنیں رات مَیں ایہو منگدی، دُور نہ کر درباروں
مُنڈھ[5] باجھوں میرا ہور نہ کوئی، کِیں وَل کروں پُکاروں
بُلھا[6] شوہ عنایت کرکے بُخرا[7] مِلے دیداروں

(نقیر محمد، کلیات، کافی ۱۳۰)

---

[1] عاجزی میں اپنے آپ کو مہترانی کہہ رہے ہیں۔ [2] اِس مہترانی کے پاس گیان (علمِ الٰہی) کا جھاڑو اَور دھیان (تصور) کا چھاج ہے۔ وُہ خواہشاتِ نفسانی کا کوڑا اکٹھا کرکے باہر پھینک رہی ہے۔

[3] قاضی، یہاں مَن سے مُراد ہے۔ حاکم: شیطان کو کہا گیا ہے [4] فارغ خطی بیگاروں = بے گار سے آزاد ہوگئی ہُوں۔ [5] تمہارے سوا میرا کوئی اپنا نہیں۔ مَیں کِس کے آگے مدد کے لئے فریاد کروں؟ [7] بُخرہ = حصّہ، خیرات۔ عنایت شاہ کی پناہ میں آنے کی وجہ سے مجھے تیرے دیدار کی خیرات مِلے۔

مَیں پُچھّاں شَوہ دِیاں واٹاں نی

انسانی زندگی ایک ایسا سنہری موقع ہے جو خدا نے انسان کو اپنے وصال کیلئے عطا کیا ہے ہے۔ لیکن انسان اپنی جہالت میں اِس موقع کو حِسّی خواہشات کی لذّت میں کھو دیتا ہے۔ یہ نظم ایک تنبیہہ کی صُورت میں آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتی ہے۔ شاعر انسان کو زندگی کا اصل مقصد حاصل کرنیکی ترغیب دیتا ہے (جب بے نہ ہو بھولی بھالی...... بھولی نہ ہو ہوسیانی.......
....اس دُنیا دی چھوڑ کہانی ایہہ یار ملن دیاں گھاتاں) -

آخری بند میں بُلّھے شاہ خدا کو اُن تمام مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جن سے دُنیا مُصیبت میں مُبتلا ہے۔ اگر وُہ دُنیا پیدا ہی نہ کرتا تو یہ مسئلے بھی پیدا نہ ہوتے :-

مَیں پُچھّاں شَوہ دِیاں واٹاں[1] نی
کوئی کرے اساں نال باتاں نی
بُھلّے رہے نام نہ جَپیا
غفلت اَندر یار ہے چَھپیا
اوہ سِدھ پڑھا[2] تیرے اندر وسیا
لگیاں نفس دیاں چاٹاں نی
جَپ[3] بے نہ ہو بھولی بھالی
مَت توں سَدئیں مُکھ مکالی
الٹی پریم نگر دی چال رای
بھڑکن عشق دِیاں لاٹاں نی

---

[1] واٹاں = راہیں ۔ [2] سِدھ پڑھا = ہستئ کامل، رَبّ ۔
لگیاں نفس دیاں چاٹاں = نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا شوق ۔
[3] غفلت چھوڑ کر کلمہ کا وِرد کر ۔ مُکھ مکالی = کالے مُنہ والی ۔

بھولی نہ ہو ہو سیانی
عشق نُور دا بھر لے پانی
اِس دُنیا دی چھوڑ کہانی[1]
ایہہ یار مِلن دیاں گھاتاں نی

بُلھا رب بنا بیٹھوں آپے
تد دنیا دے پئے سیاپے
دُوتی[2] ویہڑا[3] دشمن ماپے
سب کڑک پئیاں آفاتاں نی
میں پچھاں شوہ دِیاں واٹاں نی
کوئی کرے اساں نال باتاں نی

(فقیر محمد: کُلیات. کافی ۱۳۳)

---

[1] دُنیا کے فضول دھندے چھوڑ دے۔ محبوب سے وصال کرنے کا یہ نادر موقع ہے۔

[۲-۳] دُوتی = مخالف

ویہڑے = دُنیا کے لوگ۔

آفات:۔ آفتیں، مصیبتیں تم خودی میں پھنس گئی ہو۔ اِس لئے تم نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر ہو۔

کڑک پئیاں = ٹوٹ پڑیں۔

مَیں گل اوتھے دی کردا ہاں

یہ کافی اُس وقت کا ذکر کرتی ہے جب خُدا کی ہستی کے سوا اَور کچھ نہ تھا۔ دُنیا ابھی ظہور میں نہیں آئی تھی۔ تخلیق کے وقت خدا نے رُوحوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وُہ اُن کی نجات کے لئے دُنیا میں آئے گا۔ اَب ایسا لگتا ہے کہ وُہ اپنا وعدہ بھول گیا ہے، کیونکہ اپنے اَور رُوح کے درمیان اُس نے ایک پردہ حائل کر دیا ہے، حالانکہ وُہ ہر ایک میں موجود ہے۔ اس لیے وُہ خود لوگوں کو دھوکے اَور بھرم میں ڈالنے کا ذمّہ دار ہے۔ لوگ اُسے باہر مندروں، مسجدوں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ مگر اپنے اَندر اس کی تلاش نہیں کرتے۔

دُوسرے بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ انسان کی خدا کے لئے تلاش ایک نابرابر جنگ کی طرح ہے۔

(نال حاکم دے کھیل اساڈی، جے مَیں میری تاں بجی پھاڈی)

اگلے بند میں اُس مایوسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو خُدا کی تلاش میں ناکام کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی بھر شرعی رسم و رواج میں غلطاں رہنے کو بُلھے شاہ نے اپنی تمام پُونجی چوری میں کھو بیٹھنے کے رواج اَور اس کے بعد پہرہ رکھنا کہا ہے۔ اِس غلطی کا مَوت کے وقت احساس بے کار ہے۔ بُلھے شاہ کہتا ہے کہ اِس غلطی کا افسوس کرنا بھی شاید فضول ہے، کیونکہ یہ پُرانے اعمال کا نتیجہ ہے

(مَیں اگلا لکھیا بھردا ہاں)

پانچویں بند میں بُلھے شاہ اِس دُکھ بھری دُنیا میں آنے کا افسوس کرتا ہے (کیہہ سُکھ پایا مَیں آن ایتھے۔ نہ منزل نہ ڈیرے جتھے) انسان کو یہ پتہ نہیں کہ وُہ اچانک اس دُنیا سے کب کُوچ کر جائے گا۔ (گھنڈ کُوچ سناواں کیتے نت اُوٹھ کچاوے کڑدا ہاں)

آخری بند میں بُلھے شاہ اِس دُنیا کی مثال ایک بھیانک سمندر سے دیتا ہے، جس کی گہرائی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ (بُلھے شاہ بے انت ڈونگھائی۔ دوجگ بیچ نہ لگدی کائی) اِس سمندر میں انسان بلامقصد ہاتھ پاؤں مار رہا ہے (مَیں بے سر پیریں تردا ہاں)

مَیں گل اوتھے دی کردا ہاں، پر گل کردا بھی ڈردا ہاں

۱؎ آپ کہتے ہیں کہ مَیں جھجکتے ہوئے کائنات سے پہلے کی حالت کا ایک بھید کھولنا چاہتا ہوں۔

نال[1] رُوحاں دے لارا لایا، تُسیں چلو مَیں نالے آیا
ایتھے پردہ چا بنایا۔ مَیں بھرم بھلایا پھِردا ہاں

نال[2] حاکم دے کھیں اساڈی۔ جے مَیں میری تاں بھی پھاڈی
دھری دھرائی پُونجی تہاڈی، مَیں اگلا لیکھا بھردا ہاں

دِتّے[3] پُونجی مُورکھ جھنجلایا، مگر چوراں دے پیرا لایا
چوراں[4] دی میں پیڑ لیایا، ہر شب دھاڑے دھڑداہاں

نہ[5] نال میرے اوہ رجدا اے، نہ مِنّت کیتی سجدا اے
جاں مُڑ مِیٹھاں تاں بھجدا اے، مُڑ منت زاری کردا ہاں

---

[1] رَبّ نے کائنات کی پیدائش کے وقت رُوحوں کو یہ کہہ کر دُنیا میں بھیجا تھا، کہ وُہ رُوحوں کو واپس مقامِ حق میں نے کے لئے دُنیا میں خود انسانی جامہ پہن کر آئے گا۔ رَبّ یہاں انسانی جسم میں رونما ہوتا ہے، جس کی وجہ سے رُوحیں اسے پہچان نہیں پاتیں، اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

[2] آپ کہتے ہیں کہ رَبّ کی تلاش میں میرا زور آور (حاکم) سے مقابلہ ہے۔ میں اگر مِیری ہو جاؤں (جیت جاؤں) تو بھی پھاڈی (ہارا ہُوا) مانا جاتا ہُوں۔ رَبّ کی طرف سے دی ہُوئی پُونجی میرے پاس بیکار پڑی ہے۔ اور مَیں کئے ہُوئے اعمال کا حساب دے رہا ہُوں۔ [3] پہلے مَیں پُونجی چوروں (نفسانی خواہشات) کو دے دیتا ہُوں، پھر بے وقُوفوں کی طرح پچھتاتا ہُوں اور چوروں کے پاؤں کے نشان ڈھونڈتا ہُوں یعنی چوروں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہُوں۔ [4] دھاڑے دھڑنا = چوروں کے حملہ کو روکنا۔ مَیں نے چوروں کے پاؤں کے نشان ڈھونڈ لئے ہیں۔ اور ہر رات اُن کے حملے کو روکتا ہُوں۔ [5] وُہ نہ تو مجھ سے خوش ہوتا ہے اور نہ ہی میری مِنّت کو مانتا ہے۔ اس کی طرف مُنہ کروں تو مجھ سے دُور بھاگتا ہے۔ پھر مَیں اسی کے آگے منت سماجت کرنے پر مجبُور رہتا ہُوں۔

کیہہ سُکھ پایا مَیں آن ایتھے، نہ منزل نہ ڈیرے جتھے
گھنڈ[1] کُوچ سُناواں کِتھے۔ نت اُوٹھ کجاوے کڑداہاں

بُلھے[2] شاہ نَیے انت ڈُونگھائی، دو جگ نیچ نہ لگدی کائی
اُرار پار دی خبر نہ کائی۔ مَیں بے سر پَیریں تردا ہاں

(فقیر محمد کُلیات، کافی ۱۳۲)

لے مَیں دُنیا سے کُوچ کرنے کا گھنٹہ کہاں بجاؤں؟ مَیں ہر روز اُونٹ کے کجاوے کی طرح کسا رہتا ہُوں۔ ٹے دُنیا کے سمندر کی گہرائی لا محدود ہے، اِس کے نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے کنارے کا پتہ لگتا ہے۔ اِس گہرائی میں میرے پیر نہیں لگتے اور مَیں اِس میں بُری طرح غوطے کھاتا ہُوا بہتا جا رہا ہُوں۔

مینوں چھڈ گئے آپ لدّ گئے

بُلھے شاہ نے اِس کافی میں سسّی پنّوں کی مشہور روایتی کہانی تمثیل کے طور پر استعمال کی ہے۔ سسّی پنّوں کا ملاپ ہو گیا تھا۔ لیکن پنّوں کے رشتہ دار اِس ملاپ کے خلاف تھے۔ دھوکہ سے اُنھوں نے پنّوں کو شراب پلا کر بے ہوش کر دیا۔ اَور سِندھ کے ریگستان کو پار کر کے اُسے بلوچستان میں لے گئے۔ جب سسّی نے اُسے اپنے گھر سے گم پایا تو اُس کی تلاش کرتے ہُوئے ریگستان میں اُس نے شدید غم کی حالت میں جان دے دی۔

اِس کافی میں بُلھے شاہ کا اشارہ اپنے مُرشِد سے جُدائی کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کا برداشت کرنا اُس کے لئے سخت مشکل ہو گیا تھا۔ آخری بند میں وُہ امید ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے فراق کے دِن ختم ہو جائیں گے۔ اَور اُس کا اپنے مُرشِد سے ملاپ ہو جائے گا۔

مینوں چھڈ گئے آپ لد گئے۔[1] مَیں وِچ کیہہ تقصیر
راتیں نیند نہ دِن سُکھ سُتّی،[2] اکھیں پلٹیا نیر
چھُریاں تے تلواراں کولوں۔ عِشق دے تِکھّے تیر[3]
عِشقے جیڈ نہ ظالم کوئی۔[4] ایہہ زحمت بے پیر
اِک پَل ساعت آرام نہ آوے، بُری برہوں دی پِیڑ
بُلھا شوہ جے کرے عنایت،[5] دُکھ ہوون تغیّر
مینوں چھڈ گئے آپ لد گئے، مَیں وِچ کیہہ تقصیر

(نذیر محمد: کلیات، کافی ۱۲۰)

---

[1] مجھے چھوڑ کر آپ چلے گئے، مجھ سے کیا بھُول ہو گئی؟ [2] آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔
[3] عشق کے تیر تلواروں اَور چھُریوں سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ [4] عشق جیسا کوئی ظالم نہیں، عشق کے دُکھوں اَور مُصیبتوں کا کوئی علاج نہیں۔ [5] اگر محبوب کی عنایت ہو جائے تو سارے دُکھ سُکھ میں بدل جائیں گے۔

مَینُوں دَرد اولّڑے دی پیڑ

یہ چھوٹی سی نظم عشق کے شدید درد سے متعلقہ ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے ہجر میں بے چین ہے۔ ہیر اور رانجھا کی علامت کے ذریعے بلھے شاہ طالب کی اپنے مُرشد کے ہجر میں دُکھ کی شدّت بیان کرتا ہے۔ وُہ اپنے مُرشد سے ملتجی ہے کہ وُہ اس کے قصور معاف کرتے ہُوئے ہجر کے درد کو ختم کرے (آمیاں رانجھا دے وے نظارا مُعاف کریں تقصیر) مُرشد اپنے طالب کے دُکھ سے بے خبر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تحفہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ (تخت ہزاروں رانجھا ٹُریا ہیر نمانی دا پیر) آخری دو شعر عاشق کی طرف سے شکایت کی صورت میں ہیں۔ (ہوزناں دے نوشوہ آوے جاوے کیہہ بُلھے وِچ تقصیر)

مَینُوں درد[1] اولّڑے دی پیڑ

آ میاں رانجھا دے وے نظارا مُعاف کریں تقصیر

تخت ہزاریوں[2] رانجھا ٹُریا ہیر نمانی دا پیر

ہوزناں دے نوشوہ آوے جاوے کیہہ بُلھے وِچ تقصیر

مَینُوں دَرد اولّڑے دی پیڑ

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۲۱)

---

[1] انوکھے درد کی ٹیس۔

[2] تخت ہزارے سے مُراد مقامِ حق سے ہے، اِس شعر کا مفہُوم یہ ہے کہ مقامِ حق سے خدا مُرشد کی صُورت میں رُوح کی نجات کے لئے آیا ہے۔

مینوں عشق ہُلارے دیندا

یہ کافی خُدا کے ساتھ وصال سے پیدا ہُوئی خُوشی کی حالت کو بیان کرتی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کافی بُلھے شاہ کی دُوسری بہت سی کافیوں سے مُختلف ہے، جن میں اُس نے خُدا کا اپنے عاشقوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرنے کا شِکوہ کیا ہے۔

سب انسانوں کی اصلیت ایک ہے۔ سبھی ایک ہی سمندر کے قطرے ہیں۔ اِن میں تمام تفرقات، جیسے ذات پات، شیعہ اور سُنی، لمبے بالوں والے جوگیوں اور سر مُونڈے مُنیوں کے، محض سطحی ہیں۔ خُدا شاہ رگ سے نزدیک ہے۔ اُس کو پانے کے لئے انسان کو اپنی رُوح اس نقطہ پر اکٹھی کرنی پڑتی ہے (نحن اقرب دے وِچ گھات میری)

آخری بند میں بُلھے شاہ اُس وجدانہ مُسرت کا بیان کرتا ہے، جب وُہ خُدا کے دیدار کا جلال دیکھ کر مستی کی حالت میں آجاتا ہے۔ انسانوں کی طرح خُدا بھی اپنے عاشقوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھُولتا۔

مینوں عِشق ہُلارے دیندا اے، مُنہ چڑھیا یار بُلیندا
کیہہ بُجھدا ہیں ذات[1] صفات[2] میری، اوہو آدم والی ذات میری
نحنُ[3] اقرب دے وِچ گھات میری، وِچ رَب دا ستر جھلیندا
کِتے شیعہ اے کِتے سُنی اے، کِتے جٹا دھاری کِتے مُنی اے
میری[4] سب سے فارغ کُنی اے، جو کہاں سو یار منیندا
بُلھا دُوروں چل کے آیا جی، اوہدی صُورت نے بھرمایا جی
آدے[5] پاک جمال وکھایا جی، اوہ یک دم نہ بھلیندا
مینوں عشق ہُلارے دیندا، مُنہ چڑھیا یار بلیندا

(فقیر محمد، کلیات، کافی ۱۲۲)

---

۱ اصلیت۔ ۲ صفت کی جمع ۳ رَب شاہ رگ سے نزدیک ہے۔ اِس لئے مَیں اسے وہاں سے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ۴ میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ۵ پاک صُورت۔

میّنوں کیہہ ہویا ہُن میتھوں گئی گواتی مَیں

یہ خوبصورت نظم اُس عاشق کی حالت کی ترجمانی کرتی ہے، جو اپنے محبوب میں مکمل طور پر کھو گیا ہے۔ عاشق اپنی ہستی محبوب کی ہستی میں کچھ اِس درجہ تک گُم کر دیتا ہے کہ اُس کی حرکات دُنیا کے لوگوں کی نظر میں دیوانوں کی سی ہوتی ہیں جب محبوب کا اپنے اندر دیدار ہو جاتا ہے تو وُہ اُسے ہر جگہ حاضر و ناظر معلوم پڑتا ہے۔ (سِر توں پیر تیکر بھی تُوں ہیں اَندر باہر ہَیں تیں)
یہ کیفیت انسان کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیتی ہے (چھُٹ پئی ارار وں پاروں نہ ٹیری نہ میں)
جس نے خدا کو پالیا ہے، اُس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وُہ خدا کی زبان سے نکلتا ہے۔ (منصور پیارے کیہا انا الحق کہو کہایا کیں)۔ خُدا خود اس کا عاشق بن جاتا ہے جو اپنے آپکو اس میں گُم کر دیتا ہے۔

میّنوں[1] کیہہ ہویا ہُن میتھوں گئی گواتی میں
میّنوں کیہہ ہویا کیوں مینُوں کملی کہندی ہیں
میں وِچ دیکھاں تاں میں نہیں مُندی میں وِچ وسّائیں میں[2]
سر توں پیر تیکر بھی تُوں ہیں اندر باہر ہَیں تیں
چھُٹ پئی اُراروں پاروں نہ بیڑی نہ میں
منصور پیارے کیہا انا الحق کہو کہایا کیں[3]
بُلھا شوہ اوسے دا عاشق اپنا آپ وجنایا جیں[4]
مینوں کیہہ ہویا ہُن میتھوں گئی گواتی میں
(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۲۴)

---

[1] مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی ہستی کا ہوش نہیں رہا۔ انتہائی عشق میں از خود رفتہ کی حالت بیان کی گئی ہے۔ [2] میں عشق کے رنگ میں ایسی رنگی ہوں کہ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ [3] "میں خدا ہوں" کہلوانے والے تم خود ہی تھے۔ [4] خدا اُسی کا عاشق ہے جس نے اپنی خودی کا خاتمہ کر دیا۔

مَیں بے قید

یہ چھوٹی سی نظم ایک ایسے عاشق یا عارف کی حالت بیان کرتی ہے، جو سب دُنیادی پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ اُس کے گلے میں کوئی زنجیر اور پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں ہے۔ اس کو نہ ہم مومنوں میں اور نہ ہی کافروں میں شمار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی بابت سوال خُدا کی ہستی میں یقین رکھنے میں نہیں، بلکہ خُدا کا مشاہدہ کرنے میں ہے۔ اسے نہ مالک اور نہ ہی خادم کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وُہ نہ کسی پر حکم چلاتا ہے اور نہ ہی کسی کے حکم کے تابع ہے۔ اُس پر تعریف یا الزام کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے اعمال میں اخلاقی فضیلت کی ایک جھلک نظر آتی ہے، جو اُس کی بے غرض اور عالمگیر محبت سے پیدا ہوتی ہے۔

اِس نظم کا رمزیہ مفہوم یہ ہے کہ انسان کی اصل حالت ایک آزاد رُوح کی سی ہے، جس پر کوئی پابندی جیسے کہ جسم، نفس اور حواس کی، عائد نہیں ہوتی۔ رُوح اپنی ابتدائی صُورت میں لافانی اور تمام تبدیلیوں سے مُبترا ہے۔

کافی کا آخری مِصرع بُلھے شاہ کی لافانی ہستی سے متعلق ہے۔

مَیں بے قید[1] آں، مَیں بے قید، نہ روگی نہ وَید
نہ مَیں مومن نہ میں کافر، نہ سَید نہ سَید
چودھیں طبقیں سَیر اساڈا، کِتے نہ ہوئیے قید
خرابات[2] میں جال[3] اساڈی، نہ شوبھا[4] نہ عَیب[5]
بُلھے شاہ دی ذات کی پُچھنَیں، نہ پیدا نہ پید

(نذیر احمد: کلام بُلھے شاہ: صفحہ ۷۶)

---

[1] بے قید = آزاد۔ [2] خرابات = میخانہ، رُوحانی سرُور۔ [3] جال = گزر [4] اچھائی [5] بُرائی۔

مَیں کُسنبھڑا چُن چُن ہاری

یہاں کسنبھڑے کے پھول کا استعارہ دُنیاوی دَولت، اُس کے عیش و آرام اور عزیز و اقارب سے لگاؤ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کسنبھڑے کے پھول دیکھنے میں خوبصورت ہیں، لیکن اُن میں نہ خوشبو ہے اور نہ ہی کوئی اور خوبی۔ شیخ فرید کہتے ہیں کہ اِن پھولوں کو چھونے سے جلن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد جو کانٹے ہیں، اُن کو بُلھے شاہ نے بھلے (بھلیرے) کہا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا رشتہ داروں اور دوستوں سے لگاؤ ہمیں بے شک بھلا معلوم ہوتا ہے، لیکن وُہ اپنے اندر دُکھوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ اِن دُنیاوی رشتوں کی نشو و نما کے لئے ہمیں سخت تردد کرنا پڑتا ہے جو موت کے وقت بیکار ہو جاتے ہیں۔ عزیز و اقارب میں سے مرنے والے کے ساتھ اگلی دُنیا میں کوئی نہیں جاتا۔ اِس زندگی کے دَوران بھی وُہ اکثر لڑائی جھگڑے اور بیماری کی صُورت میں وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ دُنیاوی اشیاء ہمارے نفس اور حواس کو اشتعال دیتی ہیں۔ اور ہم اُن کے غلام بن جاتے ہیں۔ چُونکہ وُہ ہم سے عیب اور گُناہ کرواتی ہیں، ہمیں شیطان اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں بوقتِ موت ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔

عاجزانہ انداز میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ دُوسرے لوگ تو کچھ ایک دُنیاوی خواہشات پر ہی اکتفا کرتے رہے ہیں، لیکن وُہ تمام خواہشات کا شکار ہو گیا۔ (موہناں چُگیا بھو بیا بھو بیا میں بھر لئی پٹاری) آخری بند میں کافی کا رنگ بدلتا ہے، اور بُلھے شاہ خوشی کا اظہار کرتا ہوا اپنے مُرشدِ عنایت شاہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوا کہتا ہے کہ باوجود اسکے بے شمار گناہوں کے اُس کے مُرشد نے اُسے بچا لیا، اور خدا سے وصال کے قابل بنا دیا۔

مَیں کُسنبھڑا چُن چُن ہاری

ایس کُسنبھے[۲] دے کنڈے بھلیرے اَڑ اَڑ چُنڑی پاڑی

[۱-۲] کسنبھڑے کے پھول جس قدر چمکیلے ہیں اتنے ہی پُرکشش ہیں۔ اس کے خوبصورت پھولوں کے سبب اس کے کانٹے بھی اچھے لگتے ہیں، جن کا ڈنک زہریلا ہے۔ نادان انسان کسنبھڑے کا انبار جمع کرتا ہے جبکہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ایس گھنبھے دا حاکم کرڑا ظالم اے پٹواری
ایس گھنبے دے چار مقدم معاملہ منگدے بھاری
ہونا جگیا پھوہیا پھوہیا میں بھر لئی پٹاری
جگت جگ کے میں ڈھیری کیتا لیتھے آن بہپاری
اَدھی گھاٹی مشکل پینڈا اسِر پر گٹھڑی بھاری
عملاں والیاں سب لنگھ گئیاں رہ گئی اَوگن ہاری
ساری عمرا کھیڈ گوائی اوڑک بازی ہاری
الست کیہا عدا کھتیاں لائیاں ہُن کیوں یار وساری
اِکو گھر وچ وسدیاں رسدیاں ہُن کیوں رہی نیاری
ہم کمینی پنجی کو ہجی بے گن کون وچاری
بلھا شوہ کے لائق ناہیں شاہ عنایت تاری
میں گھنبھڑا چُن چُن ہاری

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۲۶)

لقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۱۹ سے آگے :- اُسے معلوم ہونا چاہیئے، کہ بوقتِ موت کوئی بھی شئے اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اشارہ دُنیا دولت اور اشیاء اکٹھی کرنیکی طرف ہے۔ حاکم یہاں شیطان کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ پٹواری شیطان کے نائب دھرم راج کی طرف اشارہ ہے۔ ۳؎ چار مقدم = نفس۔ ادراک، حافظہ اور خودی۔

۴؎ پھوہیا پھوہیا = تھوڑا تھوڑا۔ اوروں نے کچھ گناہ کیئے لیکن میں نے گناہوں سے ٹوکری بھر لی۔

۵؎ بپاری = عزرائیل کے فرشتے، جب اِن فرشتوں نے حساب مانگا، تو اعمال کا بوجھ سر پر نکلا۔ ۶؎ جنہوں نے عبادت کا سرمایہ اکٹھا کیا، وُہ پار ہو گئے۔ جنہوں نے تمام عمر گنوادی، وُہ بازی ہار گئے۔

۷؎ رَبّ سے پُوچھتے ہیں۔ کہ تم نے کائنات کی پیدائش کے وقت وعدہ کیا تھا، کہ میں تمہیں واپس لے جانے کے لئے آؤں گا، اَب مجھے بھول کیوں گئے ہو؟

مَیں کیونکر جاواں کعبے نُوں

اہلِ اسلام کے لئے سب سے مُتبرک زیارت گاہ کعبہ ہے۔ ہر ایک مُسلم فرد کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وُہ زندگی میں کم از کم ایک بار کعبہ کی زیارت ضرور کرے۔ بُلھے شاہ ہیر اور رانجھا کا استعارہ استعمال کرتا ہُوا کہتا ہے کہ اس کا کعبہ اُس کا مُرشد ہے، اور اُس کی سب سے بڑی زیارت اس کا دیدار کرنا ہے۔ لوگ کعبہ کے سامنے جُھکتے ہیں لیکن وُہ اپنے مُرشد کے آگے سجدہ کرتا ہے۔ وُہ مُرشد کی منت کرتا ہے کہ اُس کے گُناہوں کو نظر انداز کرے، کیونکہ روزِ اوّل خدا کی صُورت میں اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وُہ سب گناہگاروں کو بخش دے گا۔ آخری بند میں وُہ امید ظاہر کرتا ہے کہ وُہ اپنی رحمت کے طفیل اس کو بچا لے گا۔

مَیں[1] کیونکر جاواں کعبے نُوں
دِل لوچے تخت ہزارے نُوں

لوکیں[2] سجدہ کعبے نُوں کردے۔ ساڈا سجدہ یار پیارے نُوں
اَوگن وبجھ نہ بُھل میاں رانجھا، یاد کریں ایس کارے نُوں
مَیں[3] مَن تارُو ترن نہ جاناں، شرم پئی تدھ تارے نُوں
تیرا ثانی کوئی نہیں مِلیا، ڈھونڈ لیا جگ سارے نُوں
بُلھا شوہ دی پیت انوکھی، تارے اوگن ہارے نُوں
مَیں کیونکر جاواں کعبے نُوں
دِل لوچے تخت ہزارے نُوں

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۲۵)

۱-۲ تخت ہزارہ = رانجھا کا آبائی گاؤں۔ رُوح (ہیر) کہتی ہے کہ وُہ ظاہری عبادت گاہوں پر جانے کی بجائے اپنے اندر محبُوب کے پاس جانے اور اس کے آگے سجدہ کرنے کے لئے بے چین ہے۔

۳ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ اگر مَیں بحرِ دُنیا میں ڈُوب گئی تو تمہارے لئے شرم کی بات ہوگی۔

میں وِچ میں نہ رہ گئی رائی

یہ ایک اور کافی ہے، جس میں بُلّھے شاہ نے ایک ایسے شخص کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے، جو عشق میں مُبتلا ہے۔ ایسا انسان اپنی ہستی کا احساس بالکل کھو دیتا ہے۔ محبُوب میں جذب ہونے کا مشاہدہ بیان کرنا اتنا ہی مُشکل ہے جتنا کہ ایک گُونگے کے لئے گُڑ کی مٹھاس بتانا۔

عاشق کو ہر دم یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ اُس کا محبُوب اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ اپنے محبُوب کی طرف لگی رہتی ہیں۔

اگرچہ عشق مُشکلات اور اذیتوں سے پُر ہے، پھر بھی عاشق اُسے ترک کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اس کے برعکس عشق اُس میں ایک دلیری بھر دیتا ہے۔ اور اُسے لوگوں کی نکتہ چینی کا کوئی ڈر نہیں رہتا۔ خدا سے مخاطب ہوتے ہُوئے بُلّھے شاہ اُس سے رحم کی التجا کرتا ہے۔ وُہ خدا کے عشق میں سرشار ہے، چاہے خدا کسی بھیس میں آئے۔

ایک بند میں بُلّھے شاہ اُن کوششوں کا ذکر کرتا ہے، جو اُس نے محبُوب تک پہنچنے کے لئے کی ہیں۔ وُہ اپنی رُوح کو نَو دروازوں سے کھینچ کر دسویں دروازے تک اس کے دیدار کے لئے لے جاتا ہے (نُند کارن مَیں ایسا ہویا، نوں دروازے بند کر سویا۔ دَر دسویں نے آن کھلویا۔ کدے مَن میری آشنائی)

بَیں وِچ میں نہ رہ گئی رائی[1]
جب کی پیا سنگ پریت لگائی
جَد[2] وصل وصال بنائے گا، تد گُنگے دا گُڑ کھائے گا
سِر[3] پَیر نہ اپنا پائے گا، مَیں ایہہ ہور نہ کسے بنائی

---

[1] محبُوب کی محبت نے خودی کا خاتمہ کر دیا۔ [3-2] محبُوب کے ساتھ ملاپ کی حالت کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس حالت میں اپنی ہی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔

ہوئے[1] نیّن نیناں دے بردے، درشن سے کوہاں تے کردے
بِل[2] پل دوڑن مارے ڈردے، تیں کوئی لالچ گھت بھرمائی

ہُن[3] اساں وحدت وِچ گھر پایا، واسا حیرت دے سنگ آیا
جِیون[4] جمن مرن ونجایا، اپنی سُدھ بُدھ رہی نہ کائی

بیں[5] جاناں سی عِشق سکھالا، چوہنہ ندیاں دا وہن اُجالا
کدی تے اگ بھڑکے کدی پالا، نِت برہوں اگ لگائی

ڈُوں ڈُوں عِشق نقارے وجدے، عاشق ویکھ اُتے وَل بھجدے
ترٹ[6] ترٹ ترڑک گئے لڑ لجدے۔ لگ گیا نیہوں تاں شرم سدھائی

پیارے لِس کر بہتی ہوئی، تیرا عشق میری دِلجوئی
تیں بِن میرا تکا نہ کوئی، آماں بابل بھین نہ بھائی

کدی جا اسمانی بہندے ہو، کدی اس جگ دا دکھ سہندے ہو
کدی[7] پیرِ مُغاں بن بہندے ہو، میں تاں اکسے ناچ نچائی

---

[1] بردے = غلام۔ [2] مارے ڈردے، کی جگہ " درس مُول نہ ڈردے" بھی مِلتا ہے۔ گھت دے کر
[3] وحدت = توحید، یکتائی، ایک ہونا، لیعنی رب سے ملاپ ہوگیا۔ [4] آواگون (تناسخ) کا خاتمہ ہوگیا۔
[5] عشق چار دریاؤں کے بہاؤ سے بھی تیز ہے۔ [6] عشق نے لوک لاج کا پردہ چاک کر دیا۔ جب عِشق آیا تو شرم چلی گئی۔ [7] پیرِ مُغاں = مُرشِد۔

تیرے ہجرے[1] وِچ میرا حُجرا اے، دُکھ ڈاہڈا مَیں پر گزرا اے
کدے[2] ہو مائل میرا مجرا اے، مَیں تیتھوں گھول گھمائی

تُد کارن مَیں ایسا ہو یا۔ توں دروازے بند کر سویا
در دسویں تے آن کھلو یا۔ کدے من میری آشنائی[3]

بُلھا شوہ میں تیرے وارے ہاں، مُکھ ویکھن دے ونجارے[4] ہاں
کُجھ اسیں بھی تینوں پیارے ہاں، کہ مَیں اینویں گھول گھمائی

مَیں وِچ میں نہ رہ گئی کائی
جب کی پیا سنگ پریت لگائی

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۳۴)

---

[1] ہجر: جُدائی ۔ حُجرہ: چھوٹا سا کمرہ، وُہ خلوت خانہ جس میں بیٹھ کر عام طور پر عبادت کی جاتی ہے۔
میرا ٹھکانہ تیرے ہجر میں ہے یعنی تیرے ہجر میں میری قیام گاہ ہے۔

[2] مائل: متوجہ ۔ مجرا: ناچ یعنی التجا ۔

[3] آشنائی: عشق، دوستی

[4] ونجارے: سوداگر۔

نت پڑھنائیں استغفار کیسی توبہ ہے اویار

انسان کے قول وفعل میں کوئی مطابقت نہیں۔ یہ خصوصاً اُس کے اخلاقی اور رُوحانی پہلوؤں میں دیکھنے میں آئی ہے۔ (مُونہوں توبہ دِلوں نہ کردے --- کیسی توبہ ہے اویار؟)

اَپنی کاروباری زندگی میں ہر انسان محض پیسہ ہی کمانا چاہتا ہے، چاہے اُسے کتنی ہی بے ایمانی کرنی پڑے۔ (سانوں دے کے لیئں سوائی) کوئی مذہب اِس بات کی اجازت نہیں دیتا، لیکن طرّہ یہ ہے کہ مذہب ہی کے نام پر یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ (ایہہ مُسلمانی کِتھوں آئی۔ ایہہ تیرے کردار) یہ ہر روز مذہبی کتابیں سر پر رکھ کر جھُوٹی قسمیں کھاتا ہے (کُوڑ کتاباں سِرتے چائیں ایہہ تیرا اعتبار)

اخلاقی زندگی کے شعبہ میں اِنسان کئی قسم کے بُرے اعمال کرتا ہے اور دوسروں کی حق تلفی بھی کرتا ہے (جیتھے نہ جانا اوتھے جائیں۔ مال پرایا مُنہ دھر کھائیں) وُہ دُوسروں پر ظلم ڈھاتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ اِس کا حساب آخرت میں دینا پڑے گا۔

آخری بند میں بُلھے شاہ اَعلان کرتا ہے کہ اِن تمام خطروں سے بچنے کا طریقہ مُرشد کو ڈھُونڈنا اور اُس کی ہدایت کے مطابق چلنا ہے۔ اُسے یہ پکا یقین ہے کہ وُہ خُود اپنے مُرشد عنایت شاہ کی رحمت سے اِس بحرِ فانی سے پار ہو جائے گا۔

نت پڑھنائیں استغفار
کیسی توبہ ہے او یار؟
سانوں دے کے لیئں سوائی
وِدھیاں دی توں بازی لائی
ایہہ مُسلمانی کِتھوں آئی
ایہہ تیرے کردار

جتھے نہ جانا اوتھے جائیں
مال پرایا مُنہ دھر کھائیں
کُوڑ کتاباں سرتے چائیں
ایہہ تیرا اعتبار

ظالم ظُلموں ناہیں ڈردے
اپنی عملیں آپے مَردے
مُونہوں توبہ دِلوں نہ کردے
ایتھے اوتھے ہون خوار

بُلھا شوہ دی سُنو حکایت
ہادی پھڑیاں ہوئی ہدایت
میرا سائیں شاہ عنایت
اوہو لنگھاوے پار

نِت پڑھنا ایں استغفار
کیسی توبہ ہے ایہہ یار

(انور علی رہتکی قانونِ عشق
صفحہ ۲۸۰ - کافی ۸۱)

نہ جیواں مہاراج مَیں تیرے بِن

مُرشد سے جُدائی بُلھے شاہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اُس کے بغیر ہر چیز پر اُداسی کا رنگ چھایا ہوا ہے:۔ نہ جیواں مہاراج مَیں تیرے بِن نہ جاواں
ایہناں سُکیاں پھُلاں وِچ باس نہیں
پردیس گیاں دی آس نہیں

دُوسرا بند موت کی آمد سے خبردار کرتا ہے۔ (سِر موت کھلوتی تیرے آن کے) اور تنبیہہ کرتا ہے کہ ہمیں اپنا قیمتی وقت بیہودہ کاموں میں نہیں گنوانا چاہیئے۔

نہ جیواں مہاراج مَیں تیرے بِن نہ جیواں
ایہناں سُکیاں پھُلاں وِچ باس[1] نہیں
پردیس گیاں دی آس نہیں
جیہڑے سائیں ساجن ساڈے پاس نہیں

تُوں کیہہ سُتا ایں چادر تان کے
سِر موت کھلوتی تیرے آن کے
کوئی عمل نہ کیتا جان کے

کیہہ مَیں کھٹیا تیری ہو کے
دونویں نین گوائے رو کے
تیرا نام لئیے مُکھ دھو کے

بُلھا شوہ بدیسوں آوندا
ہتھ کنگناں تے باہیں لٹکاوندا
سر صدقہ تیرے نام دا
نہ جیواں مہاراج مَیں تیرے بِن نہ جیواں

(نقوشِ کلیات، ص ۱۳۸)

[1] باس: خوشبو

نی مینوں لگڑا عشق اوّل* دا

خدا کے عشق میں جو درد پنہاں ہے، وُہی اِس نغمہ کا مضمون ہے۔ بُلھے شاہ اس کو کئی طرح سے بیان کرتا ہے۔ یہ کڑاہی میں تَلے جانے کی مانند ہے، اور آگ کے شرارے سے جل جانے کی طرح ہے یہ ایک ایسا تیر ہے جو جگر میں لگ کر وہیں گڑ گیا ہے۔ (تیر جگر وِچ لگا عشقوں، نہیں ہلایاں ہلدا) روزِ ازل سے ہی رُوح دردِ عشق میں مُبتلا ہے۔ (نی مینوں لگڑا عشق اوّل دا) یعنی اس وقت سے جب یہ خدا سے جُدا ہوئی عشقِ الٰہی اپنی مثال آپ ہے، کیونکہ اِس میں دُنیاوی عشق کا کوئی دخل نہیں ہے۔

نی مینوں لگڑا عشق اوّل دا
روزِ[1] ازل دا
وِچ کڑاہی تِل تِل جاوے، تلیاں نوں جا تلدا
مویاں نوں ایہہ وَل وَل[2] مارے، ولیاں نوں جا ولدا
کیا جانا کوئی چِنگ کھبیں[3] اے، نت سُول[4] کلیجے سَلدا[5]
تیر جگر وِچ لگا عشقوں، نہیں ہلایاں ہلدا
بُلھا شَوہ دا نیہوں انوکھا
نہیں[6] رلایا رلدا

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۳۹)

---

* خواجہ حافظ کہتے ہیں:- ؎ نبوُد نقشِ دو عالم کہ رنگِ اُلفت بوُد
زمانہ طرحِ محبت نہ ایں زماں انداخت
(دونوں جہان میں کسی ایک کا وجود نہ تھا، جب کہ عشق کا رنگ موجود تھا۔ محبت کی بُنیاد اس زمانہ میں نہیں پڑی)

[1] روزِ ازل دا، یعنی جب سے دُنیا بنی ہے اُس روز سے میں اِس عجیب وغریب عشق میں مُبتلا ہُوں۔
[2] وَل وَل = گھیر گھیر کر۔ [3] چِنگ کھبیں = گھاس کے تنکوں میں چنگاری۔ [4] سُول = درد۔
[5] سَلدا = چھید رہا ہے۔ [6] اس کی کوئی مثال نہیں۔

نی میں ہُن سُنیا عِشق شرع کیہہ ناتا

عِشق اور شرع ایک دُوسرے کے مخالف ہیں۔ عِشق کِسی قانون کے تابع نہیں۔ اِس کافی میں بُلھے شاہ ایک ایسے شخص کی وجدانی کیفیت کا ذکر کرتا ہے جس نے عشق کا جام پیا ہے۔ عاشق اپنے محبُوب کے سوائے باقی سب سے بےخبر ہوتا ہے۔ اُس پر دوسروں کی لعنت ملامت کوئی اثر نہیں کرتی۔

دُوسرے بند میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ خدا ہر ایک کے اندر ہے۔ تیسرے بند میں وُہ کہتا ہے کہ مُرشد ہمارے اندر ہے۔ اِن دونوں بندوں کو اکٹھا پڑھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خُدا اور مُرشد ایک ہیں۔ مُرشد خُدا کی محض ظاہری صُورت ہے۔

عشق کی راہ میں منطق و نحو کا نمائشی علم اتنا ہی بےسُود ہے جتنا کہ شرعی رسُومات، نماز اور روزے بیکار ہیں۔ عاشق اپنے محبُوب کے عشق میں مخمور ہوتا ہے۔

بُلھے شاہ اِس نظم کا اختتام یہ کہہ کر کرتا ہے کہ محبُوب کے سامنے اس کی زبان بند ہو گئی ہے (بُلھا شوہ دی مجلس بہہ کے ہو گیا گُونگا باتا۔)

نی میں ہُن سُنیا عِشق شرع کیہہ ناتا

محبّت دا اِک پیالہ پی، بُھل جاون سب باتاں[1]

گھر گھر سائیں ہے اوہ سائیں

ھر ھر نال پچھاتا

اندر ساڈے مُرشد وسدا

نیہوں لگا تاں جاتا

---

[1] باتیں۔

منطق[1] معنے کنز قدوری
پڑھیا عِلم گواتا

نماز روزہ اوس کیہہ کرنا
جس[2] مدھ پیتی مدھ ماتا

پڑھ پڑھ پنڈت مُلاں ہارے
کِسے نہ بھیت پچھاتا

زری[3] بافری قدر کیہہ جانے
چھوڑ اوناں جت کاتا

بُلھا[4] شوہ دی مجلس بہہ کے
ہو گیا گونگا باتا

نی میں ہُن سُنیا عشق شرع کیہہ جاتا

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۴۰)

---

[1] منطق = علم دلیل - کنز = علم کا خزانہ - قدوری = علمأ کا اکٹھے ہو کر اسلام کے دینی مسائل کو عقل، حدیث اور قیاس کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرنا۔

[2] مادھ = شراب، مدھ ماتا = شراب کے نشہ میں مدہوش - جس نے حقیقت کی شراب پی لی۔ وُہ اس کی مستی میں کھو کر شریعت سے بے بہرہ ہو گیا۔

[3] زری = سنہری تاروں سے بنا کپڑا - بافری = یعنی بافتہ مطلب ریشمی کپڑا - جت کاتا = جنہوں نے کاتا: جنہوں نے موٹے کھدر کے کپڑے بنے ہوں - انہیں زری بافتہ کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔

[4] رب سے ملاپ ہوا تو زبان بند ہو گئی۔

نی کوٹیچل میرا ناں

ایک ضدی اور شوخ طالب علم جو حروفِ تہجّی کے پہلے حرف سے آگے ترقّی نہیں کرتا، کی تمثیل دیتے ہوئے بُلھے شاہ کہتا ہے کہ اُسے شریعت کے مُعاملہ میں نااہل ہونے کے باعث ہر ایک کی لعنت ملامت برداشت کرنا پڑی۔

آگے چل کرنااہل طالب علم کی تمثیل ایک نااہل دُلہن کی تمثیل میں بدل جاتی ہے۔ اگر ایک نالائق طالب علم اگلی جماعت میں نہیں چڑھ سکتا، تو ایک نالائق دُلہن اپنے شوہر کے گھر میں داخل نہیں ہوسکتی۔ شرعی لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مذہبی پیچیدگیوں سے ناواقف ہے، اور اُس کے رسم ورواج کے مطابق نہیں چلتا تو وہ خدا کو نہیں پاسکتا۔ بُلھے شاہ کی اپنے باغیانہ رویہ کی وجہ سے نہ صرف شرع والے مذمت کرتے ہیں، بلکہ دُنیا کے عام لوگ سمیت اس کے والدین کے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کرتے ہیں دِل کے سیّاں مارن آئیاں۔ نالے مارن بابل ماں، اِس کے برعکس بُلھے شاہ کہتا ہے کہ اُسے خدا کی درگاہ میں اپنے مُرشد کے فضل و کرم سے باریابی حاصل ہوجائے گی۔ وہ کسی بھی قیمت پر عشق کی راہ سے ہٹ کر شریعت کا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

نی کوٹیچل[1] میرا ناں

مُلّاں[2] مینوں سبق پڑھایا
الفوں اَگے کجھ نہ آیا
اُس دیاں جُتیاں کھاندی ساں

---

[1] کوٹیچل: مار کھاکر بھی نہ سُدھرنے والا، ڈھیٹ۔
[2] مُلّا نے مجھے پڑھانے کی کوشش کی، مگر مجھے خدا کی ذات (الف) کے علاوہ دُوسری چیز سمجھ نہ آئی، اس لئے مجھے مُلّا کی مار کھانی پڑی۔

کوئیں کویں دو اکھیاں لائیاں[1]
رَل کے سئیاں مارن آئیاں
نالے مارے بابل ماں

سَاہُرے سانُوں وَرن نہ دیندے
نانک دادک گھروں کڈھیندے
میرا پیکے نہیوُں تھاں

پڑھن[2] سیتی سب مارن آہیں
بِن پڑھیاں ہُن چھڈدا ناہیں
نی میں مُڑکے کِت وَل جاں

بُلھا شوہ[3] کیہہ لائی مینوں
مَت کجھُ لگے اوہی تینوں
نہ کریں گا توں نیاں

(فقیر محمّد: کُلیات ، کافی ۱۴۱)

---

[1] بڑی مُشکل سے محبُوب سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔

[2] عشق کا سبق پڑھنا مُشکل ہے لیکن بغیر پڑھے بھی چارہ نہیں۔ یعنی عبادت کرنا مُشکل ہے، مگر اِس کے سوا چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

[3] نیاں = انصاف۔ محبُوب کو طعنہ دیتے ہیں کہ تجھے عشق ہو جائے تاکہ تجھے بھی معلوم ہو کہ میں جدائی کی آگ میں کس طرح جل رہی ہوں۔

نی سیئو مَیں گئی گواچی

محبوب کے شدید عشق میں عاشق اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اُسے ہر جگہ اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے وُہ شخص اپنے ماحول سے ہی لاتعلق نہیں ہو جاتا بلکہ خود ماحول ایک ایسی صُورت اختیار کر لیتا ہے جس میں اُسے محبُوب ہی محبُوب نظر آتا ہے۔ وُہ عارف جس نے اپنے اندر خُدا کا جلوہ دیکھ لیا ہے، اس کے لئے خدا ہمہ جائی ہو جاتا ہے۔ کافی کے آخری بند میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے،
(ایہہ گل مول کسے نہ کہیو، بُلھا خُوب حقیقت جاچی)

نی سَیئو مَیں گئی گواچی
کھول گھُنگھٹ مَیں ناچی

جت وَل ویکھاں اُت وَل اوہی، قسم اوسے دی ہور نہ کوئی
نَحنُ نَعلَمُہ[1] پھر گئی دھوئی۔ جب گور پیڑی پاچی

نام نشان نہ میرا سَیئو۔ جو آکھاں تُسیں چُپ کر رہیئو
ایہہ گل مُول کسے نہ کہیو۔ بُلھا خُوب حقیقت جاچی

نی سَیئو مَیں گئی گواچی
کھول گھُنگھٹ مَیں ناچی

(انور علی رہتکی: قانونِ عشق۔ صفحہ ۳۴۸
کافی نمبر ۱۱۵)

---

[1] یہ قرآن شریف کی آیت ہے، جس کا مطلب ہے "وُہ تمہارے ساتھ ہے"۔

واہ واہ رمز سجن دی ہور

یہ نظم بالخصوص عشق سے پیدا ہوئے درد اور عشق کے عوض ادا کی جانے والی قیمت سے وابستہ ہے۔ تاہم اس درد کے ہوتے ہوئے ایک اندرونی مسرت موجود ہے جس کا احساس صرف عاشقوں کو ہی ہوتا ہے۔

عاشق پھردے چُپ چپاتے
جیسے مست سدا مدھ ماتے

....

عاشق بناں نہ سمجھے کور

وُہ عشق کا درد کسی قیمت پر بھی ترک کرنے کو تیار نہیں، لیکن بلھے شاہ دنیا دی لذت کے متلاشیوں کو تنبیہہ کرتا ہے کہ وُہ عشق سے دُور رہیں۔

کوٹھے تے چڑھ دیواں ہوکا، عشق وہاجیو کوئی نہ لوکا

یہ کافی بھی حسبِ معمول بلھے شاہ کے مُرشد عنایت شاہ سے مخاطب ہے۔

ڈاہڈی کیتی بے پرواہی، مینوں مِل گیا ٹھگ لاہور

بلھے شاہ کچھ اور نامور عاشقوں کا ذکر کرتے ہوئے دِل کو تسلّی دیتا ہے۔ کہ اُن کو بھی عشق کی گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ نام مختلف کافیوں میں اکثر آئے ہیں جیسے کہ شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، لیلےٰ مجنوں، سسّی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھا۔

آخری بند میں خُدا کی طرف اشارہ ہے، جب بلھے شاہ کہتا ہے کہ محبوب کو بیرونی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ اس کا کوئی رنگ رُوپ نہیں ہے:-

بلھا شوہ نوں کوئی نہ ویکھے

....

اُس دا رنگ نہ رُوپ نہ ریکھے
اوہ ای ہووے ہوکے چور

اور جو اس کو اندرونی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے وہ اسے بیان نہیں کرسکتا دجو دیکھے سو کیسے نہ لیکھے)؛ ؎

وااہ وااہ رمز سجن دی ہور
عاشق بناں نہ سمجھے کور[1]

کوٹھے تے چڑھ دیواں ہوکا، عشق وہاجیو[2] کوئی نہ لوکا
اس دا مول نہ کھانا دھوکا، جنگل بستی ملے نہ ٹھور

عاشق[3] دوہیں جہانیں مٹھے۔ ناز معشوقاں دے اوہ کٹھے
عشق دا پھٹیا کوئی نہ چھٹے۔ کیتو سو ماندا پھٹ بلور

دے دیدار ہویا جد راہی۔ اچن چیت پئی گل پھاہی
ڈاہڈی کیتی بے پرواہی، مینوں مل گیا ٹھگ[4] لاہور

شیریں[5] ہے برہوں دا کھانا، کوہ چوٹی فرہاد نمانا
یوسف مصر بازار وکانا، اس نوں ناہیں ویکھن کور

لیلےٰ[6] مجنوں دونویں بردے، سوہنی ڈبی وچ بحر دے
ہیر وچھلائے سبھے گھر دے، اس دی کھچی ماہی ڈور

---

[1] کور = اندھے۔ جنہوں نے عشق نہیں کیا وہ اندھے اس کی قدر نہیں جانتے۔ [2] وہاجیو = خریدنا۔ ٹھور = ٹھکانہ۔ عشق کوئی نہ کرے۔ اگر تم نے عشق کیا تو کہیں کے نہ رہو گے۔ [3] مٹھے = لوٹے گئے کٹھے = مارے گئے۔ پھٹیا = زخمی کیا ہوا۔ بلور = شیشہ، کانچ۔ ماندہ = کمزور۔ یعنی ہر زخمی کرکے خون پی جاتا ہے، اور رنگ سفید بلور جیسا کر دیتا ہے۔

[4] مرشد کو لاہور کا ٹھگ کہہ رہے ہیں۔

[5] شیریں = میٹھا۔ یہاں اشارہ فرہاد کی معشوقہ کی طرف ہے یعنی شیریں کی خوراک فراق ہے۔ اشارہ فرہاد کی طرف بھی ہے جس نے شیریں کی خاطر پہاڑ کو کاٹ کر نہر نکالی تھی۔ نمانا = عاجز۔

[6] بردے = غلام۔ بحر = یہاں دریا سے مراد ہے۔ سوہنی مہینوال کی خاطر دریا میں ڈوب گئی تھی۔

عاشق پھردے چُپ چُپاتے، جیسے مست سدا مدھ ماتے
دام زُلف دے اندر پھاتے، اوتھے چلّے وَس نہ زور

جے اوہ آن ملے دِل جانی، اُس توں جان کراں قربانی
صُورت دے وِچ یُوسف ثانی[1]، عالم دے وِچ جِس دا شور

بُلھا شوہ نُوں کوئی نہ ویکھے، جو ویکھے سو کسے نہ لیکھے
اُس دا رنگ نہ رُوپ نہ ریکھے، اوہ اِی ہووے ہو کے چور

واہ واہ رمز سجّن دی ہور
عاشق بِنا نہ سمجھے کور

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۴۳)

۱ے یُوسف خُوبصورتی میں بے مثال تھا۔ یہاں مُرشد کی یُوسف سے تمثیل دی ہے۔

واہ سوہنیاں تیری چال عجائب

اِس کافی میں بُلھے شاہ اپنے مُرشد عنایت شاہ میں خُدا کا نُور دیکھتا ہے۔ وہ اس کے صرف جسمانی جلال سے متاثر ہی نہیں ہے، بلکہ خُدا کا ہمہ جائی ہونے کا وصف بھی اس میں دیکھتا ہے[1]

واہ سوہنیاں تیری چال عجائب، لٹکاں نال چلیندے او
آپے ظاہر اپنے باطن، آپے لُک لُک بہندے او

آخری بند میں بُلھے شاہ اپنے مُرشد کا اُن کئی نعمتوں کے لئے جو کہ مُرشد نے اُسے عطا کی ہیں، شُکریہ ادا کرتا ہے:۔

ذات توں ہے اشراف رنجھیٹا، لائیاں دی لاج رکھیندے او
بُلھا شوہ عنایت مینوں، پَل پَل درشن دیندے او

واہ[1] سوہنیاں تیری چال عجائب۔ لٹکاں نال چلیندے او
آپے ظاہر اپنے باطن آپے لُک لُک بہندے او
آپے مُلاں آپے قاضی آپے علم پڑھیندے او
گھت زنار کفر دا گل وِچ، بُت خانے وڑ بہندے او
لولاکے[2] لما افلاک وچاروں آپے دھُم مچیندے او
ذات[3] توں ہیں اشراف رنجھیٹا، لائیاں دی لاج رکھیندے او
بُلھا شوہ عنایت مینوں، پَل پَل درشن دیندے او
واہ سوہنیاں تیری چال عجائب۔ لٹکاں نال چلیندے او

(فقیر محمد: کُلیات، کافی ۱۴۴)

---

[1] مُرشد کی تعریف کر رہے ہیں۔ جس کی چال دلکش ہے۔ [2] لولاکے لما افلاکے: قُرآن شریف کی آیت ہے، جس کا مطلب ہے:۔ اگر تم نہ ہوتے تو نہ پیدا کرتا میں آسمانوں کو۔ مکمل آیت اِس طرح ہے:۔ "لولاکے لما خلقت الافلاکے"۔ [3] شریف خاندان سے ہے۔

وَتّ نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اَڑیا

اَیسا لگتا ہے کہ یہ کافی ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔ بُلھے شاہ نے نادانی کے ایک لمحہ میں اپنے مُرشِد کو ناراض کر دیا۔ اُس کی خوشنودی واپس حاصل کرنے کے لئے بُلھے شاہ قوالوں میں شامل ہو کر ایک رقاصہ کے بھیس میں ناچنے لگا۔

شوخیانہ انداز میں بُلھے شاہ شکایت کرتا ہے کہ عشق کے جواب میں محبوب سے وفا کی کوئی امید نہیں۔ اَب عاشق کوئی دلیرانہ دعوے نہیں کر سکتا، کہ اس کا محبُوب وفا میں استوار ہو گا۔ کیونکہ وُہ جب چاہے اُسے فراموش کر دیتا ہے۔

بُلھے شاہ کچھ مثالوں سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس محبُوب حقیقی کے طور و طریق نرالے اَور سمجھ سے باہر ہیں۔ وُہ ان کو تو پار لگا دیتا ہے جو خود پسند اَور متکبّر ہیں، لیکن جو اس کے لئے لعنت ملامت سہتے ہیں، اُن سے تغافل سے پیش آتا ہے۔

اِک کر دیاں خودی ہنکار، اُنہاں نُوں تارنا ایں وے اَڑیا
اِک تیچھے پھرن خوار مُتریاں نُوں ساڑنا ایں وے اَڑیا

آگے چل کر بُلھے شاہ کہتا ہے کہ جو انسان گُناہ سے بھرے ہُوئے ہیں، اُن کے ساتھ تو خوش رہتا ہے۔ اَور جو نیک اَور پارسا ہیں، اُن سے دُور بھاگتا ہے۔

چِکّڑ بھریاں دے نال نِت چھند گھتنا ئیں وے اَڑیا
لایا ئیں ہار سنگار میتھوں اُٹھ نسنا ئیں وے اَڑیا

اِن شکووں کے باوجُود بُلھے شاہ کے دِل میں اَپنے محبُوب کے لئے عشق کی شدت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ وُہ اپنے محبُوب کو اپنے گھر ٹھہرنے اَور دِل کی گانٹھ کھول لینے کی دعوت دیتا ہے ۔

اَج اجوکی رات میرے گھر وَسّ کھاں وے اَڑیا
دِل دیاں گھنڈیاں کھول اساں نال ہَسّ کھاں وے اَڑیا

کافی کے آخری دو مصرعوں کے طرزِ بیان میں ایک ظاہرہ تبدیلی نظر آتی ہے۔ بُلھے شاہ کو خدا

کے دیدار کی دعوت آتی ہے۔ اِن مصرعوں کا مضمون اُن لمحات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، جبکہ عنایت شاہ نے بُلھے شاہ کو رقاصہ کے بھیس میں پہچان لیا، اور اس کی خطا مُعاف کر دی۔

وَت نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اَڑیا
عِشق اللہ دی ذات لوکاں دا مہناں
کِیں وَل کراں پُکار کِسے نہیں رہنا
اوسے دی گل اوہا جانے
کون کوئی مار دا وے اَڑیا
وَت نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اَڑیا
اَج اجو کی رات میرے گھر وَس کھاں وے اَڑیا
دِل دِیاں گُھنڈیاں کھول اساں نال ہَس کھاں وے اَڑیا
دِلبر یار قرار کیتو ئی
کی عِتبار سوہنے یار دا وے اَڑیا
وَت نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اَڑیا
جان کراں قربان بھیت نہ دسنائیں وے اَڑیا
ڈھونڈاں کئی وار ہیٹھوں اُٹھ نسنا ایں وے اَڑیا
رَل مِل سئیاں نچدِیاں پھردِیاں
وقت ہویا بھنڈار دا وے اَڑیا
ہِک کردِیاں خُودی ہنکار انہاں نُوں تارنا ایں وے اَڑیا
اک تِپچھے پھرن خوار سڑیاں نُوں ساڑنا ایں وے اَڑیا
مینڈھے سوہنے یار وے اَڑیا
کی عتبار تیرے پیار دا وے اَڑیا
وَت نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اَڑیا

چَرخہ بھریاں دے نال نت چھند گھتنا ایں وے اڑیا
لایا نیں ہار سِنگار میتھوں اُٹھ نسنا ایں وے اڑیا
بُلھا شوہ گھر آ پیارے وقت دیدار دا وے اڑیا
وَت نہ کرساں مان رنجھیٹے یار دا وے اڑیا

(انور علی رہتکی۔"قانونِ عشق" صفحہ ۱۷۴
کافی نمبر ۵۴)

ویکھو نی کی کر گیا ماہی!

یہ ایک اور کافی ہے جس میں بُلھے شاہ نے ہیر اور رانجھا کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ وُہ اپنے محبُوب مُرشد سے جُدائی کی قابلِ رحم حالت کا بیان کرتا ہے۔

پہلے بند میں ہیر شکایت کرتی ہے، کہ اِن وفا اور ثابت قدمی کے تمام وعدوں کے باوجُود رانجھا نے اُسے آزمائش کی گھڑی میں ترک کر دیا (جب اُس کے والدین زبردستی اُس کی شادی کسی اور سے کر رہے تھے)۔ اُس کی آہ و فغاں کے جواب میں اُس کے رشتہ داروں نے اس کی سخت مذمت کی۔ ہیر نے کہا، اگر وُہ اس کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں تو وُہ اُسے گھر سے نکال کیوں نہیں دیتے؟

دوسرے بند میں رانجھا کا جوگی کے بھیس میں ہیر کے سُسرال میں نمودار ہونے کا ذکر ہے۔ اِس مُلاقات نے دو عاشقوں کو اکٹھا تو کر دیا، مگر تھوڑے عرصے کے لئے۔

آخری بند میں بُلھے شاہ خُدا سے شکایت کرتا ہے کہ وُہ اپنے ثابت قدم عاشقوں سے بڑی بےرحمی سے پیش آیا ہے، جیسا کہ اُس کے منصُور کے تئیں رویہ سے ظاہر ہے۔ آخری مصرع میں وُہ اعلانیہ کہتا ہے کہ اَب اُن طنزیہ جُملوں کا جو اُس پر کسے جاتے ہیں اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ (آن بنی جد نال اساڈے، بُلھا مُنہ توں لوئی لاہی)

ویکھو نی کی کر گیا ماہی
لیندا دیندا ہو گیا راہی

آماں جھڑکے تے بابل مارے، طعنے دیندے وِیر پیارے
جیہی بُری میں بُریار وے لوکا، مینوں دیہو اُتے ول تراہی
بُوہے تے ناد وجایا، عقل فِکر سب چا گوایا
اللہ دی سوہنہ اللہ جانے، ہسدیاں گل وچ پے گئی پھاہی
رہُ وے عِشقا کی کریں اکھاڑے، منصُور جہے چا سُولی چاڑھے

آن بنی حد نال اساڈے، بلھا مُنہ توں لوئی لاہی
ویکھو نی کی کر گیا ماہی
دلبندا دیندا ہو گیا راہی

انور علی رہتکی:- "قانونِ عشق"
صفحہ ۱۳۳- کافی نمبر ۱۹

لے اکھاڑے = لڑائیاں، جھگڑے۔ لے مُنہ توں لوئی لاہونا = لوک لاج چھوڑ دینا۔

ویکھو نی پیارا مینوں سُفنے میں چھل گیا

اِس نغمہ میں محبُوب کے خواب میں آنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تخیل یُوسف اور زُلیخا کی مشہور داستان سے وابستہ ہے۔ زُلیخا کو پہلی بار یُوسف کا دیدار خواب میں ہُوا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اُس کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی، جب تک کہ اس کا یُوسف کے ساتھ وصال نہیں ہُوا۔ ان واقعات کا درمیانی عرصہ فُرقت کے شدید رنج والم کا دَور تھا۔ پس اِس نظم کا مضمون عشق اور اس کے فراق سے پیدا ہونے والی اذیت ہے۔

آخری بند میں بُلھے شاہ مادی دُنیا کی سطح سے اُٹھ کر رُوحانی دُنیا میں داخل ہوتا ہے۔ جب وُہ کہتا ہے کہ محبُوب حقیقی ہر انسان کے اپنے اندر موجُود ہے یہ کام مُرشد کی مدد سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ اِس بند میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ بعد انسان کو زندگی کا بیشتر حصّہ بیکار گنوانے پر پشیمانی ہوتی ہے۔ یہ نظم اِس خوشگوار اعلان پر ختم ہوتی ہے، کہ بالآخر بُلھے شاہ کا اپنے محبوب سے وصال ہو گیا ہے۔

ویکھو نی پیارا مینوں سُفنے میں چھل گیا

سوئی ہوئی مٹھیاں، زُلیخا وانگوں کھٹیاں
عشق نے مَیں پٹیاں، بند بند میرا ہِل گیا

سیانیاں بولائیاں، مَیں اَوسیاں پوائیاں
نجومیاں جواب دِتا، میرے نیَنیں تیر چل گیا

نیڑے نی آئی دا، دُوروں ہے دکھلائی دا
نظارے سے ڈرائی دا، آج کوہِ طُور جل گیا

آپ نُوں لبھائی دا، شوہ عنایت ہے پائی دا
ویکھو نی پیارا مینوں سُفنے میں چھل گیا

(کافی ۳۸، صفحہ ۱۶۲: قانونِ عشق، انور علی رہتکی)

وِیکھو نی شاہ عنایت سائیں

یہ نظم بھی بُلھے شاہ نے اپنے مُرشد عنایت شاہ کے عشق میں لکھی ہے۔ عاشق شکوہ کے انداز میں دُکھ کا اظہار کرتا ہے، کہ اُسے مُرشد کا دیدار بہت کم ہوتا ہے۔

کدی آوے کدی آوے ناہیں۔ تیوں تیوں مینوں بھڑکن بھائیں

وُہ اس سے التجا کرتا ہے کہ وُہ اسے اپنے دیدار سے محروم نہ رکھے۔

دُوسرا اور آخری بند اُس دلیری کی طرف اشارہ کرتا ہے جو عشق سے پیدا ہوتی ہے:-

بُلھا شَوہ کہی لائی مینوں ، رات ہنیری اُٹھ ٹُردی نیں نُوں
جس اوہجر توں سب کوئی ڈردا ، سو مَیں ڈھونڈاں چائیں چائیں

وِیکھ نی شَوہ عنایت سائیں   مَیں نال کردا کریں ادائیں[1]
کدی آوے کدی آوے ناہیں   تیوُں تیوُں مینوں بھڑکن بھائیں[2]
نام اللہ پیغام سُنائیں   مُکھ ویکھن نُوں نہ ترسائیں
بُلھا شَوہ کہی لائی مینوں   رات ہنیرا اُٹھ ٹُردی نَیں[3] نُوں
جس اَوہجر[4] توں سب کوئی ڈردا   سو مَیں ڈھونڈاں چائیں چائیں

(فقیر محمد: کلیات۔ کافی ۱۴۹)

۱ ادائیں: نخرے۔ ۲،۳ بھائیں: آگ کی لپٹیں۔ نَیں: ندی، دریا۔ محبوب نے میرے اندر عشق کی آگ بھڑکا دی ہے، جس کی وجہ سے مَیں سوہنی کی طرح رات کو ندی عبور کرنے کو تیار ہو جاتی ہوں۔ ۴ اَدھ ہجر: غلط راستہ، خطرناک راستہ۔

ہِنْدُو نہیں، نہ مُسلمان

یہ کافی اُس خُدارسیدہ اِنسان کی حالت بیان کرتی ہے، جس نے نہ صِرف خُدا کو اپنے اندر پالیا ہے بلکہ جو خُدا کا ظہُور ہر ایک فرد میں دیکھتا ہے۔ وُہ مذہب و مِلّت، قوم و مُلک کے اِختلافات اور تعصبات سے بلاتر ہو جاتا ہے۔ اِس کافی کا پہلا مِصرع ہمیں گورونانک کے اُس قول کی یاد دلاتا ہے، جب اُنہوں نے کہا تھا "نہ کوئی ہِندُو نہ مُسلمان"۔ یہ اعلان اُنہوں نے اُس وقت کِیا تھا، جب اُنہیں عِرفانِ حق کا مشاہدہ "بئیں ندی" میں ہُوا۔

تمام خُدارسیدہ اِنسان اُن اِختلافات سے بالاتر ہوتے ہیں، جو اِنسان کو اِنسان سے جُدا کرتے ہیں۔ وُہ اخلاقی اِمتیازات جیسے نیک و بد، غلط و صحیح سے بھی اُوپر ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ وُہ مادّی ضرورتیات سے بھی اُوپر اُٹھ جاتے ہیں۔ (بھُکھے نہ، نہیں ہم رَجّے، ننگے نہ نہیں ہم کجّے) وُہ اپنا جذباتی توازن کبھی نہیں کھوتے (روندے نہ، نہیں ہم ہسدے) وُہ اپنے پرائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتے۔ اُن کے لئے کوئی 'میرا' 'تیرا' نہیں رہتا۔ وُہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ یہ سب کُچھ ہوتے ہُوئے بھی وُہ دُنیا میں خود کو بیگانہ سا محسُوس کرتے ہیں (اُجڑے نہ، نہیں ہم وَسدے) چُونکہ وُہ ہر اِنسان میں ایک ہی خُدا کو دیکھتے ہیں، اِس لئے وُہ صُلحِ کُل ہوتے ہیں (بُلھے شاہ جو ہر جیت لاگے، تُرک اور ہندُو دُوجن تیاگے)

مندرجہ بالا کیفیت رُوح سے منسُوب ہے، نہ کہ جِسم اور نفس سے۔ مکمّل خود آگاہی کی حالت میں خُود سے مُراد رُوح ہے۔ رُوح تمام مندرجہ بالا اِمتیازات سے بالاتر ہے۔ یہ امتیازات صِرف جِسم اور نفس کے طبقات تک محدُود ہیں۔

ہِنْدُو نہیں، نہ مُسلمان

ہِنْدُو نہیں، نہ مُسلمان، بہے ترِنجن، تج ابھمان

؎ پہلے مصرع کو مقطع سے مِلا کر پڑھنے سے کافی کا مطلب صاف ہو جائے گا (باقی اگلے صفحہ ۴۴۶ پر)

سُنی[۲] نہ، نہیں ہم شیعا، صُلح کُل کا مارگ لیتا

بُھکھے نہ، نہیں ہم رَجّے، ننگے نہ، نہیں ہم کجّے

روندے نہ، نہیں ہم ہسدے، اُجڑے نہ، نہیں ہم وسدے

پاپی[۳] نہ، سُدھرمی ناں، پاپ پُن کی راہ نہ جاں

بُلھے شاہ! جو ہر چِت لاگے
تُرک اور ہندو دوجن[۴] تیاگے

(نذیر احمد: کلامِ بُلھے شاہ۔ صفحہ ۸۳)

(بقیہ فٹ نوٹ:۔ صفحہ ۴۴۸ سے آگے) جو رُوح خدا میں جذب ہو کر خدا کی صُورت اختیار کر لیتی ہے، اس کی ہر طرح کی دُوئی ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت بُلھے شاہ کا اشارہ اس اونچی رُوحانی کیفیت کی طرف ہے جس میں رُوح مَن اور مایا کے سب پردے اُتار کر اپنی خالص رُوحانی اصلیت میں چمک اُٹھتی ہے۔

[۲] سُنی اور شیعہ مُسلمانوں کے دو فرقے ہیں۔ صُلح کُل = جن کی ہر ایک کے ساتھ صُلح ہے۔ ہر ایک کے ساتھ جن کا پیار ہے۔

[۳] پاپ اور پُنیہ یعنی گناہ و ثواب کی تکرار سے اُوپر اُٹھ چکا ہوں۔

[۴] دُوجن = دوئیت۔ دُوئی۔

ہُن کیہہ تھیں آپ چھُپائی دا

بظاہر سب انسان مختلف ہیں لیکن اُن سب میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے۔ یہ آگہی اُس وقت نصیب ہوتی ہے، جب انسان خُدا کو اپنے اَندر دیکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اُسے خُدا ہر طرف نظر آتا ہے۔ پانچویں بند میں بُلھے شاہ ہمیں پھر یاد دلاتے ہیں کہ خُدا تک رسائی کے لئے انسان کو جیتے جی مرنے کے شغل میں کمال حاصل کرنا پڑتا ہے۔ (جو یار نے تُساڈی کردا ہے، اوہ موئیاں توں اگوں مَروا ہے) جیتے جی مرنے سے مُراد رُوح کے نقطۂ سویدا پر یکسُو ہونے سے ہے جہاں پہنچ کر وُہ رُوحانی تجلّی سے وابستہ ہو جاتی ہے۔

چھٹے بند میں بندرابن کے گوالے (بھگوان کرشن)، لنکا میں ناد بجانے والے (بھگوان رام) اَور مکّہ کے حاجی بن کر آنے والے (حضرت محمدؐ صاحب) سب کو ایک ہی خُدا کا ظہور کہا گیا ہے۔ ساتویں بند میں آپ خُدا سے شکایت کرتے ہیں کہ "تُو نے اپنے بیٹے منصُور کو سُولی پر چڑھا دیا۔ منصُورؒ میرا بھائی تھا، اِس لئے تُم مجھے اس کے خُون کا بدلہ دو"۔ یہ بُلھے شاہ کا ایک نرالہ انداز ہے، جس میں وُہ خُدا سے بھی چونچلے کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ منصُور کو بھائی کہنے سے اشارہ مِلتا ہے کہ بُلھے شاہ خُدا کے ساتھ ہی نہیں منصُور کے ساتھ بھی اَپنا قریبی رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ بلاشک سب کامل فقیر ایک ہوتے ہیں:-

ہُن کیہہ تھیں آپ چھُپائی دا

کِتے مُلّاں ہو بلیندے ہو، کِتے سُنّت فرض دسیندے ہو

کِتے رام دُہائی دیندے ہو، کِتے ماتھے تِلک لگائی دا

لے میں نے کثرت کے پردے کے پیچھے چھُپی قادر کے نُور کی وحدت کو پہچان لیا ہے۔ میرے سب شکوک دُور ہو گئے ہیں کہ باہر سے دیکھنے میں الگ الگ معلوم ہونے والی شکلوں اَور صُورتوں کے پیچھے ایک ہی خداوند کریم کا نُور جلوہ گر ہے۔

لے اسلامی طرزِ زندگی کو سنت کا نام دیا جاتا ہے۔

مَیں[1] میری ہے کہ تیری ہے، پر اَنت بھسم دی ڈھیری ہے
ڈھیری نُوں مُن کیری ہے، ڈھیری نُوں ناچ نچائی دا

کِتے بے[2] سِر جوڑا پاؤ گے، کِتے جوڑا شان بنڈھاؤ گے
کِتے آدم حوّا بن آؤ گے، کدی مینتھوں[3] وی بُھل جائی دا

باہر ظاہر ڈیرا پائیو، آپے ڈھوں ڈھوں ڈھول بجائیو
جگ[4] تے اَپنا آپ لکھائیو، پھر عبداللہ دے گھر دھائی دا

جو[5] بادتساڈی کردا ہے، اوہ مویاں توں اگوں مردا ہے
اوہ[6] مویاں وی تیتھوں ڈردا ہے، مَت مویاں نُوں مار کُہائی دا

بندرا[7] بن میں گئو چَرا دے۔ لنکا چڑھ کے ناد وجاوے
مکّے[8] دا بن حاجی آوے، واہ وا رنگ[9] وٹائی دا

---

[1] جسم اور خودی فنا پذیر ہیں۔ لیکن فنا جسم میں ایک لا فانی حقیقت ہے، جو اِس مٹّی کی ڈھیری کو اپنے حُکم کے مطابق نچاتی ہے۔ فقیر محمد کی کتاب کافیاں بُلھے شاہ میں یہ درس بجائے " ڈھیری نُوں مُن کیری ہے" کے " ایہہ ڈھیری پیانے گھیری ہے" لکھا ہے۔ اور اگلے بند میں" جو بھال تساڈی کردا ہے، مویاں توں اگے مردا ہے" لکھا ہے۔ [2] بے سِر جس کا سر نہ ہو۔ یعنی گول۔ [3] میں کبھی آپ کی پہچان نہیں بھول سکتا، فوراً اپنے آپ کو پہچان لُوں گا۔

[4] عبداللہ حضرت محمد صاحب کے والدِ محترم کا نام ہے

[5-6] رَبّ کا سچّا عاشق جیتے جی مرنے کی مشق کرتا ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۱۔

(باقی اگلے صفحہ پہ دیکھیں)

منصور تساں تے آیا ہے، تسیں سولی پکڑ چڑھایا ہے
میرا بیرنا بابل جایا ہے، تسیں خون دیو میرے بھائی دا

بلھا شوہ ہن صحیح سنجھاتے ہو، ہر صورت نال پچھاتے ہو
کتے آتے ہو کتے جاتے ہو، ہن میتھوں بھل نہ جائی دا

ہن کیہہ تھیں آپ چھپائی دا

(انور علی رہتکی:۔ قانونِ عشق، صفحہ ۱۱-۳۱۰۔
کافی نمبر ۹۰)

بقیہ:۔ فٹ لوٹ صفحہ ۴۴۸ سے آگے)

۸-۷ بندرابن کا گوالا بھی تو ہے۔ لنکا پر حملہ کرنے والا رام بھی تو اور مکے میں حضرت محمدؐ بن کر پہنچنے والا بھی تو ہی ہے۔ حاجی مکے کے حج کو جاتے ہیں۔ آپ خدا کے حضرت محمدؐ صاحب کی شکل میں آنے کو مکے کا حاجی بن کر آنا کہتے ہیں۔

۹-۱۰ منصور آپ کے پاس پہنچا۔ آپ نے اسے سولی پر چڑھا دیا۔ وہ میرے باپ کا بیٹا میرا بھائی ہے (میں اس کا وارث ہوں) آپ مجھے اس کے خون کا بدلہ دو۔ ایسی شوخی اور ادا صرف سائیں بلھے شاہ کے حصے میں آئی ہے۔ بیرنا = بھائی کو کہتے ہیں۔

۱۱ سنجھانے =

ہُن مینُوں کَون پچھانے

اِس مشہُور کافی کا مضمون اُس مُکمل تبدیلی سے وابستہ ہے جو عشق کے ذریعے اِنسان میں پَیدا ہوتی ہے۔ یہ مُرشد کا عِشق ہی ہے جو مُرید کو خدا کے جمال سے روشناس کراتا ہے۔ خُدا کا اپنے اندر دیدار کرنے کے بعد وُہ اُسے ہر جگہ دیکھتا ہے۔ اَور اس کی ہستی خُدا کی ہستی میں نابوُد ہو جاتی ہے (ظاہر باطن دِسدا جانی، رہیا نہ میرا نام نشانی)

آخری بند میں کہا گیا ہے کہ محبُوبِ حقیقی کا جمال سچے عاشقوں کو بے پایاں مستی سے سرشار کر دیتا ہے۔ بُلھے شاہ پر بھی اسکے جمال وجلال کا جادُو ہو گیا ہے۔ اِس سے اُس کی کوّے والی مادہ پرست حالت ہنس جیسی خُدا پرست حالت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

ہُن مَینُوں کون پچھانے ہُن مَیں ہو گئی نی کجھ ہور

ہادی[1] مینُوں سبق پڑھایا
اوتھے غیر نہ آیا جایا
مُطلق[2] ذات جمال وکھایا
وحدت پایا نی شور
اوّل[3] ہو کے لامکانی
ظاہر باطن دِسدا جانی
رہیا[4] نہ میرا نام نشانی
مِٹ گیا جھگڑا شور

---

[1] مُرشد نے مجھے وحدت کا سبق دیا ہے، جہاں کوئی غیر نہیں۔

[2] مُطلق ذات = لاتعلق رب۔ جب مَیں نے رَب کا جمال دیکھا تو اندر مُکمل وحدت کے نغمے گونج اُٹھے۔

[3] پہلے مجھے وُہ محبُوب کہیں نظر نہیں آتا تھا، اب وُہ باہر اندر ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔

[4] میری خودی یا الگ ہستی ختم ہو گئی اور مَیں پُوری طرح خدا میں سما گئی۔

پیارا[1] آپ جمال وکھالے
مست قلندر ہون متوالے
ہنساں[2] دے ہُن ویکھ تے چالے
بُلھا کاگ دی مُجل گئی ٹور
ہُن مینوں کون پچھانے ہُن میں ہو گئی نی کُجھ ہور

(فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۵۵)

---

[1] وُہ محبُوب خود فقیروں، قلندروں کو دیدار دے کر مست کر رہا ہے۔
[2] مومنوں کے اوصاف اختیار کر کے مومنوں (ہنسوں) کی کیفیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور کافروں (کوّوں) کی عادت چھوٹ گئی ہے۔

ہُن میں لکھیا* سوہنا یار

یہ کافی ہمیں گورُو نانک صاحب کی اُس مشہوُر نظم کی یاد دلاتی ہے جس میں اُنھوں نے کائنات کی تخلیق سے متعلقہ اپنا فلسفہ پیش کیا ہے[1]۔ اُسی پیرائے میں بُلھے شاہ کہتا ہے کہ ابتدا میں وُہ ایک واحد حقیقت تھی، اَور اس کے سوائے کُچھ نہ تھا۔ اُس نے اپنا ظہوُر خُدا کی صُورت میں کیا اَور معبوُد کہلایا۔ بعد ازیں وُہ مُرشد کی صُورت میں انسانی قالب پہن کر دُنیا میں آیا۔ ساتھ ہی وُہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں سما گیا، حالانکہ وُہ دکھائی دیتا۔ وُہ تمام کائنات کی جان ہے۔ اگر وُہ اپنے آپ کو اِس کائنات میں سے نکال لے، تو یہ نیست و نابوُد ہو جائے گی۔

اِس کافی کا ششم بند گورُو نانک دیو کی ایک اَور مشہوُر نظم کی یاد تازہ کراتا ہے[2]۔ اس نظم میں گورُو صاحب فرماتے ہیں، کہ خُدا کی درگاہ میں لاکھوں محمّد۔ لاکھوں برہما، وشنُو اَور مہیش (شوجی) اَور رام ہیں...... اِسی طرح بُلھے شاہ بھی کہتے ہیں (پیر پیغمبر اُس دے بردے۔ انس ملائک سجدے کردے)

آخری بند میں اپنے مُرشد کی تعریف کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ یہ راز کبھی افشاء نہ ہوتا۔ اگر مُرشد کی مجھ پر عنایت نہ ہوتی۔

ہُن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حُسن دا گرم بازار
جَد[3] احد اِک اکلّا سی نہ ظاہر کوئی تجلّا سی
نہ رَب رسُول نہ اللہ سی نہ جبّار تے نہ قہّار
بے چُون و بے چگُونہ سی بے شبیہ بے نمونہ سی
نہ کوئی رنگ نہ نمونہ سی ہُن گوُناں گوُن ھزار

* لکھیا: دیکھا، جان لیا۔ [1] دیکھو آدگرنتھ صفحہ ۱۰۳۵-۳۶۔ نظم: "اَربد نربد دھندوکارا"
[2] آدگرنتھ، بیڑ بھائی بنّو یہ نظم مکالف نے اپنی تصنیف "دی سکھ ریجن" کے حصّہ اول کے صفحہ ۴۰ پر دی ہے۔
[3] جب وُہ ایک یگانہ تھا، تو اس کی تجلّی بھی ظہوُر میں نہیں آئی تھی۔ (اس نے ابھی نہ خدا اَور (باقی صفحہ ۴۵۳ پر دیکھیں)

پیارا پہن پوشاکاں آیا آدم اپنا نام دھرایا
احد تے بن احمد آیا نبیاں دا سردار
کُن کہیا فیکون کہایا. بے چُونی سے چُون بنایا[1]
احد دے وِچ میم رلایا. تاں کیتا ایڈ پسار
تجوں مسیت تجوں بت خانہ. برتی رہاں نہ روزہ جانا
بھُل گیا وضو نماز دوگانا، تیں پر جان کراں بلہار
پیر پیغمبر اس دے بردے، اِنس ملائک[3] سجدے کردے
سر قدماں دے اُتے دھردے. سب توں وڈی اوہ سرکار
جو کوئی اُس نوں لکھیا چاہے، باہجھ وسیلے لکھیا نہ جائے
شاہ عنایت بھیت بتائے. تاں کھُلے سب اسرار
ہُن مَیں لکھیا سوہناں یار۔جس دے حُسن دا گرم بازار (فقیر محمد: کلیات، کافی ۱۵۲)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۵۶ سے آگے :- نہ ہی مُرشد کی شکل اختیار کی تھی۔ دُنیا میں نہ ہی کوئی جبر کرنے والا تھا اور نہ ہی قہر ڈھانے والا۔

[1] بے چُون = بے صُورت ۔ [2] گوناگوں = کثرت

[3] اِنس ملائک = انسان اور فرشتے۔

سی حرفی

جیسا کہ "زبان اور بیان" کے باب میں لکھا جا چکا ہے، سی حرفی ایسی نظم ہے جس میں شاعر حروفِ تہجی کی بنا پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ بہت سے دوسرے صوفی شاعروں کی طرح سائیں بلھے شاہ نے بھی سی حرفیاں لکھی ہیں۔ ان کے دیگر کلام کی طرح سی حرفیوں میں بھی محبوب کے عشق اور اس سے ہجر میں ملے درد و سوز کا رنگ نمایاں ہے۔

سی حرفی۔ ایک انتخاب

عشق کی آگ

بلھے شاہ کی اِس سی حرفی میں، جو حروفِ تہجی کے چھ حروف پر مشتمل ہے عشق کی ایک مسلسل لہر رواں ہے۔ اِس میں اُس اذیت کا بھی بیان ہے، جو راہِ عشق میں جھیلنی پڑتی ہے۔ عشق کا رُخ جب خدا کی طرف ہو جاتا ہے تو یہ اذیت اور بڑھ جاتی ہے۔

الف اللہ جس دِل پر ہووے، مُنہ زردی اکھیں لہو بھر رووے
جیون اپنے توں ہتھ دھووے۔ جس نوں بِرہوں اگ لگاوے

سی حرفی کے دُوسرے اور تیسرے بند میں یہی کیفیت جاری ہے۔ چوتھے بند میں خدا سے دُعا کی گئی ہے کہ وُہ اس پر رحم کرے۔ پانچویں اور چھٹے بندوں میں اِس التجا کے اسباب بتلائے گئے ہیں۔

ج جہانوں ہوئی ساں نیاری، لگا نیہہ ناں ہوئے بھکاری
نال سرہوں دے بنے پساری۔ دُو جا دے میہنے جگ تاوے

چھات گھتن نُوں لاواں واہیں، سینے سُول پریم دی دھاوے

لاگی[1] رے لاگی بَل بَل جاوے
اِس لاگی کو کون بجھاوے
الف۔ اللہ جس دِل پر ہووے، مُنہ[2] زردی اکھیں لہو بھر روے
جیون اپنے توں ہتھ دھووے، جس نُوں برہوں اَگ لگاوے
لاگی رے لاگی بَل بَل جاوے
ب۔ بالن میں تیرا ہوئی، عشق[3] نظارے آن دگوئی
روندے نین نہ لیندے ڈھوئی، نُون پھٹاں تے کیکر لاوے
لاگی رے لاگی بَل بَل جاوے
ت۔ تیرے سنگ پریت لگائی، جیو[4] جامے دی کیتی سائی
میں بکری تُدھ کول قصائی، کٹ کٹ ماس ہڈاں نوں کھاوے
لاگی رے لاگی بَل بَل جاوے
ث۔ ثابت[5] نیہوں لائیا مینوں، دُوجا کُوک سُناواں کینہوں
رات[6] اَدھی اُٹھ ٹھِلدی نیں نوں، کونجاں وانگ پئی کُرلاوے
اِس لاگی کو کون بجھاوے

---

۱ عشق کی آگ لگ گئی ہے ۲ چہرہ زرد پڑ گیا ہے ۳ محبوب کے دیدار کے لئے عشق مجھ پر ٹُوٹ پڑا ہے۔ ۴ جیو = رُوح۔ جامہ جسم۔ یعنی عشق میں تن من قربان کرنے کا سودا کر لیا ہے۔ ۵ ثابت = عشق میں ثابت قدم۔ ۶ نیں = ندی۔ یعنی سوہنی کی طرح دریائے عشق کو عبور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ج۔ جہانوں ہوئی ساں نیاری، لگا نیہہ تاں ہوئے بھکاری
نال سرہوں دے بنے پیاری، دُوجا دے جھنے جگ تاوےؔ
اِس لاگی کو کون بجھاوے

ح۔ حیرتؔ وِچ شانت ناہیں، ظاہر باطن ماراں ڈھاہیں
حجھاتؔ گھتن نوں لاواں واہیں، سینے سُول پریم دی لھاوے
اِس لاگی کو کون بجھاوے

لہ جلائے۔ ؔ۲ میں پریشان ہوں، چین نہیں آتا۔ ؔ۳ جھات۔ دیدار۔ گھتن۔ پانے کے لئے۔ اس کا دیدار کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

گنڈھاں

ہمارے دیہات میں یہ عام رواج رہا ہے کہ کسی اہم تقریب کے لئے جتنے دِن رہتے ہوں، اتنی ہی گانٹھیں (گنڈھاں) کسی دھاگے میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر ہر صبح ایک ایک گانٹھ کھولتے رہتے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا رہتا ہے کہ تقریب کے آنے میں کتنے دِن باقی رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آخری گانٹھ کھلتی ہے تو وُہی تقریب کا دِن ہوتا ہے۔

صُوفی لوگ عام طور پر چالیس دِن کسی ریاضت کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اس کو چِلّہ بھی کہتے ہیں۔ اِس طرح چالیس کا عدد ایک خاص اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ چُنانچہ اِس نظم کے شروع میں ایک دوشیزہ (یعنی سالک) اپنے دُولہا کے بارات لے کر آنے میں چالیس دِن کا وقفہ بتا رہی ہے۔ یہ چالیس دِن اُس نے ابھی اپنے مائیکے (اِس دنیا) میں ہی گزارنے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے سسرال (آخرت) جانے کی تیاری (ریاضت) بھی کرنی ہے۔

نظم اِسی پیرایہ میں جاری رہتی ہے۔ دوشیزہ ہر روز ایک گانٹھ کھولتی ہے، اور اپنے دِل کی حالت بیان کرتی ہے۔ وُہ بیتابی سے اپنے نوشہ کا انتظار کر رہی ہے۔ آخر کار وُہ دِن بھی آجاتا ہے، جب وُہ چالیسویں اور آخری گانٹھ کھول دیتی ہے۔ اس دِن اُس کا محبوب (مُرشد یا خُدا) بارات کے ساتھ اُسے اپنے ہمراہ لے جانے کے لئے آجاتا ہے۔ اپنے محبوب سے وصال کے وقت اس کی اپنی ہستی اپنے محبوب کی ہستی میں جذب ہو جاتی ہے (جس اپنا آپ ونجا لیا سو سُرجن والی ..... جس نوں عشق ہے لال دا سو لال ہو جاوے)۔

آخری شعر میں بُلھے شاہ نے بارات وغیرہ کے استعارے چھوڑ کر براہِ راست خدا اور بندے کے وصال کا ذکر کیا ہے (اللہ ہی سب ہو گیا عبداللہ ناہیں)۔

کہو سُگھڑتی[1] گل کاج دی میں گنڈھاں کیتیاں پاواں
ساہے[2] تے جنج آوسی، ہُن چاہلی گنڈھ گھتاواں[3]
بابل آکھیا آن کے، "تیں ساہوریاں گھر جانا
ریت اوہناں دی اور ہے، مُڑ پیر نہ ایتھے پانا"
گنڈھ پہلی نوں کھول کے، میں بیٹھی برلاواں[4]
اوڑک جاون جاونا، ہُن ہن داج رنگاواں
دیکھوں طرف بازار دی، سب رسنے لاگے
پلے کجھ نہ روکڑی[5]، سب مجھ سے بھاگے
کر بسم اللہ کھولیاں، ہیں گنڈھاں چالی[6]
جس اپنا آپ ونجالیا، سو سُرجن والی
جنج سوہنی میں بھاؤندی، لٹکیندا آوے
جس نوں عشق ہے لال دا، سو لال ہو جاوے
عقل فکر سب چھوڑ کے، شوہ نال سدھائے
کتنوں بن گل غیر دی اساں یاد نہ کائے
ہُن انا للہ[8] آکھ کے، تُم کرو نگاہیں
اللہ[9] ہی سب ہو گیا، عبداللہ ناہیں

(ڈاکٹر نذیر احمد، کلامِ بُلھے شاہ۔ صفحہ ۹۲)

[1] سُگھڑتی = اے سگھڑت والی یعنی عقل والی سہیلی کام کی بات کہو۔ [2] شادی کا دن۔ [3] باندھوں [4] بڑبڑاؤں۔ [5] روکڑی = دولت = نیک اعمال۔ [6] خدا کا نام لے کر چالیس گانٹھیں کھول لی ہیں۔ یعنی شادی کے لئے تیار ہو گئی ہوں۔ [7] ونجالیا = گنوا دیا۔ سُرجن = دیوتا۔
[8] انا للہ = ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ آیت موت کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ [9] بُلھے کا اصلی نام عبداللہ تھا۔ یہاں اس کا مطلب خدا کا بندہ ہے۔

اٹھوارہ

کچھ ہندوستانی صوفی شعراء نے ہفتہ کے سات دنوں کو لے کر مسلسل نظمیں لکھی ہیں۔ اسی انداز میں جیسے کہ سال کے بارہ مہینوں (بارہ ماہ) پر رقم کی ہیں۔ یہ شاعر کے مزاج کی مختلف کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ موجودہ انتخاب میں دو دِن، سنیچر اور جُمعرات چُنے گئے ہیں۔

سنیچروار پر لکھی گئی نظم گھبراہٹ اور پریشانی کی مظہر ہے۔ اِس میں امید اور یاس دونوں کا میل ہے۔ عاشق کو اپنے محبوب کی خبر ملتی ہے، اور وُہ اس کی تلاش میں نِکل پڑتا ہے۔ یہ تلاش نہ صِرف بے کنار ہے، بلکہ سخت بھی ہے۔ یہ تلاش پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ تلاش دِن رات جاری ہے۔ دُوسرا بند اس اذیت کی ترجمانی کرتا ہے، جس میں امید اور تشویش دونوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے (سینے اندر رڑکن سانگاں)۔

جو نظم جُمعرات پر لکھی گئی ہے، وُہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اِس میں مُسرت کا جذبہ نمایاں ہے، کیونکہ معشوُق عاشق کی نظر میں آگیا ہے۔ وُہ محبُوب خداوند کریم انسان کی شکل اختیار کر کے اِس دُنیا میں آیا ہے (اوہ جامہ ساڈا پہن کے آیا تماشے آپ)۔ اُس نے اپنے متلاشیوں کو شرابِ عشق سے سرشار کر دیا ہے۔ اُس سے وصال کی وجدانہ حالت میں شاعر اپنی ہستی کو بھُول چکا ہے (رنگ گیا مست پیالہ ہات، مینوں بھُل گئی ذات صفات)

نظم کا آخری بند جادُوگری اور جنّوں بھُوتوں کے بلانے کے عِلم کی سخت مذمت کرتا ہے (ایسی زحمت لوک نہ پاون، ملاں گھول تعویذ پلاون۔ پڑھن عزیمت جِن بلاون، سیاں شاہ مدار کھڈاون)

چھنچھر وار اُتاولے[1]، ویکھ سجن دی سوئے[2]
اَساں مڑ گھر پھیر نہ آونا، جو ہوتی ہوگ سو ہو

---

[1] اُتاولے: بے صبر [2] سوء: خبر۔ [3] بار بار انسانی جسم نہیں مِلتا۔

واہ واہ چھنتجھر وار وِہیلے[1]، دُکھ سجن دے مَیں دل پیلیے[2]
ڈھونڈاں اوجھڑ[3] جنگل بیلے[4]، اوہڑاں رین کو لڑے ویلے
برہوں گھیریاں

کھڑی تانگھ[5] تُاڈیاں تانگھاں، راتیں سُتر سے شیرُ الانگھاں[6]
اُچی چڑھ کے کُوکاں چانگھاں[7]، سینے اندر رڑکن سانگاں[8]
پیارے تیریاں

جُمعرات سہاونی، دُکھ درد نہ آہا پاپ
اوہ جامہ ساڈا پہن کے، آیا تماشے آپ
اگوں آ گئی جُمعرات۔ شرالوں گاگر لی برات
لگ گیا مست پیالہ ہتھ، مینوں بُھل گئی ذات[10] صفات

دیوانی ہو رہی

ایسی زحمت[11] لوک نہ پاون، مُلّاں گھول تعویذ پلاون
پڑھن عزیمت[12] جِن بلاون، سئیاں[13] شاہ مدار کھڈاون
میں چُپ ہو رہی

ؔ1 زہر سے بھرا ہوا۔ ؔ2 بھیجے۔ ؔ3 جنگل۔ ؔ4 بیابان۔ ؔ5 انتظار۔
ؔ6 اُوپر سے گزر جانا۔ پھاند جانا۔ ؔ7 چیخنا چلّانا۔ ؔ8 سینے میں برچھیاں چل رہی ہیں۔ ؔ9

دوہڑے اور متفرقات

دوہڑہ نظم کی ایسی صورت ہے، جس میں شاعر دو مصرعوں میں ایک مکمل خیال بیان کرتا ہے۔ دوہڑے کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ سائیں بلھے شاہ کے دوہڑے شکل میں جتنے مختصر ہیں، خیال میں اُتنے ہی زوردار ہیں۔ اِن دوہڑوں کا سب سے نمایاں وصف طنز ہے، جو کہیں سوئی کی مانند چبھنے والا ہے، کہیں نشتر کی مانند تیز دھار اور کہیں ہتھوڑے کی مانند کراری چوٹ کرنے والا ہے۔ دوہڑوں میں جس بے خوفی اور پرزور انداز میں اہلِ شرع اور دوہرے کردار والے لوگوں پر حملے کئے گئے ہیں، وہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ دوہڑے سائیں جی کی شخصیت کے سب سے معتبر نمائندہ ہیں۔

آئی[1] رُت شگوفیاں والی، چڑیاں چگن آئیاں
اِکناں[2] نوں جُرّیاں پھڑ کھادا، اِکناں پھاہیاں لائیاں
اِکناں[3] آس مُڑن دی آہے، اِک سیخ کباب چڑھائیاں
بُلھے شاہ کی وس اُنہاں، جو مار تقدیر پھسائیاں

۲
ہور نے سبھے گلڑیاں، اِک اللہ اللہ دی گل
کجھ رَولا پایا عالماں، کجھ کاغذاں پایا جَھل

---

۱ اور ۲ سے یہاں تقدیر کا اور دُنیا میں ہر سُو بچھے ہوئے موت اور شیطان کے جال کا پُرزور بیان کیا گیا ہے۔ دُنیا کے باغ میں انسانی جنم شگوفوں والا موسم ہے۔ رُوحیں (چڑیاں) دُنیا میں اپنے اعمال کے پھندے میں پھنسنے کیلئے اُترتی ہیں۔ جُرّے = باز۔ کچھ چڑیوں کو باز (موت کے فرشتے) کھا گئے کچھ مادیت اور نفسانی خواہشات کے پھندے میں پھنس گئیں۔ ۳ے کچھ رُوحوں (چڑیوں) کو اندر اپنے اصلی گھر پہنچنے کی امید ہے، اور کچھ رکئے ہوئے اعمال کی وجہ سے دُکھ اُٹھا رہی ہیں۔ ۴ے جن کو اپنے کئے ہوئے اعمال سے بنی تقدیر نے مار گرایا، اُن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔

بلھیا میں مٹی گھمیار دی۔ گل آکھ نہ سکدی ایک
تڑ میرا کیوں گھڑیا۔ مت جائے علیک سلیک[1] ۳

بلھا کسر نام قصور ہے ، اوتھے مونہوں نہ سکن بول
اوتھے سچے گردن ماریئے ، اوتھے جھوٹھے کرن کلول ۴

بلھیا قصور بے دستور، اوتھے جانا بنیا ضرور
نہ کوئی پن دان ہے ، نہ کوئی لاگ دستور ۵

بلھیا آوندا ساجن ویکھ کے۔ جاندا مول نہ ویکھ
مارے درد فراق دے ، بن بیٹھے باہمن شیخ ۶

اِٹ کھڑکے، دُکڑ وجے ، تتا ہووے چلھا
آن فقیر تے کھا کھا جاون، راضی ہووے بلھا ۷

بلھیا اچھے دِن تو پچھے گئے ، جب ہر سے کیا نہ ہیت[2]
اب پچھتاوا کیا کرے ، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۸

بلھیا کنک[3] کوڈی کامنی، تینوں کہیہ تلوار
آئے تھے نام جپن کو، اور وِچے لیتے مار ۹

کنک کوڈی کامنی ۔ تینوں کہے تلوار
آیا سیں جس بات کو ، بھول گئی وہ بات ۱۰

اُس کا مکھ اِک جوت ہے، گھنگھٹ ہے سنسار
گھنگھٹ میں وہ چھپ گیا ، مکھ پر آنچل ڈار ۱۱

اُن کو مکھ دکھلائے ہے ، جِن سے اُس کی پیت
اُن کو ہی ملتا ہے وہ ، جو اُس کے ہیں میت ۱۲

---

۱ جان پہچان۔ ۲ پیار۔ ۳ کوڈی = دھن، دولت ، کامنی = عورت۔

مُنہ دِکھلاوے اَور چُھپے، چھل بل ہے جگدیس
۱۳ پاس رہے ہر نہ ملے، اِس کو لسوٹے[۱] بیس

نہ خُدا مسیتے لبھدا، نہ خُدا وِچ کعبے
۱۴ نہ خُدا قران کتاباں، نہ خُدا نمازے
نہ خُدا مَیں تیرتھ ڈِٹھا، ایویں پَینڈے جھاگے
بُلّھا شوہ جد مُرشد مِل گیا، چُھٹّے سب تگادے

۱۵ اربعہ عناصر[۲] محل بنائیو، وِچ وڑ بیٹھا آپے
آپے کُڑیاں آپے نبنگر[۳]، آپے بنناہیں ماپے
آپے مریں تے آپے جیویں، آپے کریں سیاپے
بُلّھیا جو کُجھ قُدرت رب دی، آپے آپ سنجاپے[۴]

دھر مسال دھڑوائی[۵] وسدے، ٹھاکر دوارے ٹھگ
۱۶ وِچ مسیت کوسَتیئے[۶] رہندے، عاشق رہن الگ

بُلّھیا غَین غرورت[۷] ساڑ سٹ، تے مان کھوہے وِچ پا
۱۷ تن من دی صُورت گوا، گھر آپ ملے گا آ

بُلّھیا وارے جائیے اُنہاں تُوں، جیہڑے گلّیں دین پرچا
۱۸ سُوئی سلائی دان کرن، تے اہرن لین چُھپا

وارے جائیے اُنہاں دے، جیہڑے مارن گپّ شڑپّ
۱۹ کوڈی لبھی دین چا، تے بُغچہ[۸] گھاؤں گھپّے[۹]

---

[۱] لسوٹے بیس = پکّی بات۔ یقینی یا پکّی بات یہ ہے کہ جس کو اس نے مکھڑا نہ دکھانا ہو، نہیں دکھاتا۔ خواہ وُہ اس کے پاس ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ [۲] اربعہ عناصر = پانچ عناصر، پانچ عناصر یا تتوں سے جسم کا محل بنایا ہے۔ [۳] نبنگر = دُولہا۔ کُڑی = دُلہن۔ لڑکی [۴] سنجاپے = پہچانے [۵] دھڑوائی = ڈاکو۔ لٹیرے [۶] کوستیئے = بُرے کمینے خیالوں والے۔ [۷] غرورت = غرور۔ [۸] بُغچہ = گٹھڑی۔ [۹] گھاؤں گپ = ہضم۔

بُلھیا پرسوں کافر تھی گئیوں ۔ بُت پُوجا کیتی کل ۲۰
اِسیں حیا بیٹھے گھر اپنے ، اوتھے کرن نہ بلیا گل

بھٹھ نمازاں تے چکڑ روزے ، کلمے تے پھر گئی سیاہی
بُلھے نُوں شوہ اندروں ملیا ، بھُلّی پھرے لوکائی ۲۱

بُلھے نُوں لوک متّیں دیندے ، تُوں جا بَوہ وِچ مسیتی
وِچ مسیتاں کی کجھ ہُندا ، جے دِلوں نماز نہ کیتی ۲۲
باہروں پاک کیتے[1] کی ہُندا ، جے اندروں نہ گئی پلیتی
بِن مُرشد کامل بُلھیا ، تیری ایویں گئی عبادت کیتی

بُلھیا ہر مندر میں آئے کے ، کہو لیکھا دیو بتا ۲۳
پڑھے پنڈت پاندھے دُور کیئے ، احمق[2] سے لئے بُلا

وحدت دے دریا دسیندے ، میری وحدت کِت وَل دھائی ۲۴
مُرشد کامل پار لنگھایا ، باجھ تُلّھے[3] سرناہی[4]

بُلھے شاہ چل اوتھے چلیئے ، جتھے سارے ہوون انھے ۲۵
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے ، نہ کوئی سانوں منّے

بُلھیا دھرم سالہ وِچ نہ رہیں ، جتھے مومن بھوگ پوائے
وِچ مسیتاں دھکّے مِلدے ، مُلاں تیوڑی پائے ۲۶
دولتمنداں دنے بُوہیاں اُتے ، چوب دار بہائے
پکڑ دروازہ رب سچے دا ، جتھوں دُکھ دِل دا اُٹھ جائے

---

۱ پاک کئے = صفائی کی۔ پلیتی = غلاظت
۲ احمق = بیوقوف۔ رب کی درگاہ میں اعمال دیکھے جاتے ہیں، علم نہیں۔ ۳ تُلہا = کشتی
۴ سرناہی = مشک : مُرشد نے بغیر کسی وسیلے کے پار کر دیا۔

اپنے تن دی خبر نہیں ، ساجن دی خبر لیاوے کون
نہ ہُوں خاکی، نہ ہُوں آتش ، نہ پانی نہ پَون ۲۷
کُپّے دے وِچ روڑ کھڑکدا ، مُورکھ آکھے بولے کون
بُلھیا سائیں گھٹ گھٹ رَویا ، جیوں آٹے وِچ لُون

۲۸ بُلھے شاہ اوہ کون ہے ، اُتم تیرا یار
اوسے دے ہتھ قُران ہے ، اوسے گل زنّار

بُلھیا جیسی صُورت عین دی، تیسی غین پچھان ۲۹
اِک نقطے دا پھیر ہے ، بھُلّا پھرے جہان

۳۰ بُلھیا کھاہ حرام تے پڑھ شکرانہ ، کر تَوبہ ترک ثوابوں
چھوڑ مسیت تے پکڑ کنارہ ، تیری چھُٹسی جان عذابوں

بُلھیا جے توں غازی بنناایں ، لک بنھ تلوار ۳۱
پہلوں رنگھڑ مار کے ، پچھوں کافر مار

۳۲ بُلھیا سب مزاجی پوڑیاں ، توں حال حقیقت ویکھ
جو کوئی اوتھے پہنچیا چاہے ، بھُل جائے سلام علیک

بُلھیا قاضی راضی رشوتے ، مُلّاں راضی موت ۳۳
عاشق راضی راگ تے ، نہ پرتیت گھٹ ہوت

---

۱ رُوح عناصر (مٹی، آگ، پانی اور ہوا) سے اُوپر ہے۔ ۲ کُپا = چمڑے کا پھولا ہوا چھوٹے مُنہ والا ظرف۔ جسم کے کُپے میں رُوح کا کنکر ہی اصلی چیز ہے، لیکن بے خبر انسان کو اس کا علم نہیں۔ ۳ زنّار = جنیو۔
۴ رب ۔ ۵ انسان۔ ۶ ثواب = پُن نیک کام۔ ترک = چھوڑ دے۔ عذابوں = دکھوں، شریعت چھوڑ کر عشق کی راہ پکڑ۔ ۷ غازی = جہاد کرنے والا۔ ۸ رنگھڑ = چودی۔ کافر نفس۔ یعنی نفس کو مارنے والا ہی سچا غازی ہے۔ ۹ مزاجی = جسمانی حقیقت = اصلیت۔ سلام علیک = مسلمان آپس میں ملتے وقت احترام کے طور پر سلام کہتے ہیں۔ سائیں بلھے شاہ کہتے ہیں کہ حقیقت میں پہنچ چکا انسان دُنیاوی رسموں سے اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ ۱۰ رشوتے = رشوت پر

ٹھاکر دوارے ٹھگ بسیں، بھائی دوارے مسیت
۳۴ ہر کے دوارے بھِکھ[1] بسیں، ہمری ایہہ پرنیت

۳۵ بُلھا پی شراب[2] تے کھاہ کباب، پر بال ہڈاں دی اگ
چوری کر تے بھن گھر رب دا، اُس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

مکے گیاں گل مُکدی ناہیں، جچر دِلوں نہ آپ مُکائیے
گنگا گیاں گل مُکدی ناہیں، بھاویں سو سو غوطے کھائیے
۳۶ گیا گیاں گل مُکدی ناہیں، بھاویں کِنّے پنڈ[3] بھرائیے
بُلھے شاہ گل مُکدی تاہیں، جد میں نوں کھڑیاں لٹائیے

۳۷ آندیاں توں میں صدقڑے ہاں، جو ہیں جاندیاں توں سر وارنی ہاں
مِٹھی پریت انوکھڑی لگ رہی، گھڑی پل نہ یار وسارنی ہاں
کِہے تد تگاوڑے[4] پئے مینوں، اُونساں پاؤندی کانگ اڈارنی ہاں
بُلھا شوہ تے کملی میں ہوئی، سُتّی جاگدی یار پکارنی ہاں

عاشق ہویوں رب دا، ہوئی ملامت لاکھ
۳۸ تینوں "کافر" "کافر" آکھدے، توں "آہو" "آہو" آکھ

۳۹ گل سمجھ لئی تے رولا کیہہ؟
ایہہ رام رحیم تے مولا کیہہ؟

مُلاں نے مشالچی دوہاں اِکو چِت
۴۰ لوکاں کردے چاننا، آپ انھیرے نت

---

[1] بھِکھ = بھکاری - پرنیت = یقین۔ [2] وحدت کی شراب پی اور اپنی خودی کا کباب کھا۔
[3] پکے چاول کا گولا جو پانڈوں کو شرادھ کے موقع پر دیا جاتا ہے۔
[4] نقاضے۔

۴۱ بلھیا ہجرت[1] وِچ اسلام دے، میرا نِت ہے خاص آرام
نِت نِت مَراں تے نِت نِت جیواں، میرا نِت نت کوچ مقام

۴۲ بلھیا عشق سجن نے آ ٹھگے، سانوں کیتوس ڈُوم
اوہ پربھ اساڈا سخی ہے، مَیں سیوا کنوں شُوم[2]

۴۳ بلھیا پینڈے پڑے پریم کے، کِیا پینڈا آواگون
اندھے کو اندھا مِل گیا، راہ بتاوے[3] کون

۴۴ بلھیا مَن منجولا مُنج دا، کِتے گوشے بہہ کے کُٹ
ایہہ خزانہ تینوں عرش دا، توں سنبھل سنبھل کے لُٹ

۴۵ بلھیا جیہری مسلمان دی، ہندو توں قربان
دوہاں توں پانی وار پی، جو کرے بھگوان

۴۶ بلھیا چل سُنیار دے، جِتھے گہنا گھڑیئے لاکھ
صورت آپو آپنی، توں اِکو رُوپا آکھ

۴۷ بلھیا رنگ محلیں جا چڑھیوں، لوکیں پچھّن آکھن خَیر
اساں ایہہ کجھ دُنیا توں ڈِٹّھا، مُنہ[4] کالا تے نیلے پَیر

۱ے ہجرت میں پارسا مسلمان مکّہ کی زیارت کرتے ہیں۔ بلھے شاہ کہتا ہے کہ میری روزانہ زیارت رُوح کو جسم سے نقطۂ سویدا تک پہنچاتا اور وہاں سے واپس لانا ہے۔ ۲ے کنجوس ۳ے اپنے نفس کو مار یعنی قابو میں لا۔ ۴ے ذلالت اور بدنامی۔

باراں ماہ

ہندوستانی صوفی شعراء میں عام رواج رہا ہے۔ کہ وُہ اپنی تصنیفات میں باراں ماہ بھی لکھتے آئے ہیں جو سال کے بارہ مہینوں پر مبنی مسلسل نظم ہوتی ہے۔ قدرت کے پس منظر اِس میں انسان کے مختلف جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اِس میں کچھ اخلاقی اور کچھ رُوحانی اسباق پیش کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر ہر ایک مہینہ ایک انسانی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہر انسانی جسم اس مقصد کیلئے صرف ہونا چاہیئے، جس کے لئے وُہ اُسے ملا ہے۔ یعنی روحانی حصُول پر۔ انسانی جسم ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ جسے فضُول کاموں میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

اِس انتخاب میں دو مہینے لئے گئے ہیں، بہار کا مہینہ اور برسات کا مہینہ۔ بہار کے موسم میں قدرت اپنے پُورے جمال میں درخشاں ہوتی ہے۔ یہ ایک آراستہ دُلہن کی مانند ہے جو سب کا من موہ لیتی ہے۔ لڑکیاں شوخی کی حالت میں ہولی کھیلتی ہیں، جو کہ رنگوں کا تہوار ہے۔ وُہ سب خوشی میں سرشار ہیں۔ لیکن اِس خوشگوار ماحول میں وُہ بیوی جس کا خاوند کسی دُور دراز ملک میں گیا ہُوا ہے، سخت مغموم اور اُداس ہے۔

نظم کا آخری بند قسمت کی غیر مغلوبی کا مظہر ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی تردد سے تقدیر نہیں بدل سکتی۔ اس کے اختتام میں خداوند کریم سے التجا کی گئی ہے کہ وُہ اُسے اپنے ساتھ وصال کی توفیق دے۔

برسات کے مہینے میں ایک ہمہ جائی خوشی کا ماحول پھیلا ہوا ہے۔ اِس نظم میں شاعر اپنے مُرشد عنایت شاہ سے ملاپ کی مُسرت کے گیت گاتا ہے۔ اُس کے ماضی کے تمام دُکھ اب ختم ہو گئے ہیں، اور وُہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ اُس نے اُسے مُرشد کی عظیم نعمت عطا کی ہے۔

ساون سوہے میگھلا۔ گھٹ گھٹ سوہے کرتار ^۱ بادل خوشگوار ہے
ٹھوڑ[۲] ٹھوڑ عنایت بسے۔ پپیہا کرے پُکار ^۲ ہر جگہ

کلام: باراں ماہ

سوہن ملہاراں سارے ساون، دُوتی دُکھ لگے اُٹھ جاون
نینگر[1] کھیڈن کُڑیاں گاون، میں گھر رنگ رنگیلے آون
آساں[2] پنیاں

میریاں آساں رب پُجائیاں، میں تاں اُن سنگ اکھیاں لائیاں
سیّاں دین مُبارک آئیاں، شاہ عنایت آکھاں سائیاں
آساں پنیاں

پھگن پھُولے کھیت جیُوں، بن تن پھُول سنگار
ہر ڈالی پھُلّ پتیاں، گل پھُولن کے ہار
ہوری کھیلن سیّاں پھگن، میرے نین[3] جھلاریں وگن
اوکھے[4] جیوندیاں دے دِن لگن، سینے بان پریم دے لگن
ہوری ہو رہی

جو کجھ روزِ ازل تھیں ہوئی، لِکھی[5] قلم نہ میٹے کوئی
دُکھاں سُولاں دِتّی ڈھوئی، بُلھا شوہ نوں آکھو کوئی
جِس نُوں رو رہی۔

---

[1] نوجوان۔ [2] اُمیدیں بر آئیں۔
[3] آنکھیں دھار کی طرح بہہ رہی ہیں۔ [4] دِن مُشکل سے کٹتے ہیں۔
[5] تقدیر کے لکھے ہوئے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔

کچھ اِن کے بارے میں

آدم : تخلیق میں پہلا انسان، جس سے انسانی نسل کا آغاز ہوا۔
(توریت کا پہلا باب ۲ : ۷)

ابراہیم : یہودی قوم کا پہلا بزرگ، جس سے یہودی قوم شروع ہوئی۔ اسحاق کا والد۔ (توریت کا پہلا باب ۱۱ - ۲۵)

ابن العربی : (۱۱۶۴ - ۱۲۴۰ AD) اِن کا پورا نام شیخ محی الدین ابن العربی تھا۔ ان کا والد ایک مشہور صوفی تھا۔ ان کی پیدائش مرسیہ (ہسپانیہ) میں ہوئی۔ اُنہوں نے صوفیوں کے مشہور مرکز سیول (SAVILLE) میں اسلامی شرع اور مذہبی کُتب کا مطالعہ کیا۔ ان کی تصنیفات کی تعداد دوسو بتائی جاتی ہے۔ اِن میں دو مشہور کتابیں" فتوحات المکیہ " اور" الحکم " ہیں۔ ان کی عمر کا آخری حصّہ دمشق میں گزرا۔

ابواسمٰعیل عبداللہ انصاری : ان کا نام عبداللہ انصاری اور لقب اسمٰعیل تھا، یہ ابو ایوب کے پسر تھے۔ ان کی پیدائش ہرات میں مئی ۱۰۰۶ء میں ہوئی۔ وُہ ہرات اور خراسان میں انصاری فرقہ کے بانی تھے۔ اُن کی وفات ۸۲ سال کی عمر میں ۱۰۸۸ء میں ہوئی۔ ان کا مقبرہ ہرات صوبہ کے گازرگاہ مقام پر واقع ہے۔ ان کو لڑکوں نے پتھراؤ کر کے مار دیا جبکہ وُہ ریاضت میں مشغول تھے۔

ابوسعید فضل اللہ : آپ ابوالخیر کے بیٹے تھے۔ اور ماہنا کے مشہور صوفی تھے۔ اُن کے مُرشد ابوالفضل لقمان تھے۔ آپ نے اُن سے زُہد اور ریاضت کشی

سیکھی اَور ۴۰ سال جنگلوں میں بسر کئے۔ وُہ رباعیاتِ ابوسعید ابوالخیر کے مُصنف ہیں۔ ان کی وفات ۱۰۶۹ء میں چوالیس سال کی عمُر میں ہُوئی۔

الجلی: اُن کا پورا نام عبدالکریم الجلی تھا۔ اِن کی پیدائش ۱۳۶۵ء میں اَور وفات ۱۴۲۸ء میں ہُوئی۔ ان کی مشہور تصنیف "انسان الکامل" ہے۔ جس میں اُنہوں نے وحدت الوجُود کے اصُولوں کی تشریح کی ہے، جیسے کہ ابن العربی نے کی تھی۔ اُنہوں نے قرآن شریف پر ایک مؤثر کتاب لکھی ہے، جِس کی ۱۹ جِلدوں میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پر مباحثہ کیا ہے۔

ارائیں: مُسلمانوں میں ایک ذات ہے، جس کا پیشہ باغبانی، خصُوصاً سبزیاں اُگانا ہے۔ بُلھے شاہ کا مُرشد اِسی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔

ارسطو: پُرانے یُونان کے ایک بہت مشہور فلسفی ہُوئے ہیں۔ یہ ۳۸۴ قبل از مسیح سواجیرہ نئی بستی میں پیدا ہُوئے۔ ان کے والد نیکو میکس شاہی طبیب تھے۔ یہ چھوٹی عمر میں یتیم ہو گئے، اَور سترہ سال کی عمُر میں ایتھنز پہنچ کر افلاطون کے شاگرد بن گئے۔ لگاتار بیس سال اکیڈیمی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعد میں وُہ میکو وڈونیا کے بادشاہ فیلبوس نے اپنے بیٹے سکندر کا اطالیق مقرر کر دیا۔ وُہ باعظمت آٹھ سال فیلبوس کے دربار میں رہے۔ سکندر کے دُنیا کو فتح کرنے کی مہم پر روانہ ہونے کے بعد ارسطو ایتھنز چلے گئے۔ اَور ۱۳ سال تک لائیسیم میں فلسفہ کا پرچار کرتے رہے۔ وُہ ۶۲ برس کی عمُر میں ۳۲۲ قبل مسیح اِس دُنیا سے رحلت فرما گئے۔ ان کی لکھی ہُوئی کتابوں کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار بتائی جاتی ہے۔

اسماعیل: ایک جلیل القدر پیغمبر کا نام۔ آپ حضرت ابراہیم کے بیٹے اَور محمدؐ صاحب کے اجداد میں سے تھے۔ آپ نے اپنے والد سے مِل کر مکہ کی تعمیر کی۔

افلاطون: (۴۲۸ - ۳۴۸ قبل مسیح)۔ اُن کی پیدائش یُونان کے مشہور شہر ایتھنز میں اریٹون کے گھر ہُوئی۔ آپ کا اصلی نام ارسٹو کلز (ARISTO CLES) تھا۔ لیکن چھاتی اور پیشانی کی غیر معمولی چوڑائی کی وجہ سے آپ کا نام پلاٹون (PLATON) یعنی چوڑا چکلا پڑ گیا۔ بیس سال کی عمر میں آپ سقراط کے مُرید بن گئے۔ اور آخری دم تک اُن کی پیروی کی۔ چالیس سال تک آپ نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور بہت سی مشہور کتابیں، مکالموں کی شکل میں لکھیں۔ سقراط کا تمام فلسفہ ہمیں افلاطون کی کتابوں سے ہی ملتا ہے۔ مغربی فلسفیوں میں آپ کا درجہ بہت بلند مانا جاتا ہے۔

بایزید بسطامی: ایک عارف جس کا اصل نام طیفور تھا۔ ایران کے شمال مشرقی شہر بسطام میں پیدا ہوا۔ اور وہیں اس نے ۸۷۷ء میں وفات پائی۔ اس کی یاد میں اس کا مقبرہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس کا دادا پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وہ صُوفی تحریک کے وجد میں آنے والے فرقہ کا بانی تھا۔ یہ اپنی طرزِ سخن کی جُرأت۔ دلیری اور خُدا میں عارفانہ مجذوبیت کے لئے مشہور تھا۔ اور اس کے تصوف کا سلسلہ طیفوریہ کہلاتا ہے۔

بوستاں: شیخ سعدی کی ایک مشہور تصنیف۔

بو علی قلندر: ان کا پُورا نام شیخ شرف الدین بو علی قلندر تھا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ مشکوک ہے، لیکن اُن کی وفات ۱۳۲۴ء میں پانی پت میں ہُوئی۔ ان کی جائے پیدائش عراق میں تھی۔ اُن کے والد کا نام شیخ فخر الدین سالار تھا۔ آپ نے ہندوستان آ کر پانی پت میں رہائش اختیار کی آپ چالیس سال کی عمر تک دُنیاوی علوم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ کا رجُوع رُوحانیت کی طرف ہو گیا، اور آپ ایک بلند پایہ صُوفی فقیر مانے جانے لگے۔ آپ کا کلام فارسی اور پنجابی میں پایا جاتا ہے۔ فارسی کی مشہور تصنیف مثنوی ہے۔ روایت کے مطابق آپ نے ۱۲۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

پانڈو: ہندوستانی رزمیہ تصنیف مہا بھارت میں وُہ جنگجُو بہادر، جن کو کوروکشیتر کی لڑائی میں فتح حاصل ہُوئی۔

پلٹو: ایک انقلابی سنت جو شمالی ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنے عہد کی شرعی رسموں، رواجوں کے خلاف آواز بلند کی، اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف مہم شروع کی۔ اس نے نام مارگ (نام کا راستہ) کی تبلیغ کی۔

پُنّوں: سندھ کے پرانے قصّہ کہانیوں میں پُنّوں سسّی کا عاشق تھا۔ سسّی اور پُنّوں دونوں کے رشتہ دار اِن کے باہمی عشق کے خلاف تھے۔ پُنّوں کے رشتہ داروں نے پُنّوں کو شراب پلا کر بے ہوش کر دیا، اور اُسے رات کے وقت سسّی کے گھر سے اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔

جبرائیل: چار مقرّب فرشتوں میں سے ایک اہم فرشتہ۔ جو انجیل اور قرآن میں خُدا کے پیامبر کا فرض ادا کرتا ہے۔

جلالی: پنجاب کے ہر دلعزیز قصّہ کہانیوں میں جلالی روڈا کی محبُوبہ تھی۔ روڈا کو کسی فقیر نے بتایا تھا، کہ وُہ عشق کا پہلا سبق کسی عورت کے عشق میں پڑ کر حاصل کرے، اُس عشق کے بعد ہی وُہ خُدا سے عشق کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ جس عورت سے اُس نے عشق کیا اس کا نام جلالی تھا۔

جنید بغدادی: یہ ایک مشہُور تارک الدنیا اور زاہد تھے۔ اُن کی پیدائش اور پرورش بغداد میں ہُوئی۔ اور وُہ شافعی فرقہ کے نمایاں ترین مُریدوں میں سے ایک تھے۔ اُنہوں نے تیس بار مکّہ کا حج کیا، اور ہر بار پیدل گئے۔ اُن کی وفات بغداد میں ۹۱۱ء میں ہُوئی۔ ان کا مقبرہ اُن کے مُرشد اور ماموں سری سقتی کے مقبرہ کے پاس ہے۔

جیلانی شیخ حضرت عبد القادر: اِن کے دوسرے نام شیخ جلی، پیر دستگیر اور غوث الاعظم محی الدین بھی ہیں۔ اُن کے نام سے بہت سی کرامات

منسوب ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۰۷۸ء میں جیلان (ایران) میں ہوئی۔ ان کی علمیت، پارسائی اور عظمت کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ آپ کا مقبرہ بغداد میں ہے۔ درویشوں کے سلسلۂ قادریہ کے بانی تھے۔ سائیں بلھے شاہ کا تعلق اسی فرقہ سے تھا۔ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔

چناب: پاکستان کا ایک دریا، جس کو سوہنی ہر رات تیر کر پار کر کے اپنے محبوب مہینوال سے ملنے کے لئے جایا کرتی تھی۔

چوچک: ہیر کا والد۔

حافظ خواجہ: (۱۳۲۵-۱۳۹۰ء) آپ کا پورا نام شمس الدین محمد تھا، اور آپ کے والد کا نام بہاؤالدین تھا۔ آپ کی پیدائش شیراز میں ہوئی۔ قران شریف زبانی یاد کرنے کی وجہ سے آپ کا تخلص حافظ پڑ گیا آپکو فارسی غزل کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد سید قاسم انوار نے آپ کی ۵۶۹ غزلیات کو اکٹھا کر کے "دیوانِ حافظ" کے نام سے شائع کیا۔ آپ کی کچھ غزلیں تو لفظی اعتبار سے سمجھی جا سکتی ہیں، لیکن بیشتر غزلیں صوفیانہ اور رمزیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان کو اسی ڈھنگ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ان غزلوں کی زبان کو "لسان الغیب" کہا گیا ہے۔ آپ کی وفات شیراز میں ہوئی، اور وہیں آپ کا مقبرہ ہے۔

حسن: حضرت محمدؐ صاحب کے دو نواساؤں اور حضرت علی کے صاحبزادوں میں سے ایک کا نام، جو کربلا کی جنگ میں پیاس کی وجہ سے شہید ہو گئے۔

حسین: حضرت محمدؐ صاحب کے نواسے اور حسن کے چھوٹے بھائی جنہوں نے میدانِ کربلا میں شہادت پائی۔

حوا: تخلیقِ کائنات میں پہلی عورت اور آدم کی بیوی۔
(توریت کا پہلا باب ۳: ۲۰)

خِضر: خواجہ خِضر، جنہوں نے نہ صِرف آبِ حیات پایا بلکہ پی بھی لیا، جس کے باعث وُہ لافانی ہو گئے۔ روایت کے مطابق خواجہ خِضر راہ سے بھٹکے ہُوئے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

دارا شکوہ: یہ ۱۶۱۵ء میں پیدا ہُوئے اور ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب کے حُکم سے قتل کر دیئے گئے۔ یہ شہنشاہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے، الٰہ آباد، لاہور اور گجرات کے صُوبہ دار تھے۔ شاہجہان اُن کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن اورنگزیب نے جبرًا تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور دارا شکوہ کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کرا دیا۔ دارا شکوہ کی تصوّف اور توحید میں گہری دلچسپی تھی۔ وقت کے مشہور فقیروں اور صُوفیوں مثلاً میاں میر، سرمد، بابا لال داس اور گوردوارجن دیو کے ساتھ آپ کا اچھا میل ملاپ تھا۔ آپ کی مشہور تصانیف "سفینۃ الاولیا"، "رسالۂ حق نما" اور "اکبرِ اعظم" ہیں۔

ذوالنون مصری: ابوالفیض ثوبان بن ابراہیم المصری ۷۹۶ء میں اخمیم (مصر) میں پیدا ہُوئے، علمِ کیمیا اور سیمیا میں مُہارت حاصل کی، اور یُونانی طرزِ علاج کا مطالعہ کیا، جس سے آپ بہت متاثر ہُوئے۔ اِسی سلسلہ میں آپ نے عرب اور سیریا کی سیاحت کی۔ آپ پر عوام کو دین سے گمراہ کرنے کا الزام عائد کر کے گرفتار کیا گیا۔ وہاں کے خلیفہ نے آپ کو الزام سے بری قرار دے کر واپس بغداد بھیج دیا۔ آپ نے متنازعہ صُوفی خیالات، احوال، مقامات، جیسے حیرت، وجد وغیرہ کا انکشاف کیا۔ آپ پہلے فقیر تھے جنہوں نے معرفت کی تعلیم دی۔

رابعہ مصری: ان کی پیدائش کا کچھ پتہ نہیں۔ اور اُن کی وفات کی بابت بھی اختلاف رائے ہے۔ ان کا سنِ وفات ۷۵۲ء یا ۸۰۱ء مانا جاتا ہے۔ وُہ ایک مُفلس گھر میں پیدا ہُوئیں۔ اُن کے والد کی وفات کے بعد اُنہیں چھ درم میں غلام کے

طور پہ بیچ دیا گیا۔ اُن کے خدا کے لئے انتہائی عشق اور رُوحانی ریاضت کے باعث اُنھیں اسلامی تواریخ میں ایک نمایاں درجہ دیا جاتا ہے۔ اُنھیں بہت سے رُوحانی تجربات ہوئے۔ جن کا ذکر فریدالدین عطار نے اپنی کُتب "مصیبت نامہ" اور "الہٰی نامہ" میں کیا ہے۔ اُنہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اُن کی جھونپڑی کے پاس کئی جنگلی جانور رہتے تھے۔ اور اُن سے مانوس تھے۔ جب سے اُنھیں خدا کا دیدار ہُوا، اُنہوں نے دُنیا اور اس کے لوگوں سے مُنہ موڑ لیا۔

رانجھا: پنجاب کے پُرانے قصے کہانیوں میں رانجھا ہیر کا عاشق ہے۔ عشق میں ہیر سے ملنے کی انتہائی تمنا میں رانجھے نے جوگی کا بھیس اختیار کیا۔ جب کہ ہیر کی اس کی مرضی کے خلاف سیدہ سے شادی ہو چکی تھی۔

رامائن: ہندوستان کی مشہور رزمیہ تصنیف جس میں بھگوان رام کی دس سروں والے راکشش حکمران راون پر فتح کا بیان ہے۔

رام: مشہور ہندوستانی تصنیف رامائن کا مُقدم کردار۔ بھگوان رام نے لنکا کے راکشش حکمران راون کے خلاف جنگ میں فتح حاصل کی۔

راون: ہندوستان کی مشہور تصنیف رامائن میں راون وُہ فاسد اداکار تھا۔ جس کا رجحان شیطانی اعمال کی طرف تھا۔ وُہ لنکا کا حُکمران تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دس سر تھے۔

رابعہ: ایک ہندوستانی مُسلم وَلی۔

روڈا: راجستھان کے پُرانے قصہ کہانیوں میں روڈا خُدا کا ایک سچا عاشق تھا۔ اس کو کسی پارسا بزرگ نے کہا، کہ عشق کا پہلا سبق اُسے کسی عورت سے عشق کے ذریعہ لینا چاہیئے۔ اس کے بعد روڈا ایک لڑکی جس کا نام جلالی تھا، پر عاشق ہو گیا۔ جلالی کے عزیزو اقارب نے جو اس عشق کے سخت خلاف تھے، اس کو قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

رومی جلال الدین: ایران کا سب سے مشہور صوفی شاعر، جس کی پیدائش تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس کی تصوفانہ تصنیف مثنوی مولوی معنوی جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے کا ترجمہ دُنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔

زکریا: الزبیتھ کا خاوند اور یحییٰ کا والد۔
انجیل : لیُوک (LUKE) ۱ : ۵)

زلیخا: فرعون کے ایک اعلیٰ افسر کستفیر (POLIPHAR) کی بیوی تھی — وُہ یوسف پر، جو اُس کے گھر میں ایک غلام تھا، عاشق ہو گئی۔ اس نے یُوسف کو اپنی نفسانی ہوس کیلئے ورغلانا چاہا، لیکن یُوسف اپنی پاکدامنی پر قائم رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد یُوسف کو قید کر دیا گیا کیونکہ زلیخا نے اس پر بد چلنی کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اِس سے پہلے زلیخا کو ایک خواب آیا تھا، جس میں وُہ یوسف کے بے نظیر حُسن کو دیکھ کر اس کے عشق میں مُبتلا ہو گئی تھی۔ (دیکھو، "یوسف اور زُلیخا" مصنفہ :۔ جامی)

سار بچن: وُہ مقدس کتاب جو آگرہ کے سیٹھ شِو دیال سنگھ نے لکھی۔ وُہ رادھا سوامی مَت کے بانی تھے، اور اُن کو عام طور پر سوامی جی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب نظم اور نثر دونوں میں لکھی گئی ہے۔

سَرمد: آرمینیا کا ایک مستانہ فقیر جو ہندوستان میں مقیم ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وُہ رسموں رواجوں سے مُبرّا تھا۔ اور دہلی کی گلیوں میں برہنہ گھوما کرتا تھا وُہ اپنے آزاد مذہبی خیالات کی وجہ سے شاہ عالمگیر کے ہاتھوں ۱۶۶۱ء میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کا مقبرہ دہلی کی جامع مسجد کے نزدیک ہے۔

سَسّی: سندھ کے پرانے قصہ کہانیوں میں سسّی پُنّوں کی محبوبہ تھی۔ رات کے وقت پُنّوں کے رشتہ داروں نے اس کو شراب پلا کر بے ہوش کر دیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ سسّی جو اس کے پاس ہی سوئی ہوئی تھی، جب جاگی، تو اُسے گم پایا، وُہ

اُس کی تلاش میں سِندھ کے ریگستان میں نکل پڑی، اور اُسے وہاں نہ پا کر صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اور وہیں جان دے دی۔

سعدی شیخ: (۱۱۷۵ء-۱۲۹۱ء) اُن کی پیدائش شیراز میں ہوئی۔ ان کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اُنہوں نے چودہ بار مکّہ کا حج کیا۔ آپ شیخ عبدالقادر جیلانی کے مُریدتھے۔ ان کی مشہور تصنیفات گُلستان اور بوستان ہیں۔ جن میں حکایات درج ہیں۔ اُنہوں نے کئی قصیدے، غزلیں اور سانیٹ (SONNENTS) بھی لکھے ہیں۔

سُلطان باہُو: (۱۶۲۹ء-۱۶۹۰ء) آپ کی پیدائش آوان ضلع جھنگ (پاکستان) میں ہُوئی۔ آپ سروری قادری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی جا کر آپ سید عبدالرحمٰن کے مُرید بنے۔ اِس فرقہ کے بانی حضرت عبدالقادر جیلانی تھے۔ اُنہوں نے عربی اور فارسی میں تقریباً ۱۴۰ کتابیں لکھیں۔ پنجابی میں آپ کا کلام "ابیاتِ باہُو" کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی کتاب کی وجہ سے آپ پنجاب اور پنجابی کے جاننے والوں میں ہر دلعزیز ہیں۔

سُلیمان: دسویں صدی قبل مسیح میں اسرائیل کا ایک بادشاہ، جو کہ شاہ داؤد کا بیٹا تھا۔ سُلیمان اپنی دولت اور دانش کے لئے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ وُہ انجیل کے تین بابوں کا مشہور مُصنّف تھا۔

سنائی شیخ: اِن کو حکیم سنائی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ غزنی کے رہنے والے تھے۔ اور ایک مشہور شاعر تھے۔ اُن کی کئی منظوم تصنیفات ہیں۔ اُن کی آخری کتاب حدیقہ یا حدیقۃ الحقائق کہلاتی ہے۔ یہ ایک نہایت خُوبصورت نظم خُدا کی وحدت اور دیگر رُوحانی موضوعات پر مبنی ہے۔ اس کے تیس ہزار شعر ہیں۔ یہ اُن کی آخری کتاب ہے، جو کہ ۱۱۳۱ء میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ وُہ ایک چھوٹی سی کتاب جس کا نام "رموز الانبیا و کنوز الاولیا"، جس میں ۲۰۰ شعر ہیں، اور ایک دیوان کے

سُنّی: اسلام کا مقدم اکثریتی فرقہ۔ یہ اسلام کی مروجہ روایات اور پہلے چار خلیفوں کو مانتا ہے۔ کہ جو حضرت محمدؐ صاحب کے جائز جانشین تھے۔

سہروردی: (۱۱۵۳ - ۱۱۹۳ء) آپ کا پُورا نام شہاب الدین یحییٰ ابنِ حباس، ابن امیرک سہروردی تھا۔ آپ سلسلۂ سہروردیہ کے بانی تھے۔ آپ کا خطاب شیخ الاشراق تھا، آپ کو 'مقتول' کہتے ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف 'حکمت الاشراق' ہے۔

سوہنی: پنجاب کے پرانے قِصّہ کہانیوں میں مہینوال کی محبُوبہ تھی۔ وُہ دریائے چناب میں ڈُوب کر مر گئی، جبکہ وُہ اپنے محبُوب سے ملنے کے لئے دریا کے پار جا رہی تھی۔ وُہ ایک کچے گھڑے کے اوپر دریا پار کر رہی تھی، کہ گھڑا ٹوٹ گیا۔ دریا کی خوفناک لہریں سوہنی کا دریا پار کرنے کا ارادہ نہ بدل سکیں۔ حالانکہ وُہ جانتی تھی، کہ وُہ کچے گھڑے کے سہارے اپنی منزلِ مقصُود پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔

سیال: وُہ ذات جس سے ہیر کے باپ کا تعلق تھا۔

شاہ شرف: یہ ایک ہندوستانی مسلمان فقیر تھے۔ ان کا پُورا نام حضرت بُو علی شاہ قلندر تھا۔ اور یہ پانی پت (ہریانہ) میں مقیم تھے۔ ان کا مقبرہ بھی وہیں ہے۔

شاہ مدار: مداریا قبیلہ کے فقیروں کا پیر، جس کی قبر کانپور (صوبجاتِ متحدہ) کے نزدیک ہے۔

شاہ نیاز: ۱۱۷۳ ہجری میں بمقام سرہند (پنجاب) میں پیدا ہُوئے۔ آپ حضرت شاہ فخرالدین کے مُرید تھے۔ مُرشد کے حُکم سے بریلی میں سکونت اختیار کی۔ جہاں متلاشیانِ حق آپ کی صحبت اور بزرگی سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آپ کے معتقدوں میں کابل، قندھار، شیراز اور بدخشاں کے لوگ بھی شامل تھے۔ آپ کے کلام میں "ہمہ اوست" کا مُوضوعِ سخن جو صُوفیانہ شاعری کی جان ہے پیش پیش ہے۔

شمس تبریز: یہ ایران کے تبریز شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ اَور مولانا جلال الدین رُومی جو کہ ایران کے سب سے مشہور صُوفی شاعر ہوئے ہیں، کے مُرشد تھے۔ شمس تبریز کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ کیونکہ آپ شرعی رسموں رواجوں کے خلاف تھے۔

شیعا: یہ اسلام کا مقدم اقلیتی فرقہ ہے، جو حضرت علی کے پیروکار ہیں۔ حضرت علی حضرت محمدؐ صاحب کے نواسے تھے۔ شیعاؤں کا اعتقاد ہے کہ حضرت علی ہی حضرت محمدؐ صاحب کے جائز جانشیں تھے۔ لہٰذا حضرت علی کے وارث ہی پیغمبر کے صحیح وارث ہیں۔ اُنہوں نے باقی خلیفاؤں اَور سُنّی قانونی اَور سیاسی اداروں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

شیریں: فرہاد کی محبوبہ اَور خسرو پرویز بادشاہ ایران کی ملکہ۔ بادشاہ نے فرہاد سے وعدہ کیا، کہ اگر وُہ پہاڑ کاٹ کر اُس میں سے نہر نکال کر وادی کے دُوسری طرف لے آئے تو اُسے شیریں انعام کے طور پہ دے دی جائے گی۔ جب یہ مہم مکمل ہونے کے بالکل قریب تھی تو بادشاہ نے فرہاد کو جھوٹا پیغام بھیج دیا کہ شیریں مرگئی ہے۔ یہ سُنتے ہی فرہاد نے اُسی تیشہ کے ساتھ جس سے وُہ کام کر رہا تھا، اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

صابر: کہا جاتا ہے کہ خُدا نے صابر کو سخت امتحان میں ڈال کر دیکھنا چاہا کہ اس کا خُدا سے عشق کس حد تک مستقل اَور پائدار ہے۔ اس امتحان میں اُس کو نہ صرف اپنی تمام جائداد سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بلکہ اس کو اپنی تمام اولاد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ جو ایک دیوار کے گرنے سے مر گئے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہُوئے بھی اس نے اپنے صدق اَور ایمان میں لغزش نہ آنے دی۔ وُہ خدا کی عبادت اُسی وفاداری اَور تصدق سے کرتا رہا۔ حالانکہ وُہ ایک غلیظ بیماری میں مُبتلا ہو چکا تھا۔ اُس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے جس سے کہ اس کی جلد سے ایسی تیز بدبُو آتی تھی، کہ کوئی اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ شیطان نے اس کی بیوی کو ورغلایا کہ

کہ اس کو سب کچھ واپس مِل جائے گا۔ اگر وُہ خدُا کی بندگی چھوڑ دے، لیکن صابر ثابت قدم رہا، اور اُس نے صاف انکار کر دیا۔

صاحباں: پنجاب کے پُرانے قِصّہ کہانیوں میں صاحباں مرزا کی محبُوبہ تھی۔ وُہ دونوں گھر سے بھاگ نکلے تھے، لیکن صاحباں کے بھائیوں نے اُن کا پیچھا کر کے مرزا کو قتل کر دیا۔

عبداللہ : حضرت محمدؐ صاحب کے والد ماجد۔

عزرائیل: اسلامی روایت کے مطابق نکالا (FALLEN) ہُوا فرشتہ۔ اِس کا اخذ یہودی انجیل سے ہے۔ اسلام میں اس کو ہاروت اور ماروت سے بھی نسبت دی گئی ہے، بلکہ اس کو ابلیس کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

عطّار، فریدالدین، شیخ: (۱۱۱۹ء—۱۲۳۰): آپ کی پیدائش نیشاپور کے گاؤں شادیاخ میں ہُوئی۔ آپ کا پیشہ عطر بیچنا تھا جس کی وجہ سے آپ کا نام عطّار پڑ گیا۔ دُنیا کو ترک کر کے آپ شیخ مجد الدّین بغدادی کے مُرید بن گئے۔ آپ کی سب سے مشہور تصنیف تذکرۃ الاولیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے چالیس ہزار اشعار کا ایک دیوان لکھا ہے۔ اِن کی ایک اور مشہُور کتاب کا نام "منطق الطیر" ہے۔ جس میں بہت سی صوفیانہ رمزیں نہاں ہیں۔

علی الہجویری: سیّد علی مخدُوم ہجویری غزنی کے رہنے والے تھے۔ شیخ ابوالحسن ختلی کے مُرید تھے۔ مُرشد کی ہدایت سے لاہور آئے اور تعلیم و تلقین میں مصرُوف ہو گئے۔ آپ داتا گنج بخش کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف کا نام "کشف المحجوب" ہے۔

عنایت شاہ : سائیں بُلھے شاہ کا مُرشد۔

غازی : ایک مجاہد جو کافروں کے خلاف کامیاب جنگ لڑتا ہے۔

فرعون : قدیم مصر کا ایک جابر حکمران، جس نے نمرود کی طرح اپنے آپ کو خدا ہونے کا اعلان کیا۔

فرہاد : فرہاد شہنشاہ ایران خسروِ پرویز کی ملکہ پر عاشق ہوگیا۔ بادشاہ نے فرہاد سے وعدہ کیا کہ اگر وہ پہاڑ کو کاٹ کر پانی کی نہر اس کے دوسری طرف لے آئے، تو اس کے عوض اسے شیریں انعام میں دے دی جائے گی۔ جب فرہاد اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا تھا، تو خسروِ پرویز نے اِس ڈر سے کہ اب وہ شیریں کو کھو بیٹھے گا، فرہاد کو شیریں کی موت کی غلط خبر بھیج دی۔ یہ المناک خبر سُن کر فرہاد نے اُسی تیشہ سے جس سے وہ کام کر رہا تھا، اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔

فرید شکر گنج حضرت : (۱۱۷۳ء - ۱۲۶۵ء) آپ کی پیدائش کھوتوال (موجودہ نام چاولی مشائخ، ضلع ملتان میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ جلال الدین سلیمان تھا۔ آپ نے خدا کی تلاش میں سخت ریاضت کی۔ آخر میں دِلی کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے رُوحانی روشنی حاصل کی۔ ان کی وفات اجودھن (موجودہ پاکپتن) میں ہوئی۔ حضرت نظام الدین اولیا ان کے مُرید تھے۔ اور اُن کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔

قارون : ایک مشہور کنجوس بادشاہ۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کے پاس دولت کے چالیس خزانے تھے۔ جس کی کنجیاں ہی کئی اُونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔

قصور : پاکستان کے صوبہ پنجاب کا ایک شہر۔ سائیں بُلھے شاہ اِسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔

کُنبھ کرن : ہندوستانی مشہور رزمیہ تصنیف رامائن میں ایک کردار۔ کہا جاتا ہے کہ وُہ مُسلسل چھ مہینے سوتا تھا۔ وُہ راوَن کا چھوٹا بھائی تھا۔

کورو : مہابھارت کی جنگ میں پانڈووں کے مقابلہ میں ہارا ہوا فریق۔

کوہِ طُور : مصر میں جزیرہ نما سینائی کے جنوب میں ایک پہاڑ کا نام۔ حضرت موسیٰ کو خُدا کے دیدار کا اشتیاق ہوا۔ خُدا کے نور کا جلوہ کوہِ طور پر ظہور میں آیا۔ اور وُہ جل کر راکھ ہو گیا۔ مُوسیٰ سخت پشیمان ہُوا، اور مومنوں میں سب سے پہلے ایمان لایا۔ (دیکھو: سورۃ سوم ۱۴۲ - ۱۴۵ قُرآن میں)

کھیڑے : وُہ ذات جس میں رانجھے کی محبُوبہ ہیر کو اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر مجبُور کیا گیا۔

گُلستاں : شیخ سعدی کی فارسی میں ایک مشہُور تصنیف۔

گنگا : ہندوستان کا سب سے متبرک دریا۔

گوپیاں : گوالنیں جن کے ساتھ بھگوان کرشن 'راس لیلا' کرتے تھے۔

لُقمان : انجیل اور قُران میں لقمان کا ذکر آتا ہے۔ لُقمان مشہورِ عالم فلسفی ہُوا ہے۔ جس کی تیس ہزار کہاوتیں اخلاقی اسباق سے پُر ہیں۔ کئی عُلما کا خیال ہے، کہ یہ حضرت ابراہیم کا بھتیجہ تھا۔ کئی عالم اس کو حضرت داؤد کا ہمعصر خیال کرتے ہیں، کئی کہتے ہیں، کہ وُہ افریقہ کا ایک غلام تھا۔ کئی اس کو درزی یا بڑھئی بتاتے ہیں۔ تاہم یہ سب مانتے ہیں، کہ وُہ ایک بلند پائے کا منطقی اور دانا شخص تھا۔ یورپ کے علماء کہتے ہیں، کہ لُقمان الیسپ (AESOP) کا ہی دُوسرا نام تھا، جس کی کہانیاں مشہُور ہیں۔

لنکا : آج کل اسے سری لنکا کہا جاتا ہے۔ بُلھے شاہ کی کچھ کافیوں میں لنکا انسانی جسم کی علامت ہے۔

لیلیٰ : مجنوں کی محبوبہ تھی۔ مجنوں کا اصلی نام قیس تھا۔ لیلیٰ کا باپ اُن کے باہمی عشق کے سخت خلاف تھا۔ وُہ چاہتا تھا، کہ لیلیٰ کی شادی کسی امیر اور اعلیٰ رُتبہ والے آدمی کے ساتھ کی جائے۔

مجنُوں : لیلیٰ کا عاشق۔ اُس کا اصلی نام قیس تھا۔ لیلیٰ کے عشق میں وُہ پاگل ہو گیا۔

اِسی جنُون کی وجہ سے اس کا نام مجنُوں پڑ گیا۔ اس کی اذیت کا علاج آخر مَوت سے ہُوا۔ اُس کی وفادار محبُوبہ اُس کی وفات کے رنج کو برداشت نہ کرتے ہُوئے جلد ہی دَم توڑ گئی۔

مرزا: پنجابی قِصّہ کہانیوں میں مرزا صاحباں کا عاشق تھا۔ وُہ دونوں چھُپ کر گھر سے بھاگ نِکلے۔ لیکن مرزا کو صاحباں کے بھائیوں نے پیچھا کر کے آ گھیرا اور اس کو قتل کر دیا۔

ملکی: ہیر رانجھے کے قِصّہ میں ہیر کی ماں۔

مُعین اُلدین چشتی، خواجہ:- (۱۱۴۱ء - ۱۲۳۶ء) آپ کے والد کا نام غیاث الدین حسَن تھا۔ آپ کی پیدائش سیستان اور تربیت خراسان میں ہُوئی۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری تیس سَال اجمیر میں بسر کئے۔ یہاں آپ کا شاندار مقبرہ ہے، جہاں لوگ ہر سَال عُرس پر کثیر تعداد میں مختلف ممالک سے شرکت کرنے آتے ہیں۔ آپ نیشا پور کے خواجہ عثمان ہروانی کے مُرید تھے، جنہوں نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ عوام آپ کے تئیں خواجہ غریب نواز کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

منصُور الحلاج: اسلامی تصوّف میں یہ سب سے متنازعہ کردار ہے، جِس کے بارے میں عُلما میں مختلف رائیں پائی جاتی ہے۔ وُہ ایران کے صُوبہ فارس میں ۸۵۸ء پیدا ہُوا۔ وُہ بہت سے مُلکوں میں گھُوما، جن میں ہندوستان بھی ایک تھا۔ آخر کار وُہ بغداد میں مُقیم ہو گیا۔ اس کے دلیرانہ قول جن میں خدُا سے وصال کا ذکر اور "انا الحق" کا نعرہ شامل ہیں، اس کی موت کا باعث بنے۔ اس کو بڑی بے رحمی کے ساتھ ۲۸ مارچ ۹۱۲ء کو شہید کر دیا گیا۔

مُوسیٰ حضرت: (۱۰۸۰ - ۱۲۰۰ قبل مسیح) آپ اسرائیلی قوم سے تعلق رکھتے تھے، عِمران کے بیٹے اور یہودیوں کے پیغمبر تھے۔ اِن کی پیدائش مصر میں ہُوئی۔

مصر کے بادشاہ فرعون نے ان کو قتل کروانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ حضرت موسےٰ کو کوہِ طور پر خدا کا دیدار ہوا۔ اور روایت کے مطابق کوہِ طور خدا کے جلال کی تاب نہ لاتے ہوئے جل گیا۔ توریت کو ظہور میں لانے والے پیغمبر حضرت موسیٰ ہی ہیں۔ انجیل میں جو دس حکم لکھے گئے ہیں۔ وہ پہلی بار حضرت موسیٰ پر ہی ظاہر ہوئے تھے۔

مہابھارت: ہندوستان کی مشہور رزمیہ تصنیف جس میں پانڈوؤں نے بھگوان کرشن کی مدد سے کوروؤں کے خلاف جنگ میں فتح پائی۔

مہینوال: پنجاب کے پرانے قصّہ کہانیوں میں مہینوال سوہنی کا عاشق تھا۔ سوہنی دریائے چناب کو دُور کرتے وقت ڈوب گئی تھی، جبکہ وُہ اپنے محبوب کو دوسرے کنارے ملنے جارہی تھی۔ وُہ گھڑا جس کے اُوپر سوہنی تیر رہی تھی، کچا تھا۔ اور وُہ جانتی تھی کہ یہ گھڑا کچا ہے۔

میاں میر: اُن کی پیدائش سید اظہر عباس رضوی کے مطابق ۳۲-۱۵۳۱ء میں اور وفات ۱۶۳۵ء میں ہوئی۔ آپ قادری فرقہ اور خلیفہ عمرؓ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش سیستان میں ہوئی آپ نے اپنی عمرؓ کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزارا۔ اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ آپ کا مقبرہ ہاشم پور (لاہور) کے نزدیک ہے۔ آپ حبس دم کے شغل میں رجوع رکھتے تھے۔ گورو گھر کے ساتھ آپ کا گہرا رابطہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گورو رامداس نے دربار صاحب امرتسر کا سنگِ بنیاد آپ سے رکھوایا تھا۔

نظام الدین اولیا حضرت: (۱۲۳۶ء - ۱۳۲۵ء) آپ کی پیدائش بدایوں (یو۔پی) میں ہوئی۔ آپ کے بزرگ بخارہ سے آئے تھے۔ آپ کا اصلی نام سید محمد تھا اور اُن کے والد کا نام سید احمد تھا جن کی وفات آپ کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی نہایت افلاس میں گزری۔ آپ نے بابا فرید سے روشنی حاصل

کی، اور وُہی روشنی اپنے مقدم مُرید امیر خسرو کو دی۔ آپ کا مقبرہ دِلّی میں ہے جہاں ہر سال عُرس منایا جاتا ہے۔

نمرود: اہلِ اسلام کے مطابق نمرود کنعان کا بیٹا تھا۔ جو خُدائی کا مُدعی بنا جس کی سزا کے طور پر ایک مچھر اُس کے دماغ میں گھُس گیا جس سے اُس کی موت ہوگئی۔ (دیکھیے قرآن سورۃ دوئم: ۲۶۰ اور سورۃ اکیسواں ۶۸-۶۹) عیسائیوں کے مطابق نمرود ایک عظیم شکاری تھا۔ اور حضرت نوح کا پڑپوتا تھا (دیکھو توریت کا پہلا باب ۱۰: ۸-۱۰)

نوح: وُہ ایک سردارِ قبیلہ تھا، جسے خُدا نے اُس کشتی کو بنانے کے لئے منتخب کیا، جس میں اُن کا کُنبہ اور کئی جانور طوفان سے بچا لئے گئے۔ (توریت کا پہلا باب ۹-۵)

نوشاہ گنج بخش: وُہ پنجاب کے کھکھر فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے جانشین نوشاہیا کہلاتے تھے۔ نوشاہ کی اَب تک لاہور کے گرد و نواح میں یاد تازہ ہے۔ اُن کے والد کا نام حاجی علاؤالدّین تھا، جنہوں نے سات بار مکہ کی زیارت کی۔ ۷۰ برس کی عمر میں نوشاہ نے دُنیا ترک کر کے جنگل میں رہنا شروع کردیا۔ چھ برس تک اُنہوں نے دریائے راوی کے کنارے سخت ریاضت کی اور ساتھ والے گاؤں نوشہرہ کی مسجد میں قران شریف کی تلاوت کرتے رہے۔ اِس کے بعد وُہ بھیلوال گاؤں میں قیام پذیر ہُوئے اور شاہ سلیمان کے مُرید بن گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کی وفات ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ ہُوئی۔

ہابیل: حضرت آدمؑ کا دُوسرا بیٹا، جسے اُس کے چھوٹے بھائی قابیل نے اپنی بہن اقلیما کے حسد میں مار ڈالا تھا۔ (توریت۔ باب پہلا ۴: ۲)

ہرناکش: ہندوستانی دیوتاؤں کے تذکروں سے متعلق ایک اہم کردار۔ ہرناکش جو خُدا کے مشہور بھگت پرہلاد کا باپ تھا، نے اپنے آپ کو خدا ہونے کا دعوےٰ کیا، اُسی طرح جیسے نمرود اور فرعون نے کیا تھا۔ ہرناکش کو ایک مردِ خُدا سے بیر پڑا تھا

کہ وُہ نہ رات اَور نہ ہی دِن کے وقت مرے گا، وُہ نہ زمین پر مرے گا نہ ہی آسمان میں ہلاک ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ نہ اندر اَور نہ ہی باہر وفات پائے گا۔ وُہ نہ کِسی انسان اَور نہ ہی حیوان کے ہاتھوں ختم ہو گا۔ یہ تمام بر حاصل کر کے اس کو یقین ہو گیا، کہ وُہ خود مالکِ کُل ہے۔ اِس لئے اُس نے اپنی سلطنت میں حکم جاری کر دیا، کہ سب اُس کی عبادت کریں، نہ کہ خُدا کی۔ جب اُس کے فرزند پرہلاد نے اِس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا، تو اس کو سزا کے طور پر لوہے کے تپتے ہُوئے ستون کے ساتھ لپٹنے کا فرمان ہُوا۔ کہا جاتا ہے کہ ستُون پرہلاد کے چھُوتے ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ جس سے ہرناکش کے غُصّے کی حد نہ رہی۔ اس دیوانگی کی حالت میں اس نے ستون کو ایک گُرز دے مارا۔ جس کی چوٹ سے ایک عجیب جانور نمودار ہُوا اس کا سر شیر کا تھا۔ اَور جسم انسان کا۔ اس کا نام نرسنگھ تھا۔ اس نے ہرناکش کو اپنے چنگل میں لے لیا۔ اَور زانو کے نیچے رکھ کر اس کے محل کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ وُہ شام کا ایسا وقت تھا، جب نہ دِن تھا نہ رات۔ ہرناکش کو ہلاک کرنے سے پہلے نرسنگھ نے اُس پر یہ ظاہر کیا۔ کہ اُس کی مَوت نہ اندر ہو رہی ہے نہ باہر، نہ زمین پر اَور نہ ہی آسمان میں۔ نہ دِن کے وقت اَور نہ ہی رات کو۔ اَور نہ کسی انسان کے ہاتھوں اَور نہ ہی کِسی حیوان کے ذریعہ۔

ہزارہ یا تخت ہزارہ: وُہ گاؤں جہاں رانجھے کی پیدائش ہُوئی۔

ہنُومان: ہندوؤں کا ایک دیوتا، جس کی شکل بندر سے ملتی ہے، اَور جس کا رامائن میں ایک اہم رول ہے۔ یہ بھگوان رام کے لئے اپنی وفاداری اَور عقیدت کے لئے مشہُور ہے۔

ہِیر: پنجاب کے ہر دلعزیز قصّہ کہانیوں میں رانجھے کی محبُوبہ۔ اُس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف سیّدہ سے کر دی گئی۔ اُس سے وُہ ہمیشہ کتراتی تھی۔ اَور رانجھے

کے ساتھ ملاپ کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ آخر میں وُہ رانجھے سے ملی جب وُہ جوگی کے بھیس میں اُسے ملنے آیا۔

یزید: دمشق کا خلیفہ۔ حضرت معاویہ کا بیٹا جس نے خلافت کی آڑ میں امام حسینؑ کو کو میدانِ کربلا میں بھوکے پیاسے شہید کرادیا تھا۔

یُوسف: یُوسف کا باپ یعقوب تھا۔ اور پڑدادا ابراہیم، جو کہ فلسطین میں رہتے تھے۔ یعقوب کے بارہ بیٹے تھے۔ یُوسف اُن میں گیارھواں بیٹا تھا۔ یوسف اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ وُہ اپنے باپ کا چہیتا بیٹا تھا جس کی وجہ سے اُس کے سوتیلے بھائی اُس سے حسد کرتے تھے۔ وہ اس کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن سَب سے بڑے بھائی ریئوبن کے کہنے پر اُنہوں نے اُسے ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ کچھ عربی سوداگر جو مڈئین (MIDIAN) سے مصر کو آرہے تھے، نے یُوسف کو گڑھے سے نکال کر اسماعیلیوں کے ہاتھ چاندی کے بیس سکّوں کے عوض بیچ دیا۔ وُہ اِسے مصر میں لے آئے۔ جہاں اُسے دوبارہ کستیفر، جو فرعون کے دربار میں ایک اعلیٰ افسر تھا، کے پاس بیچ دیا گیا۔ زلیخا جو کستیفر کی بیوی تھی، یُوسف پر عاشق ہو گئی۔ اُس نے یوسف کو ورغلانا چاہا، مگر وُہ اپنے ایمان پر قائم رہا۔ اور اُس نے زلیخا کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ زلیخا نے اِس انکار کی وجہ سے اُس پر جھوٹا الزام لگا کر اُسے قید کرا دیا۔ کچھ عرصہ پہلے زلیخا نے یُوسف کو خواب میں دیکھا تھا۔ وُہ اس کے بے نظیر حُسن کو دیکھ کر آناً فاناً اس کے عشق میں مُبتلا ہو گئی تھی۔ (دیکھو: یُوسف اور زُلیخا۔ مصنفہ جامی؛

یُونس: توریت کے مطابق یہ ایک پیغمبر تھا۔ جس کو ایک طُوفان کے وقت کشتی میں سے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا، کیونکہ اس نے خدا کی حُکم عدولی کی تھی۔ ایک بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا تھا، لیکن تین دن کے بعد وُہ صحیح سلامت

اس کے پیٹ سے باہر آگیا تھا۔

تیحییٰ ۱ : زکریا اور الزبیتھ کا بیٹا اور حضرت موسیٰ کا چچیرا بھائی۔ اِنہوں نے حضرت عیسیٰ کو اصطباغ دیا۔ ان کو ہیرڈ انیٹی پاس (HEROD ANTIPAS) نے قتل کرا دیا تھا۔

Selected Bibliography

Abdulla Yusuf, **The Holy Quran**, (Text, Tr. & Commentary), Lahore : Mohammad Ashraf, Kashmiri Bazar, 1938.

Ansari, Abdulla Haq & others, ed. **Islam** Patiala : Panjabi University, 1969.

Behari, Banke, Sufis, **Mystics and Yogis of India**, Bombay : Bhartiya Vidya Bhavan, 1971.

Arberry, A.J., **Sufism**, London : George Allen & Unwin Ltd. 1950.

Arthur Jeffery, **A Reader on Islam**, Netherlands : Monton & Co., Gravenhage, 1962.

Charan Singh, Maharaj, **Saint John : The Great Mystic**, Beas : Radhaswami Satsang Beas, District Amritsar, 1974 (3rd ed.).

Dictionary of Comparative Religion, London : Weildenfield, 1970.

Encyclopaedia of Islam, London Luzac & Co., (Old ed. & New ed.).

Encyclopaedia of Religion and Ethics, Hastings James, (ed.) Edinburgh : T & T Clark, 1971.

Greenlees, Duncan, **Gospel of Islam**, Madras : Theosophical Publishing House, 1951.

Iqbal Ali Shah, Sirdar, **Islamic Sufism**, New York : Samuel Weiser Inc., 1971.

Jalalud-din Rumi, **Mathnawi**, ed. R.A Nicholson, London : Luzac & Co., 1933.

... ... Qazi Sajjad Hussain (Tr.), Delhi : Sarbrang Kitab Ghar, 1978.

Mohammad Ali (Maulana), **The Religion of Islam**, New Delhi : S. Chand & Co.

Muhammad Dara Shikoh, **Risala-I-Haq-Numa** : The Compass of Truth (Eng. rendering by Srisa Chandra Vasu) Allahabad : Panini Office, Bhuvaneswari, 1912.

Nicholson, R.A. **The Mystics of Islam**, London : Routledge & Kegan Paul, 1966.

... ... **Studies in Islamic Mysticism**, London : University Printing Press. (Reprint) New York, 1967.

... ... **The Idea of Personality in Sufism**, Lahore : Sh. Mohammad Ashraf, Kashmiri Bazar, 1970.

Nasrollah S. Fatemi & others, **Sufism** South Brunswick & New York, 1976.

Puran Singh, **The Spirit of Oriental Poetry**, Patiala : Panjabi University, 1969.

Rama Krishna Lajwanti, **Panjabi Sufi Poets**, News Delhi : Ashajanak Publishers, 1973.

Rizvi, Saiyid Athar Abbas, **A History of Sufism in India**, Munshiram Manoharlal Pvt. Ltd. Vol. I. 1978, Vol. II. 1983.

Sharda, S.R., **Sufi Thought**, New Delhi, Munshiram Manoharlal Pvt. Ltd., 1974.

Titus Burckhardt, (Tr. D.M. Matheson), **An Introduction to Sufi Doctrine**, Lahore : Sh. Mohammad Ashraf, Kashmiri Gate, 1958.

Subhan, John A. (Bishop), **Sufism : Saints and Shrines**, Lucknow The Lucknow Publishing House, 1960.

Valiu Din, Mir, **The Ouranic Sufism**, Delhi : Moti Lal Banarasi Dass, 1959.

اُردو

نذیر احمد (ڈاکٹر)، کلامِ بُلھے شاہ، لاہور: پاکستان انٹرنیشنل پرنٹرز، 1976

فقیر محمد (ڈاکٹر)، کافیاں بُلھے شاہ، امرت سر، آزاد بُک ڈپو، ہال بازار۔

بھٹی، عبدالمجید، کافیاں بُلھے شاہ، اسلام آباد: لوک ورثے دا قومی ادارہ 1975.

رُہتکی، انور علی، قانونِ عشق، لاہور: کنول کشور پریس

پنجابی

سیتل، جیت سنگھ، بُلھے شاہ جیون تے رچنا، پٹیالہ: پنجابی یونیورسٹی

شرما، جی۔ ایل۔ بُلھے شاہ وِوچن تے رچنا، امرت سر: سُندر داس اینڈ سنز، 1974

گوردیو سنگھ، کلامِ بُلھے شاہ، لدھیانہ: لاہور بُک شاپ 1970.

دیوان سنگھ اور بکرم سنگھ گھمن، بُلھے دا کاویہ لوک، جالندھر: نیو بُک کمپنی، 1976,

بدم، پیارا سنگھ، سائیں بُلھے شاہ، پٹیالہ: سردار صاحب بھون، 1973

ہماری اُردُو اِشاعات

1۔آتم گیان	مہاراج جگت سِنگھ جی
2۔آتما کا سفر	رادھا سوامی ست سنگ بیاس
3۔بولے شیخ فرید	ٹی۔آر۔شنگاری
4۔بنتی	رادھا سوامی ست سنگ بیاس
5۔پرم پارس گُورو رویداس	کے۔این۔اُپادھیائے
6۔پرمارتھی پتر حِصہ اوّل	بابا جیمل سِنگھ جی مہاراج
7۔پرمارتھی پتر حِصہ دوم	مہاراج ساون سِنگھ جی
8۔پرمارتھی ساکھیاں	مہاراج ساون سِنگھ جی
9۔پیامِ مُرشدِ کامل	دریائی لال کپُور
10۔حق حلال کی کمائی	ٹی۔آر۔شنگاری
11۔حضرت سُلطان باہُو	ڈاکٹر پُوری، ڈاکٹر 'خاک'
12۔رُوحانی پھُول	مہاراج جگت سِنگھ
13۔زِندہ مرنا پار اُترنا	مہاراج چرن سِنگھ جی
14۔سائیں بُلھے شاہ	ڈاکٹر پُوری، ڈاکٹر شنگاری
15۔سنت مارگ	مہاراج چرن سِنگھ جی
16۔سنت دادُو دیال	کے۔این۔اُپادھیائے
17۔سنت کبیر	شانتی سیٹھی
18۔سنت سندیش	شانتی سیٹھی
19۔سار بچن نثر	سوامی جی مہاراج
20۔سرمد شہید	ٹی۔آر۔شنگاری

ہماری اُردُو اشاعات

21۔ صحبتِ مُرشدِ کامل	ڈاکٹر جے۔ پی۔ جانسن
22۔ فردوس بریں بررُوئے زمیں	دریائی لال کپُور
23۔ کامل درویش شاہ لطیف	ٹی۔ آر۔ شنگاری
24۔ گُورونانک کا رُوحانی اُپدیش	جنک پُوری
25۔ ہنسا ہیرا موتی چُگنا	ٹی۔ آر۔ شنگاری

دیگر

1۔ کتابِ میر داد	میخائیل نعیمی

For Internet orders, please visit: www.rssb.org

For book orders within India, please write to:
Radha Soami Satsang Beas
BAV Distribution Centre, 5 Guru Ravi Dass Marg
Pusa Road, New Delhi 110 005